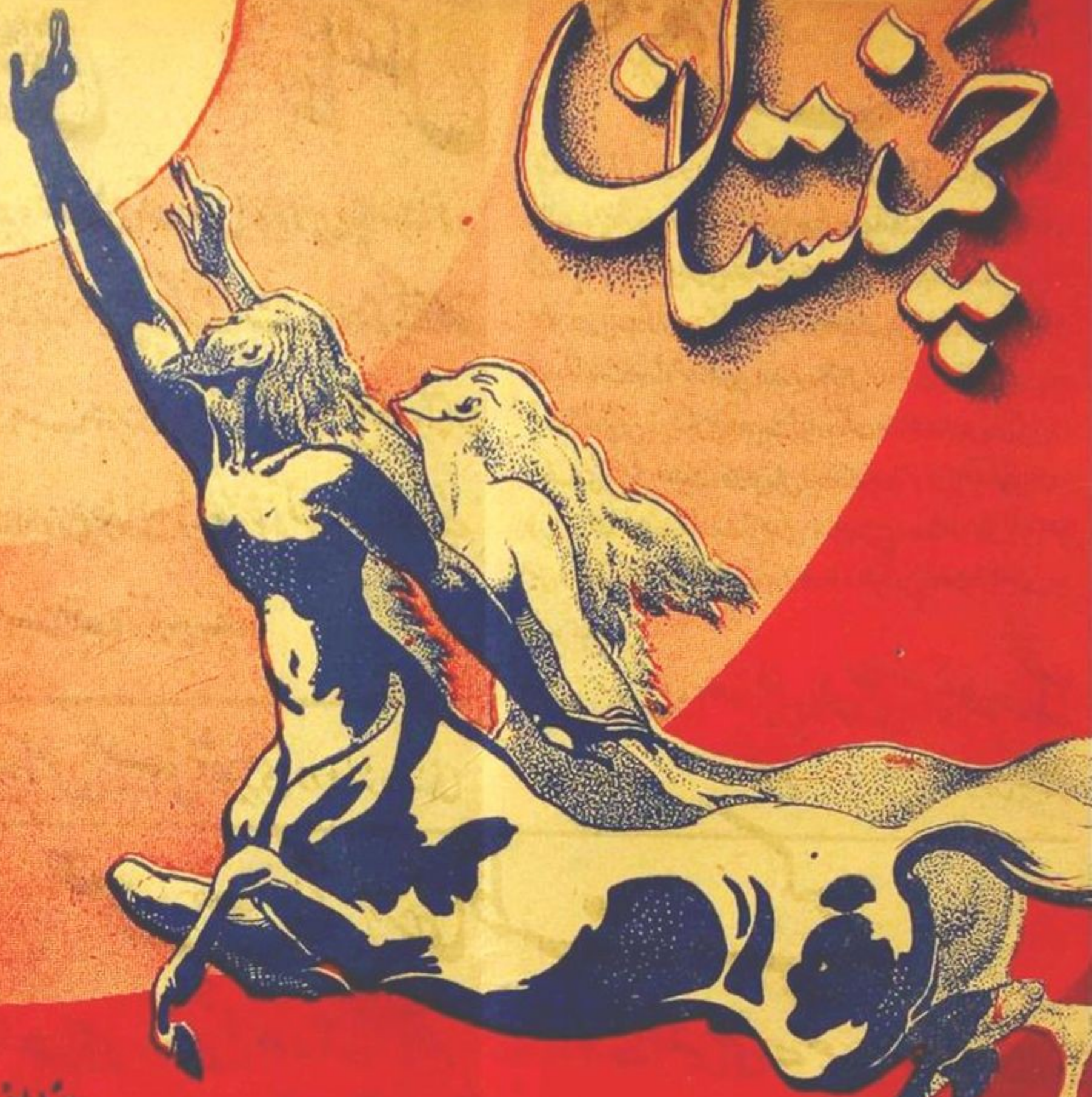

چمنستان
مدیر
آغا سرخوش قزلباش
دہلوی

بیادگار افسر الشعرا حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی

"اس انجمنِ گل میں شعلے بھی ہیں شبنم بھی"

ماہنامہ چمنستان دلی

جلد ۶ — کا افسانہ نمبر — ماہ جون ۱۹۴۵ء — سالانہ چندہ چار روپے — نمبر ۶
قیمت ۸/

خلاق

۱	پہلی نظر	آغا سرخوش قزلباش	۲
۲	نئی تہذیب	آغا شاعر قزلباش دہلوی	۳
۳	مرد کی شکست	سید رضا علی	۴
۴	تبرکات	صفی لکھنوی	۸
۵	قدیم ترین افسانہ	ل۔ احمد اکبر آبادی	۹
۶	عصرِ جواں	جوش ملیح آبادی	۱۴
۷	جھجک	شاہد احمد دہلوی	۱۷
۸	جگر پارے	جگر مراد آبادی	۲۰
۹	چاندنی	وزیر حسن دہلوی	۲۱
۱۰	شاعر کی جوانی کے منصوبے	حفیظ جالندھری	۲۳
۱۱	ایک کاروباری	اختر اورینوی	۲۵
۱۲	ترے بغیر	نواب مکرم علی خاں مکرم	۳۲
۱۳	ایک رات	مرزا ادیب بی اے	۳۳
۱۴	روحِ انقلاب	احسان دانش	۳۸
۱۵	پاؤں میں پھول	خواجہ احمد عباس	۳۹
۱۶	زندگی کا نور	رشید اختر ندوی	۴۹
۱۷	نمودِ صبح صادق	ضیاء الاسلام	۵۳
۱۸	اقبال کا پیامِ حیات	سجاد ظہیر	۵۴
۱۹	کلیں	قیسی رامپوری	۵۷
۲۰	آہنگِ نو	اثر جلیلی	۵۹
۲۱	احساسِ ندامت	ایم اسلم	۶۰
۲۲	شالامار	شہید یار جنگ	۶۹
۲۳	میری بھول	خواجہ محمد شفیع دہلوی	۷۰
۲۴	ایک سوال	احمد ندیم قاسمی	۷۱
۲۵	ترکِ دوستی	درویش میرٹھی	۷۶
۲۶	عشق	خدیجہ مستور	۷۷
۲۷	قبر اور گلاب کا پھول	جعفر علی خاں اثر لکھنوی	۸۴
۲۸	نصف بہتر	شائستہ اختر بانو سہروردی	۸۵
۲۹	عذرا	صالحہ عابد حسین	۹۰
۳۰	غزالانِ لکھنؤ	اسرار الحق مجاز	۹۵
۳۱	اور یہ افسانہ نگار	جیون ساتھی	۹۶
۳۲	واردات	مصطفٰے خاں مصطفٰے	۹۷
۳۳	فاصلہ	ابراہیم جلیس	۹۸
۳۴	پرواز کے بعد	قرۃ العین حیدر	۱۰۳
۳۵	دو رات	حمیدہ سلطانہ	۱۱۲
۳۶	دھندلکا	سلام مچھلی شہری	۱۱۸
۳۷	روس کی تقلید کے بجائے	آغا سرخوش قزلباش	۱۲۰
۳۸	الٹا اثر	بہزاد لکھنوی	۱۲۱
۳۹	نغمات	سید ضمیر جعفری	۱۲۳
۴۰	ٹوٹا ہوا کھلونا	سحاب آغا شاعر	۱۲۴
۴۱	ایک زندہ لڑکی	صدیقہ بیگم سیوہاروی	۱۲۹
۴۲	ترقی پسندی سے پہلے	بہار کوٹی	۱۳۴
۴۳	پچھتاؤ گی	خمار لکھنوی	۱۳۸
۴۴	ہنسی میں پھنسی	دیش	۱۳۹
۴۵	وارداتِ شاعر	حاتم بہری	۱۴۶
۴۶	تصویریں	ادارہ	۱۴۷
۴۷	اشتہار	مشتہرین	۱۴۸

www.taemeernews.com

پہلی نظر

آغا سرخوش قزلباش

موجودہ زندگی بھی آخر ایک پہیا بن کر رہ گئی۔ وہ آغازِ کار کی وحشت۔ گھبراہٹ۔ ہراس۔ نااُمیدی۔ بے چینی۔ وہم کی تاریکیاں سب کی سب زندگی کے رخ پر آتے ہی مساوات کی صورت میں ڈھل گئیں۔ اب نہ کرب ہے نہ چیخ نہ غم ہے نہ مسرت۔ پانچواں سال ہونے کو آیا تجربات نے ولولوں کی بنیادیں کھوکھلی کر دیں۔ حوادث نے عزائم کو پژمردہ کر دیا۔ واقعات نے امیدوں کو بے حس بنا دیا اور وقت نے باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ نہ وہ ہماہمی ہے اور نہ وہ زور شور۔ زندگی نہ رکتی ہے نہ ٹھٹھکتی ہے اور نہ ہی دوڑتی ہے۔ ایک مسلسل بہاؤ ہے پیہم رفتار جو محسوس بھی ہے اور معلوم بھی۔ تاہم کبھی کبھی عمر کے تقاضے۔ اپنے میں خون دوڑاتے ہیں۔ نبضوں میں دھڑکنیں بھرتے ہیں۔ اُمنگ اپنے پر کھولتی ہے۔ عزم کے چہرے پر سُرخی جھلکنے لگتی ہیں۔ دماغ وقت کی نگاہوں میں نگاہیں الجھا دیتا ہے۔ اور دل بھی اسپارک دے اٹھتا ہے اس وقت چاہتا ہوں کہ چمنستان کے لئے کوئی تعمیری کام کیا جائے۔

ہندستانی پبلشرز کو ہندستان کا ایک ایسا قومی ادارہ بنا دیا جائے کہ جس سے مصنفین بھی مطمئن رہیں اور ناشر بھی۔

اس حیات بے حیاتی میں مفلوج کوششوں سے عزم کے انجکشن دے رہا ہوں اور اُس کی ایک لپک یہ افسانہ نمبر حاضر کر رہا ہوں۔ مئی نمبر میں جو مضمون نگار حضرات کی فہرست دی تھی وہ "بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لئے" کے مصداق نہ تھی اس میں قطعیت شامل تھی۔ لیکن باوجود بالغ وعدوں کے چمنستان اُن تمام حضرات کی دماغی کاوشیں نہیں جمع کر سکا جس کے لئے میں آپ حضرات سے معذرت خواہ ہوں اور امید کے سسکتے ہوئے ہونٹوں سے یہ ضرور کہونگا کہ جنوری ۱۹۴۶ء میں سالنامہ شاید ویسا شائع کر سکوں جیسا اس نمبر کو کامراں بنانے کا خیال تھا۔ زیر نظر نمبر بھی آپ ملاحظہ فرمائیں گے تو آپ کو شعلہ و شبنم کے امتزاج کا عمدہ نمونہ نظر آئے گا میں ان تمام حضرات کا ممنون ہوں جنہوں نے میری درخواست کو قبول فرما کر مجھے مفتخر کیا۔

اکثر مضامین جو افسانہ نمبر کے لئے ہی منگوائے تھے رہ گئے ہیں جس کی وجہ کاغذ کی قلت کے سوا اور کچھ نہیں میں امید کرتا ہوں کہ مضمون نگار حضرات مجھے میری اس نادانستہ غلطی پر معاف کریں گے۔

www.taemeernews.com

نئی تہذیب

افسر الشعرا آغا شاعر

نئی تہذیب ہے، ہر شخص گویا وقفِ کاوش ہے
زمانہ منقلب ہے آج ہر ذرہ میں تابش ہے
وہی فاتح بنا ہے، قتل و غارت جس کی طینت ہے
قوی ہیں جس کے بازو آج اُس کی ہی پرستش ہے

نگل کر چین کو جاپان آپے میں نہیں بالکل
فرینکو کو دیا اسپین کیا خوں ریز بخشش ہے
ہیں جتنی ہستیاں کمزور، اُن کا خون بہتا ہے
یہی پیشین گوئی ہے، یہی تازہ نگارش ہے

ہزاروں مرد و زن، طفل و جوان و پیر کا مقتل
نظر آتا ہے ہر سُو، چار سو خونی نمائش ہے
جو بے علم و ہنر ہیں، علم ان کو یوں سکھاتے ہیں
نئی تہذیب کا آموختہ، گیسوں کی بارش ہے

خدا ہی جانے اب ہندوستاں کا حشر کیا ہوگا
ہیں دشمن چار سُو، وقت آپڑا ہے، آزمائش ہے

www.taemeernews.com

مرد کی شکست

(سید رضا علی)

ایڈورڈ ہشتم کو تخت چھوڑے ابھی دو برس بھی نہیں ہوئے تھے میونک کانفرنس کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ ہمارے ملک کے روزانہ اخباروں کے اتوار کے پرچہ میں دو اشتہار شائع ہوئے۔

پہلا اشتہار ملاحظہ ہو: "ایک مسلمان مرد عمر اٹھائیس سال، قد پانچ فٹ چار انچ، رنگ گہرا سانولا، جرمنی کا تعلیم یافتہ اور ہائڈلبرگ یونیورسٹی کا پی ایچ ڈی بنگال کے ایک گورنمنٹ کالج میں مستقل پروفیسر۔ مشاہرہ چھ سو روپے ماہوار اس کے علاوہ جائداد کی مستقل آمدنی چھ ہزار روپیہ سالانہ شادی کرنا چاہتا ہے ایسی خواتین جو خوب صورت ہیں یا دو سو روپے ماہوار یا زیادہ کی آمدنی رکھتی ہیں جواب دینے کی زحمت نہ اٹھائیں، پردہ نشین عورت سے شادی کے بعد پردہ چھوڑنے اور نہ پردہ کرنے والی خاتون سے بعد شادی پردہ میں رہنے کی توقع کی جاتی ہے۔ بی اے یا ایم اے کی ڈگری کی شرط نہیں مگر میری آیندہ رفیقۂ حیات کے لئے مناسب ہے کہ خوب اچھی انگریزی لکھ اور بول سکے اور یورپ کی ایک اور زبان مثلاً فرانسیسی یا جرمن میں اظہارِ خیال کر سکے۔ کتابوں کے مطالعہ پر پابندی نہ ہوگی لیکن جنسی تعلقات کے بارہ میں جو مضامین اور کتابیں آج کل لکھی جا رہی ہیں ان کے پڑھنے سے نہ پڑھنا بہتر ہے۔ فوٹو نہ بھیجئے۔ خط و کتابت کے ذریعہ ملاقات کا بھی انتظام ہو سکتا ہے۔ پتہ:۔ ابجد۔ اے۔ بی۔ سی روڈ نمبر ۵۱۔ بنارس:"

دوسرا اشتہار حسب ذیل تھا: "ہندو مرد، قوم برہمن۔ موجودہ عہدہ ریلوے انجینیر، تنخواہ ساڑھے چار سو روپے ماہوار، عمر اٹھائیس سال بیاہ کرنا چاہتا ہے۔ دیوی صورت کی اچھی ہنس مکھ اور تعلیم یافتہ ہو خوش حال گھرانے کی بیٹی ہو تو اور بھی اچھا ہے محض برہمن ہونا کافی ہے میں ذاتی طور پر ذات پات کا ماننے والا نہیں ہوں مگر سماج سے لڑائی کون مول لے۔

کوئی دیوی مجھ سے ملنا چاہے تو بڑی خوشی سے حاضر ہوں
پتہ:۔ کرشن۔ نمبر ۴۵۔ مان سنگھ روڈ۔ نئی دہلی۔"

ابجد کا اصلی نام فراست اللہ تھا اشتہار میں معمائی اثر پیدا کرنے کی غرض سے ابجد کا بھیس زیب تن کیا تھا۔

فراست اور کرشن کے پاس بڑی کثرت سے جواب آئے۔ بیس بائیس خواتین نے بنارس اور نئی دہلی جا کر ان دونوں سے ملاقات بھی کی۔

ایک دن حاضری کھانے کے بعد فراست دفتر میں بیٹھا جواب دینے والیوں کی فہرست معہ مختصر یادداشت کے تیار کر رہا تھا کہ بیرا نے چاندی کی چھوٹی سینی (ٹرے) میں ایک ملاقات کا کارڈ پیش کیا کارڈ پر نہایت خوب صورت حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔

"مطلوب کی طلب گار اور ازدواجی عہدہ کی امیدوار، بدصورت اور غریب۔ ضیغم"

کارڈ پڑھ کر فراست چونک پڑا یوں تو اکثر خواتین نے خطوں میں فراست کے اشتہار کا مذاق اڑایا تھا اور بعض ملاقات کرنے والیوں نے بڑے لطیف اور ستھرے پیرایہ میں اشارتاً بتایا تھا کہ اشتہار کی عبارت بجائے خود چیستان ہے تاہم فراست اس کے لئے تیار نہ تھا کہ ملاقات کے کارڈ کے چھپتے ہوئے مختصر الفاظ کو، کوئی خاتون کو جواب ترکی بہ ترکی کا ذریعہ بنائے۔ وہ سنبھل بیٹھا اور بیرا سے کہا "سلام دو۔"

آتے ہی ضیغم کی نظر ایک جوانِ رعنا پر پڑی۔ چھ فٹ دو انچ کا قد، سینہ ابھرا ہوا، شیر کی سی گردن۔ خوب گٹھے ہوئے بازو لمبی اور زبردست کلائیاں، نہایت گوری رنگت۔ ادھر فراست نے دیکھا کہ بدصورت ہونے کے بجائے ایک حسینہ دیکھنے والوں کے دلوں کو پامال کرتی اس کے دفتر میں داخل ہوئی، سرخ سفید رنگ جٹی بھویں نرگسی آنکھیں، ستواں ناک، نہایت پتلے ہونٹ۔ چھریرا بدن خاصا لمبا قد، لباس نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا احمد آبادی ہلکی اودی ساڑی، جا بجا ستارے بنے ہوئے، دو انچ کی بارڈر ہم رنگ نیم آستین بلاؤس سینہ اور ملحقات سینہ کی غمازی کر رہا تھا گلے میں جڑاؤ ہار، ہاتھوں میں سونے کی سادہ ڈائمنڈ کٹ چوڑیاں

www.taemeernews.com

سے کٹی ہوئی) چار چار چوڑیاں، کانوں میں ہیرے کے جڑاؤ بندے مگر نہ اتنے بڑے جن سے طبیعت کو الجھن ہو۔ پانوں میں اونچی ایڑی کا پیرس کا بنا ہوا سنہری جوتہ۔ اس شان سے حسینہ نے آ کر جب۔ "آداب عرض ہے" کہا تو مسٹر فراست سٹ پٹا کر کھڑے ہو گئے "و تسلیمات، تشریف لائیے تشریف لائیے"

حسینہ نے ایک دن پہلے بنارس پہنچ کر فراست کے سب حالات معلوم کر لئے تھے فراست کو ایک نظر غور سے دیکھ کر اس نے بڑے بھولے پن سے پوچھا۔

"کیا مسٹر ابجد تشریف نہیں رکھتے میں ان سے ملنا چاہتی ہوں"

فراست۔ تشریف تو رکھئے ابجد میرا ہی نام ہے۔

حسینہ۔ تامل کے ساتھ کرسی کے ایک کنارہ پر بیٹھتے ہوئے "میں یا آپ ہم دونوں میں سے کوئی سخت غلطی میں مبتلا ہے" اپنا بیگ کھولتے ہوئے۔

"مسٹر ابجد کا قد چھ فٹ سے بھی زیادہ ہے رنگ گہرا سانولا ہے جسے عوام کالا کہتے ہیں میں آپ کو اشتہار دکھاؤں"

یہ کہہ کر اشتہار حسینہ نے فراست کے سامنے رکھ دیا۔

فراست۔ آپ بالکل بجا فرما رہی ہیں دونوں باتیں اشتہار میں درج ہیں سا اشتہار کا مسودہ خود میں نے کیا تھا لیکن یہ دونوں باتیں مصلحتاً لکھدی تھیں۔

حسینہ۔ کیا مجھے اس مصلحت کے معلوم کرنے کا حق ہے۔

فراست۔ (چند لمحے سوچ کر) ہاں ـــ بات یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری صورت شکل سے متاثر ہو کر ایسی خواتین اشتہار کا جواب دیں جن سے خط و کتابت یا ملاقات کرنا نہ میرے لئے سود مند ہوتا نہ خود اُن کے لئے۔

حسینہ۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو ڈر تھا کہ آپ کی صورت شکل تعلیم اور دنیاوی وجاہت کی کشش آپ کے چاروں طرف ایسی بن بیاہی لڑکیوں اور عورتوں کی فوج جمع نہ کر دے جن میں آپ کی رفیقۂ حیات بننے کی قابلیت اور صلاحیت نہیں ہے۔

فراست۔ اگر میں جواب میں ہاں کہوں تو خود ستائی ہوگی بس یوں سمجھئے کہ میرا مطلب بھی یہی تھا کہ میں جو کچھ ہوں اس سے اپنے کو کم ظاہر کر کے خواتین کو غیر ضروری زحمت سے باز رکھوں۔

حسینہ۔ خدا جزائے خیر دے کس قدر خیال ہے آپ کو ہم عورتوں کا! لیکن یہ تو بتلایئے کہ کسی عورت کی آمدنی دو سو روپے ماہوار یا زیادہ ہو خواہ وہ آمدنی زرعی جائداد یا سکونتی مکانات سے ہو یا تجارت سے یا سرکاری ملازمت سے، تو اس میں کیا عیب ہے؟

فراست۔ کچھ عیب نہیں۔ میری غرض صرف یہ تھی کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں بیوی کا نہیں بلکہ اس کی دولت کا خواستگار ہوں۔

حسینہ۔ اور یہ کون سی منطق ہے کہ پردہ نشیں آپ سے شادی کرے تو پردے کو خیر باد کہنا پڑے اور اگر پردہ نہ کرتی ہو تو پردہ میں بیٹھ کر آپ کے گھر کی رکھوالی کرے۔

فراست۔ معاف کیجئے دنیا کے سارے کام منطق کی رو سے نہیں ہوتے یہ بات میں نے محض یہ معلوم کرنے کے لئے لکھ دی تھی کہ میری آئندہ رفیقۂ حیات میری ایسی بات ماننے کے لئے جو معقولیت پر مبنی نہیں ہے کہاں تک تیار ہے۔ اس کے علاوہ یہ شادی کی شرط نہ تھی اشتہار کے الفاظ ہیں پردہ چھوڑنے یا پردہ میں رہنے کی "توقع کی جاتی ہے"

حسینہ۔ اور ہاں یہ تو فرمایئے ترقی پسند ادیبوں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے کہ آپ ان کے محتسب بننا چاہتے ہیں۔

فراست۔ جنسی تعلقات کو یہ لوگ جس عریانی کے ساتھ بیان کرتے اور اپنی کمی استعداد کو جس طریقے سے فحش اچھال کر پورا کرتے ہیں وہ مجھے پسند نہیں۔

حسینہ۔ اس کے باوجود اگر کوئی پڑھنا چاہے تو آپ کو روکنے کا کیا حق ہے۔

فراست۔ مطلق نہیں۔ میں نے تو خود اپنی آئندہ رفیقۂ حیات کو بھی اسی قدر دوستانہ مشورہ دیا ہے کہ "ان کتابوں کے پڑھنے سے نہ پڑھنا بہتر ہے" کیا آپ کی رائے میں ایجاب و قبول کا شرعی یا قانونی نتیجہ یہ بھی ہے کہ زوج و زوجہ کا ایک دوسرے کو صلاح و مشورہ دینے کا حق زائل ہو جائے۔

حسینہ۔ ماشاء اللہ۔ اشتہار کیا ہے امتحان کا پرچہ ہے۔ اچھا یہ تو فرمایئے کہ یورپ کی دو دو زبانیں جاننے پر اصرار کیوں ہے

فراست۔ اصرار تو نہیں ہے۔ اشتہار میں تو غیر زبانوں کے علم کو صرف مناسب قرار دیا گیا ہے۔ اصلی غرض یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ

www.taemeernews.com

کی تعلیم یافتہ عورت کا انتخاب کیا جا سکے۔

حسینہ۔ اگر اختیار میں آپ نے فرض اور سنت میں فرق رکھا ہے یا اوامر و نواہی کے حدود مقرر کئے ہیں تو خوب صورتی کو شرک اور کفر کی طرح کیوں بدترین گناہ قرار دیا ہے۔

فراست۔ کاش اس سوال کا جواب دینے سے آپ مجھے معاف رکھیں۔

حسینہ۔ جناب کی جو مرضی۔ میں تو امیدوار ہوں مجھے بارِ خاطر ہونے کا حق ہرگز نہیں ہے۔

فراست۔ آپ کبیدہ خاطر نہ ہوں اشتہار میں کوئی بات ایسی درج نہیں ہے جس کا جواب نہ دے سکوں میں۔ فنون لطیفہ سے مجھے لڑکپن سے لگاؤ رہا ہے۔ حکومت اگر زندہ کرامت ہے تو حسن دنیا کا سب سے بڑا جادو ہے میں بھی حسن کی دیوی کا معتقد مندِ پجاری ہوں اچھی صورت دیکھ کر میرے دل و دماغ میں برقی لہر دوڑ جاتی ہے صرف یہی نہیں آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ خالی وقت میں اچھی تصویروں کو گھنٹوں دیکھا کرتا ہوں لیکن شادی کے جس کا نام ایرانیوں نے خانہ آبادی رکھا تھا دو پہلو ہیں ایک کا تعلق روحانی مسرت سے ہے جو بغیر محبت کے حاصل نہیں ہو سکتی دوسرا پہلو تمام تر انتظامِ خانہ داری سے وابستہ ہے۔ خرابی یہ ہے کہ حسین عورتیں اپنی خوب صورتی کے گھمنڈ میں یا تو خانہ داری کی طرف توجہ ہی نہیں کرتیں یا سارے گھر بار کی بلا شرکت دیگرے مالک بننا چاہتی ہیں مغربی یورپ میں ممکن ہے یہ طریقہ کامیاب ثابت ہوا ہو مگر یہ خیال غلط ہے کہ وسطی اور جنوبی و شرقی یورپ کے ملکوں میں بھی گھر کی مالک بی بی ہے خاوند نہیں ہے۔ ہمارے ملک کی نجات مغربی یورپ کی کورانہ تقلید سے نہ سیاسی دائرہ میں ہو سکتی ہے نہ معاشرتی حلقہ میں۔ چودھویں رات کا چاند ممکن ہے تلاش سے مل جائے مگر ڈر ہے کہ ماہ روکی میری نبھ نہ سکے گی پھر کہ

"چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی"

ہی یہ بات کہ کوئی خوبصورت عورت میرے اشتہار کو قابلِ توجہ نہ سمجھے گی یہ سب کہنے کی باتیں ہیں انسان عجیب مخلوق ہے گویہ اس کی فطرت میں داخل ہے اگر کسی کام کو منع کیا جائے تو وہ ممانعت اس کام کے کرنے کی سب سے بڑی تحریک اور ترغیب ہوتی ہے میرے نام بہت سی حسین عورتوں کے خطوط معہ فوٹو کے آچکے ہیں بعض خواتین نے مجھ سے ملنے کے لئے بنارس کے سفر کی زحمت بھی اٹھائی۔ اور سب باتوں کو جانے دیجئے میرے اشتہار کی کامیابی کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ آپ جیسی خاتون نے جس کے ساتھ قدرت نے حسن صوری و معنوی کے معاملے میں بڑی فیاضی کا برتاؤ کیا ہے میری بے ربط اور پریشان تحریر کو لائقِ التفات سمجھا اور بنارس آکر حروف تہجی کے آخری قفل کا شرفِ دید مجھے بخشا میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اسے طنز نہ سمجھئے بلکہ ؎

"دل را بہ دل رہے ست دریں گنبدِ سپہر"

حسینہ۔ اچھا میں اب سمجھی۔ مردوں نے ہر زمانہ اور ہر عہد میں عورتوں کی آزمائش کی ہے۔ اس دور میں نسوانی کردار ذکیر کٹہرے کے پرکھنے والے آپ ہیں۔ یوں تو اشتہار معمولی ہے مگر ہم عورتوں کی نظر سے اوجھل آپ نے اس میں کتنے گوشے رکھے ہیں میں آپ کی صاف گوئی کی قائل ہوں اشتہار میں اپنے متعلق غلط اطلاع درج کرنا آپ کو تسلیم 'صفائی' ہے کہ اپنے اوصاف بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کے بجائے گھٹا کر دکھائے گئے ہیں۔ عورت کے حسن اور تمول دونوں سے بے نیازی بلکہ تنفر کے باوجود آپ شوقین گل چین بھی ہیں اور دولت کے قدرداں بھی۔ پردہ نشین بھی چھوڑے اور پردہ کرنے والی خانہ نشینی اور گھر کی چوکیداری اختیار کرے بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس فقرہ کا لکھنے والا مجذوب درویش ہے یا مجموعہ اضداد سیاسی رہبر۔ مگر آپ فرماتے ہیں کہ اس فقرہ کی غرض و غایت عورت کے استقلال اور قوتِ ارادی کی آزمائش ہے۔ انگریز عورتوں کی طرح انگریزی بولنا اور لکھنا اور ایک اور مغربی زبان سے اچھی واقفیت ہونا شادی کی شرط نہیں ہے بلکہ ایک مزید وصف ہے۔ اور تو اور بیچارے ترقی پسند ادیبوں کو بھی نہیں چھوڑا بیگم امجد (جن کا ادبی نام معلوم نہیں۔ "نامنظور" ہو گیا۔ حظی؟) ترقی پسند ادب کے وہی رسالے اور کتابیں پڑھ سکیں گی جن پر شوہر کی منظوری کی مہر ثبت ہو مگر یہاں بھی گریز کا پورا انتظام ہے آپ کا جواب ہے کہ یہ تو سفارش ہے جس کو شرائطِ شادی سے کچھ تعلق نہیں ہے۔

ہر بات کا جواب موجود ہے میرا خیال ہے کہ تقریر میں آپ سے جیتنا بڑا کٹھن کام ہے۔ جس شخص کو اقبال ہو کہ اشتہار میں پوری سچی بات کھولنے کے بجائے بیشتر معاملات میں آدھی بلکہ آدھی سے بھی کم سچی بات ظاہر کی گئی ہے اس سے ہم ظاہر و باطن یکساں رکھنے والی عورتیں بازی نہیں لے جا سکتیں۔ رہا میرا بنارس آنا۔ آپ صوبہ کے شرقی کونے میں رہتے ہیں میرا وطن میرٹھ یعنی صوبہ کا آخری غربی ضلع ہے۔ بالفاظ دیگر آپ ابجد ہیں اور میں ضغلغ۔ سفر تو لمبا تھا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا۔ کیا اشتہار کا مسودہ آپ نے شیخ علی حزیں مرحوم کے مقبرہ پہ جا کر تیار کیا تھا۔

فراست۔ جی نہیں۔ اسی دفتر میں اور اسی کرسی پر بیٹھ کر جس پر اس وقت بیٹھا ہوں میں نے مسودہ لکھا تھا۔ آپ کو شیخ مرحوم کا خیال اس وقت کیوں آیا۔

حسینہ۔ کچھ نہیں۔ واقعات کو گھٹانا بڑھانا' یا حقیقت پر پردہ ڈالنا' یا الفاظ کو ہیر پھیر کے ساتھ اس طرح استعمال کرنا کہ مطلب کچھ ہو اور لوگ کچھ اور سمجھیں یہ سب باتیں بھی بعض حلقوں میں شاعر کے اوصاف میں داخل سمجھی جاتی ہیں لیکن شیخ کے ساتھ بڑی ناانصافی ہو گی اگر میں یہ نہ کہوں کہ ان کو اس طرح کی شاعری سے کچھ تعلق نہ تھا۔

فراست۔ آپ نے اپنے متعلق اب تک کچھ نہ فرمایا۔

حسینہ۔ میرا نام قمر' عرف کجو' وطن میرٹھ۔ ممکن ہے سینما کی بعض تصویروں میں آپ نے مجھے سوانگ بھرتے دیکھا ہو آپ کے اشتہار نے مجھے آپ کا نادیدہ مشتاق بنا دیا۔ یہاں آئی آپ کے حالات معلوم کئے آج ملاقات کی عزت حاصل ہوئی کل ڈاک گاڑی سے میرٹھ واپس چلی جاؤں گی۔

فراست۔ اور ملاقات کے کارڈ پر جو عبارت تحریر تھی اس کا کیا مطلب تھا۔

کجو۔ اس کا مطلب یہی تھا جو الفاظ سے مترشح ہوتا ہے۔ مگر وہ عبارت آپ سے ملاقات اور تبادلۂ خیالات ہونے کے قبل لکھی گئی تھی۔

فراست۔ میں بدصورتی کی صورت اور غریب سینما اسٹار کی غربت دیکھنے کا منتظر ہوں۔

کجو۔ بدصورت نہ آپ ہیں نہ میں۔ مگر انصاف شرط ہے جب آپ اپنی بدصورتی کی دلکش تصویر کھینچ کر خواتین کو اپنی طرف مائل کریں تو میں اپنے کو بدصورت کہنے پر آپ کی بارگاہ میں کس طرح قابلِ الزام قرار دی جا سکتی ہوں۔ ع

"ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند"

رہی غربت۔ میں اس شہر میں مسافر ہوں میرے غریب ہونے میں آپ کو کیا شک و شبہ ہے۔

فراست۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ لوٹ پھیر کر میرا اشتہار میرے ہی خلاف استعمال کیا جائے گا۔ خیر اسے جانے دیجئے۔ آپ تو "مطلوب کی طلب گار اور ازدواجی عہدہ کی امیدوار" ہیں۔

کجو۔ تھی امیدوار آپ سے ملاقات ہونے سے پہلے تک۔ اب طلب گاری اور امیدواری دونوں سے آزاد ہوں۔

فراست۔ کیا خطا دیکھی میری آپ نے۔

کجو۔ خطا۔ خطا کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ آج دورانِ ملاقات میں آپ سے میں نے بہت کچھ سیکھا جس کے لئے آپ کی شکرگزار ہوں جب آپ خوب صورت عورت سے اس وجہ سے شادی کرنا نہیں چاہتے کہ وہ کہیں آپ سے سرگونہ اپنا لے حالانکہ گھر گھر والی کا ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہئے تو مجھ جیسی آزادی کی قدر کرنے والی عورت جس کو خدا نے اتنا دیا ہے کہ وہ دوسروں کی کبھی دست نگر نہ ہو کیوں اپنے کو کسی کا محکوم بنائے کیوں اپنی آزادی کو خیرباد کہے اور کیوں مرد کو عورت سے برتر سمجھے۔ اگر شادی ایسی ہی ضروری چیز ہے کہ اس کے بغیر کوئی عورت مسرت اور اطمینان کی زندگی بسر نہیں کر سکتی تو بہترین تدبیر یہ ہے کہ میں کسی شریف، تعلیم یافتہ اور مفلس شخص سے نکاح کروں تاکہ محکوم ہونے کے بجائے شوہر پر حکومت کر سکوں۔

(باقی آئندہ)

اعمال نامہ

سر سید رضا علی کی خود نوشت سوانح حیات، جو ہندستان کی سو سالہ تاریخ بھی ہے۔

قیمت آٹھ روپے۔

نگارستان ایجنسی اردو بازار دلّی

www.taemeernews.com

تبرکات

صفیؔ لکھنوی

جب صفیؔ ذکرِ حریفانِ مے آشام آیا
سب سے پہلے لبِ ساقی پہ مرا نام آیا

نامہ واپس لئے جب قاصدِ ناکام آیا
ہو گیا دل کو یقیں موت کا پیغام آیا

محوِ رُخ دل تھا کہ زلفوں کے تہِ دام آیا
شکر ہے، صبح کا بھولا جو سرِ شام آیا

بے قراری دلِ بیمار کی اللہ اللہ
فرشِ گل پر بھی نہ آنا تھا نہ آرام آیا

بزمِ ساقی ہیں رہا نفع سے بڑھ کر نقصان
دے کے اک شیشۂ دل ہاتھ مرے جام آیا

رند سمجھے کوئی مردہ ہے کفن میں لپٹا
شیخ باندھے ہوئے یوں جامۂ احرام آیا

دیتے ہیں موئے سفید اب خبرِ شامِ لحد
آفتاب آپ سمجھ لیں کہ لبِ بام آیا

چہچہے بھول گئے نغمہ سرایانِ چمن
اُڑ گئے ہوش جو صیّاد لئے دام آیا

حُسنِ بدمست کے آئینے میں دیکھا جو بغور
نظر آغاز ہی میں عشق کا انجام آیا

جورِ درباں کی تو کچھ بھی نہ ہوئی تحقیقات
میرے ہی سر مری فریاد کا الزام آیا

ابھی کروٹ بھی نہ بدلی تھی لحد میں کہ صفیؔ!
صور کی آئی صدا حشر کا ہنگام آیا

قدیم ترین افسانہ

ل، احمد، اکبرآبادی

بدبخت ہیں وہ ملک جہاں علم و فن کی پرستش نہ ہوتی ہو، اور قابل احترام ہیں وہ قومیں جو اس دھن میں بسر کرتی ہوں، یا دمن بخیر! ہم بھی کبھی علم کے ایسے ہی بھوکے اور فن کے اتنے ہی پیاسے تھے، لیکن آج یہ عالم ہے کہ اقوام مغرب کی وارفتگی علم و فن کی حدیں بھی ہم تیرہ بختوں کی رسائی تصور میں نہیں آسکتیں۔

قدیم مصری ادب کا میدان جتنا وسیع اور متنوع تھا اس کے باوجود یہ گمان ہونے لگا تھا کہ مصر قدیم نے تخیلی و رومانی ادب میں کوئی ارتقا حاصل کیا ہی نہ تھا۔ کیونکہ دنیا کے تمام عجائب خانہ جملہ کتب خانے، اور کل مجموعۂ نوادر میں ایسی کوئی شہادت موجود نہ تھی

۱۸۵۲ء میں ایک انگریز خاتون، مسز دوربنی کی جستجو کامراں ہوئی۔ اور وہ خوش قسمت مشتری ثابت ہوئی۔ جس کے ہاتھ ایک قدیم قرطاس لگ گیا۔ جس نے قدیم مصری ادب کے تخیلی جزو کی شہادت بہم پہنچا دی۔

پیرس کے مجموعۂ نوادر مصریات کے سپرنٹنڈنٹ اور اپنے عہد کے برترین ماہر مصریات، ویکانت، درروژے، کو جب یہ مسودہ دیا گیا تو اس کی قدر و قیمت کا فوراً اندازہ ہو گیا، اور اس نے پیرس کے "آرکیالوجی ریویو" میں اس پر ایک مختصر تبصرہ شائع کر کے علما و مجتہدین فن کو توجہ دلائی، وہ دن یورپ کے شیدائیان فن و ہنر کے لئے عید کا دن تھا جس روز یہ مضمون شائع ہوا۔

یوں تو معلوم نہیں کس نامعلوم زمانے سے ذہن و تخیل انسانی مصروف ہے اور اس کی بارآوری بہت سے قصے کہانیوں کی صورت میں آج ہمارے سامنے ہے اور اس وقت بھی جب یہ مصری فسانہ لکھا گیا تھا۔ اور یہ کہانیاں جو اکثر صورتوں میں اپنی اصل کے اعتبار سے ایک مگر شکل میں متغائر، امتداد وقت کی گود میں لوٹتی ہوئی کرۂ ارض کے مختلف حصوں میں محض مقامی تغیرات رنگ و صورت کے ساتھ موجود تھیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت بھری ہے کہ ان کہانیوں کا اولین عہد آغاز محو ہو چکا ہے۔ یہ کب وضع ہوئیں ان کا مخترع کون تھا، اور ان میں تغیرات کیوں کر رونما ہوئے کچھ معلوم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ نسل انسانی میں زبانی طریق پر منتقل اور متغیر ہوتی رہی ہیں۔ ان کہانیوں کو اگر "نجم پراں" کا نام دیا جائے تو زیادہ مناسب حال معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاں تہاں مختلف آب و ہوا میں پہنچ کر مخصوص مقامی چیزیں بن گئیں، اور اپنی اصل نسل کی تحقیق کو ناکام جستجو ہی رکھنا پسند کرتی ہیں، ان اساطیر، کہانیوں اور مضمون کی تدوین معلوم نہیں کتنے زمانے کے بعد ہوئی اور جن مجلدات کے اندر ان کو قرار ملا، وہ جلدیں خدا جانے ان کے اختراع کے کتنے بعد کی ہیں!۔

لیکن تمام مسودات قدیم ہیں جو اس وقت دریافت ہوئے ہیں، یہ فسانہ جو اس مسودے میں رقم ہے قدیم ترین نوشتہ باور کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی اصلی (واقعی اور مستند صورت میں ہم تک پہنچا ہے، اور اس افسانے کی صورت ان کہانیوں سے مختلف اور جداگانہ ہے، جن کی قدرت کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اس افسانے کی صورت آج بھی وہی ہے جو روز تحریر تھی، اور قرطاس قدیم جس کا رنگ بھورا پڑ گیا۔ اور جو پھٹا ہوا ہے، جس پر ٹیڑھے میڑھے حرف منقوش ہیں، بتیس صدی پہلے ایک کاتب فرعون اننانا (ANNANA) نے تصنیف کیا اور آج برٹش میوزم لندن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اس فسانے کی وجہ تصنیف یہ معلوم ہوئی ہے کہ "یوسم ڈیلفنی" میں شہزادے مرنیفتا (MERNEPHTA) یعنی فرعون رامیسس میامون (RAMESESMIAMUN) کے بیٹے کے لئے لکھا گیا۔

اور مصری ادب کے شہ پاروں میں باور کیا جاتا تھا۔ اس مسودے کے آخر میں یہ عبارت درج ہے۔

"یہ مسودہ اس درجے کا ہے کہ فرعون کے کاتبوں سے نامزد ہو۔ ان کاتبوں کے نام یہ ہیں: لگاپو (جو اپنے وقت کا بہترین کاتب تھا)، ہوردو اور

www.taemeernews.com

میرے باپ (یہ دونوں آسمان کتابت کے درخشندہ اختر تھے) یہ کاتب انانا کی تصنیف ہے جس کے قبضے میں یہ "پلندہ" ہے، خداوند تھوتھ (THOTH) ان تمام الفاظ کو فنا سے محفوظ رکھے!"

یہ تین ہزار سال سے بھی زیادہ پرانی تصنیف... بہت سی باتیں ہمارے سامنے پیش کر دیتی ہے، اور ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اس کے کون کون سے نقطے ایسے ہیں جو دوسرے ملکوں اور مختلف زمانوں کی کہانیوں اور روایتوں سے مطابق یا مماثل ہیں۔

اس سے نہ صرف ہمیں مصریانِ قدیم کے رسم و رواج، طور و طریق اور رائے و خیال کا علم ہو جاتا ہے، نہ صرف اس عہد میں مسئلہ تناسخ کے وجود کا پتہ ملتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے عقیدے میں رُوح جسم سے الگ ایک وجود رکھتی تھی، یہ فسانہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ عورت کے متعلق مصریانِ قدیم کیا خیال و عقیدہ رکھتے تھے۔

اس فسانے کے متعلق یہ سوال چنداں اہم نہیں کہ آیا یہ بالکل طبعزاد ہے یا دوسرے ذرائع سے مصر میں پہنچا تھا کاتب انانا کو اس کا مخترع کہا جائے یا مولف، اس کی دلچسپی میں کمی نہیں آتی۔ اگر اس کو مستعار، مختار، یا ترجمہ بھی مان لیا جائے تو اس کی اچھی انشا، اس کی سادگی، اس کی تازگی اور اس کا تسلسلِ بیان خیال کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

انگریزی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ مترجم نے التزام رکھا ہے کہ اصلی عبارت کا انداز قایم رہے، اور اس لئے میں نے بھی ترجمے میں خیال رکھا ہے کہ وہ شان باقی رہے۔ قوسین میں الفاظ ربط دیدیئے ہیں۔ لیکن پھر بھی اگر سلاست کی کمی پائی جائے تو اس کا یہ استفادہ بہت زیادہ قابلِ قدر ہے کہ ہم اتنا قدیم اندازِ بیان و انشا کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

(ایک ماں باپ سے دو بھائی تھے، بڑے کا نام انپو اور چھوٹے کا باتو تھا، اور انپو کا ایک گھر تھا اور اس کی بیوی، اور وہ چھوٹے بھائی کو بیٹوں کی طرح رکھتا تھا، اس کے کپڑوں وغیرہ کی خبرگیری کرتا تھا، وہ اپنا جوارے کر کھیت پر چلا جاتا تھا اور صرف اس وقت جب (کھیت کی جتائی ہو چکتی تو وہ دیاتی) کھیت کے ہر کام میں مدد دینے پر مجبور ہوتا تھا، اور یہ چھوٹا بھائی خوب کام کرنے والا تھا۔ اس کے برابر کام کرنے والا سارے علاقے میں (کوئی) نہ تھا۔ جب بہت (دن) گزر گئے (تو) پھر چھوٹا بھائی جوارے کر کام کرتا تھا، جو اس کے (بڑے بھائی کا) طریقہ تھا، اور (اسی طرح) وہ بیلوں کو شام کے وقت لیکر گھر پہنچا کرتا تھا، اور (جب) وہ کھیت سے پلٹتا تو بیلوں کے لئے بہت سی چری کاٹ کر لاتا تھا، اور بڑا بھائی اپنی بیوی کے پاس گھر پر رہا کرتا تھا کہ کھائے اور پئے، اور چھوٹا بھائی بیلوں کی خدمت میں لگا رہتا تھا۔

اب، جب دنیا روشن ہوتی اور ایک نیا دن نکلتا۔ اور چراغ دگل کر دیا جاتا، تو وہ اپنے بڑے بھائی سے پہلے جاگتا، اور کھیت پر روٹیاں لے جاتا، کہ مزدوروں کو دے جائیں (تا، کہ مزدور) بھی اس کے ساتھ روٹی کھائیں، پھر وہ اپنے جوارے کے پیچھے ہولیتا، اور وہ (لوگ) اُسے بتاتے کہ اچھا چارہ کہاں ملے گا، اور وہ اُن کا کہنا مانتا۔ اور بیلوں کو اسی جگہ لے پہنچتا، جہاں چری اچھی ہوتی، جس کو بیل خوش ہو کر کھاتے۔ اس کے بیل اچھے نسل کے تھے اور ان کی بہاشت بڑھتی رہی، پھر ہل جوتنے کا وقت آگیا، اور اس کے بڑے بھائی نے اس سے کہا۔

"چلو جوارے لے چلو، کھیت جوتیں، کیونکہ کھیت اُبھر آئے ہیں (نیل کی طغیانی کے بعد)، ہل جوتنے کے لئے یہ موسم اچھا ہے، تو کھیت پر بیج لے چل، کیونکہ ہم ہل چلانے میں لگے ہوں گے"

یہ اس نے کہا اور اس کے چھوٹے بھائی نے وہی کیا جو اس کے بڑے بھائی نے کہا تھا...... اور جب دنیا روشن ہوگی اور (پھر) نیا دن نکلا تو وہ کھیت پر (اپنے جوارے کو لے کر) گئے اور کھیت میں اپنے مزدوروں کے ساتھ کام کرتے رہے، اور بہت خوش تھے کہ انھوں نے کتنا کام (ختم) کر لیا تھا...... اب ہوتا کیا ہے کہ کچھ دن بعد جب وہ کھیت پر تھے ان کو بیج کی (اور) ضرورت پڑی، اور اس نے چھوٹے بھائی کو (بیج کے لئے) گھر بھیجا اور کہا۔

"جلدی جا اور گاؤں سے بیج لے آ"

اور (جب) اُس کا چھوٹا بھائی (گھر پہنچا تو) بڑے بھائی

www.taemeernews.com

کی بیوی کو چوٹی گوندھتے پایا' اس سے بولا۔

"اٹھ اور مجھے بیج دیدے۔ مجھے جلدی کھیت پر پہنچنا ہے"

بھیا نے بہت جلدی کی ہے" اس پر وہ بولی۔

"جا کوٹھی کھول کے جو چاہتا ہے لے لے (اگر میں اٹھوں گی تو) میری چوٹی کھل جائے گی۔ اس پر وہ لڑکا کوٹھی میں گیا اور ایک بڑی ٹوکری بھرلی، کیونکہ وہ اناج کی زیادہ مقدار لے جانا چاہتا تھا' اور جب' وہ گیہوں اور جو کا بوجھ اٹھا کر باہر نکلا' وہ اس سے کہنے لگی'

"کتنا اناج لے چلا ہے؟"

"جو کے تین ماپ اور گیہوں کے دو سب پانچ ماپ لئے جا رہا ہوں" اس نے جواب دیا۔

(اس کے آگے یہ (تفصیلی) بیان ہے کہ اس مکار اور اور بدکار عورت نے (جوتھی فرکی بیوی کی طرح جب اس کو اپنی خواہش اور مرضی پر راضی نہ پایا) تو بدلا لینے کے لئے اس نوجوان پر کس طرح الزام لگایا' اور الزام کو سنگین بنانے کے لئے اپنے کچھ زخم بھی لگایا' اور ظاہر کیا کہ زخم اس کے دیور نے لگایا ہے)

شام کے وقت جب اس کا شوہر گھر پلٹا' جو اس کا روز مرہ کا معمول تھا' اور گھر میں داخل ہوا تو اپنی بیوی کو (اس طرح) پڑا پایا جیسے اس پر کسی بدنیت آدمی نے حملہ کیا ہو۔ اور اس نے۔ (بیوی نے) اس کو ہاتھ دھونے کے لئے پانی (بھی) نہیں دیا' جو اس کا معمول تھا' اور نہ اس نے اس کے لئے چراغ روشن کیا' اور اس کے گھر میں اندھیرا تھا' اور وہ وہاں کھلے (بدن) پڑی ہوئی تھی اس کے شوہر نے اس سے پوچھا۔

"تجھ سے کس نے بات کی ہے؟ اٹھ"

اس پر اس نے جواب دیا۔

"مجھ سے کسی آدمی نے تیرے چھوٹے بھائی کے سوا بات نہیں کی ہے"

یہ سن کر بڑا بھائی ایک شیر کی طرح (غصے میں) بھر گیا اور اس نے اپنی کلہاڑی تیز کی اور ہاتھ میں لے لی۔

(یہ) بڑا بھائی اپنے گھر کے کواڑوں کے (ایک پٹ کی) آڑ میں سو گیا' کہ چھوٹے بھائی کو (جب وہ) شام کے وقت بیلوں کو لے کر گھر آئے تو اس کو مار ڈالے۔ اب جب سورج ڈوبا اور اس نے حسب معمول کھیت پر سے چارے کا گٹھر سر پر رکھا (اور گھر آیا) اور ایک بیل کو باندھ دیا تو بیل اپنے رکھوالے سے کہنے لگا:-

"اپنے بڑے بھائی سے ہشیار رہنا جو تیرے سامنے وہاں کلہاڑی لئے تجھے قتل کرنے کو کھڑا ہے"

اور اس نے اپنے بیل کی باتیں سنیں' پھر دوسرے کو باندھا تو اس نے بھی وہی کہا' اور اس نے دروازے کی طرف دیکھا' تو اسے اپنے بھائی کے پاؤں نظر آئے جو کلہاڑی ہاتھ میں لئے دروازے کے پٹ کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ تب اس نے فوراً اپنا بوجھ پٹک دیا اور وہاں سے بھاگا' اور اس کا بڑا بھائی کلہاڑی لئے اس کے پیچھے بھاگا۔ چھوٹے بھائی نے سورج دیوتا ہرماشش (HARMCHIS) سے دعا مانگی۔

"عظمت والے آقا' وہ تو ہی ہے جو جھوٹ سچ کو الگ الگ (کرنا) جانتا ہے!"

اور سورج دیوتا اس کی شکایتیں سننے کو ٹھہر گیا' اور سورج دیوتا نے اس کے اور اس کے بڑے بھائی کے بیچ میں ایک زبردست ندی حائل کردی جس میں بہت سے گھڑیال تھے اور (اب) ایک اس کنارے پر اور ایک اس کنارے پر (تھا) بڑے بھائی نے دو ہاتھ لگائے بھی۔ لیکن اس کو (چھوٹے بھائی کو) مار نہ سکا' اس نے یہ کیا (اور) چھوٹے بھائی نے اس کنارے سے پکار کر کہا:-

"ٹھہر اور انتظار کر کہ زمین (پھر) روشن ہو' اور جب سورج کا گردا افق پر پھر دکھائی دے گا' اس وقت میں اس کے سامنے (اپنے آپ کو) تیرے روبرو کردوں گا کہ میں تجھے وہ دے سکوں کہ تو سچ کو جان جائے' کیونکہ میں نے تیرا کوئی قصور نہیں کیا ہے' ورنہ جہاں تو ہے میں اس جگہ نہیں آؤں گا' اور صنوبر کے جنگل کو (نکل) جاؤں گا"۔۔۔۔ جب دنیا پھر روشن ہوئی اور دوسرا دن نکلا تو سورج کا دیوتا ہرماشش نمودار ہوا اور انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا' اور لڑکے نے بڑے بھائی سے کہا ـــــ

"میرا پیچھا مت کر کہ تو مجھے بے انصافی سے قتل کرے میرے منہ سے جو نکلتا ہے' کیا تو نہیں سنتا ہے' یعنی (یہ کہ) میں واقعی تیرا چھوٹا بھائی ہوں اور تو میرے باپ کی جگہ تھا' اور تیری بیوی

میری اماں کی جگہ تھی۔" (پھر وہ اس الزام کی صفائی کر دیتا ہے جو اس پر لگایا گیا تھا۔ اور اپنے بھائی کو اپنی بے گناہی کا یقین دلا دیتا ہے)

لیکن (یہ معلوم کرکے) اس کے بھائی کی روح بہت بے چین ہوئی، اور وہ وہاں کھڑا ہوا رونے اور افسوس کرنے لگا۔ مگر وہ گھڑیالوں کے ڈر سے اپنے چھوٹے بھائی کے پاس نہ جا سکتا تھا اس کے چھوٹے بھائی نے پکار کر کہا۔

"دیکھ تو نے نیت خراب کی۔ اور اس کی جگہ تیرے خیال میں بھلائی نہ تھی۔ لیکن میں تجھ سے ایک بات کہتا ہوں، جو تجھے کرنا چاہیے (تو) اپنے گھر جا، اپنے مویشی کی رکھوالی اور خدمت کر، کیونکہ (اب) میں وہاں نہ جاؤں گا جہاں تو رہتا ہے، بلکہ میں صنوبر کے جنگل میں (نکل) جاؤں گا، اور جب تو مجھے پھر ڈھونڈھنے آوے تو میرے لئے تو اتنا کرنا، سن رکھ (کہ) میں اپنی جان کو اپنے آپے سے الگ کر دوں گا، تاکہ میں اسے صنوبر کے سب سے اونچے شگوفے پر رکھ دوں، اور وہ صنوبر کے درخت جیسے ہی کاٹا جائے گا تو وہ (شگوفہ) زمین پر آ رہے گا۔ جب تو اسے ڈھونڈھنے آوے تو سات برس ٹھہر کر ڈھونڈھیو، اور اگر تیری روح اس (انتظار کو) سہارے گی، تو پھر (تو) اسے (شگوفے کو) ٹھنڈے پانی کے ایک برتن میں ڈال دیجو، تب میں پھر زندہ ہو جاؤں گا اور (تیرے) سب سوالوں کا جواب دوں گا، اور جو کے پانی کی ایک بوتل بھی اپنے ہاتھ میں لے کر اس پر ڈال دیجو، مگر جو تو آوے تو اسے اپنے ہاتھ میں نہ رکھیو۔"

اور (پھر) وہ صنوبر کے پہاڑ پر چلا گیا، اور اس کا بڑا بھائی سر میں خاک ڈالتا ہوا اپنے گھر کو پلٹ گیا۔ اور جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوا، اس نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا، اور کتوں کے سامنے ڈال دیا، اور بھائی کے غم میں رہنے لگا۔ بہت دنوں کے بعد چھوٹا بھائی کوہ صنوبر پر پہنچا۔ وہ اکیلا تھا اور درندوں کا شکار کیا کرتا تھا، اور شام کو اس صنوبر کے درخت کے نیچے سو رہتا تھا، جس کے سب سے اونچے پھولوں میں اس کی جان (رہتی) تھی ——

اس کے بہت دن کے بعد اسی صنوبری پہاڑی پر اس نے اپنے لئے ایک جھونپڑی بنائی اور جو چیز اس کو پسند آتی وہ اپنی جھونپڑی میں جمع کرتا رہتا (ایک روز) جب وہ اپنی جھونپڑی سے نکلا (تو) اسے نون دیوتاؤں سے ملاقات ہوئی جو اس لئے آئے تھے کہ سارے ملک (مصر) کے باشندوں کی ضروریات پوری کریں، اور دیوتاؤں نے آپس میں باتیں کر کے اس سے کہا۔

"او دیوتاؤں کے بیل باتو۔ تو اس طرح اکیلا کیوں ہے؟ اپنے بڑے بھائی کی بیوی کے سبب سے تو نے اپنا گاؤں کیوں چھوڑ دیا ہے؟ (تجھے) خبر ہے، اس کی بیوی (تو) ماری گئی؟ بھائی کے پاس گھر چلا جا وہ تجھے سب حال بتائے گا۔"

اور ان (دیوتاؤں) کا دل میں اس کی طرف سے رحم آ گیا تھا، اس پر سورج کے دیوتا ہرماشش نے کنوم سے کہا کہ باتو کے لئے ایک بیوی بناؤ کہ وہ اکیلا نہ رہے، اور کنوم نے اس کے لئے ایک بیوی بنا دی جو وہاں (جنگل میں) بیٹھی ہوئی سارے ملک کی عورتوں سے خوبصورت تھی، اس میں تمام الوہیت (یعنی علوم) ہوتی تھی، اور وہ ساتوں ہاتھور اس کے دیکھنے کو بڑھے، اور انھوں نے ایک آواز ہو کر کہا۔۔۔

"اس کی موت ناگہانی ہوگی!"

اور وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا، اور جب وہ دن بھر جنگلی جانوروں کو شکار کر کے اس کے قدموں میں لا ڈالتا، وہ اس کے گھر میں بیٹھی رہتی، اور وہ اس سے کہنے لگا۔

"(گھر سے) باہر مت نکلیو، اگر تجھے سمندر اٹھا لے گیا (تو) اس کے قبضے سے تجھے نہ چھڑا سکوں گا۔ . . . . . . کیونکہ میری جان صنوبر کے سب سے اونچے شگوفے میں ہے، اگر کوئی ڈھونڈھنے گا تو مجھے اس کے ساتھ جنگ کرنا پڑے گی۔"

اور اس نے اپنا سب بھید اسے بتا دیا (اس کے) بہت دن کے بعد باتو روزمرہ کے معمول کے مطابق شکار کو گیا ہوا تھا کہ اس کی اکھڑ بیوی بھی اس صنوبر کے درخت کے نیچے ٹہلنے کو باہر نکلی جو اس کے گھر کے برابر (ہی) کھڑا تھا۔ سمندر نے اس کو دیکھ لیا اور اس کے پیچھے لپکا، لیکن وہ جھپٹ کر گھر کے اندر ہو رہی، مگر سمندر نے صنوبر سے پکار کر کہا۔

"اوہ، مجھے اس سے کس قدر محبت ہے!"

www.taemeernews.com

اس پر صنوبر نے اس کے بالوں کا ایک گچھا سمندر کو دیدیا اور سمندر اس کو مصر لے پہنچا، اور وہاں رکھ دیا۔ جہاں فرعون کے دھوبی (اس کے کپڑے دھوتے تھے' اور ان بالوں کی خوشبو فرعون کے کپڑوں میں بس گئی' اور پھر فرعون کے دھوبیوں میں جھگڑا ہونے لگا (وہ آپس میں) کہنے لگے۔

"فرعون کے کپڑوں میں کس تیل کی خوشبو ہے؟"

اور ان (دھوبیوں) میں روزانہ خوشبو کے متعلق حجت رہتی اور وہ اپنے فعل کو سمجھتے نہ تھے۔ لیکن سردار دھوبی سمندر کے پاس گیا کیونکہ وہ اس معاملے میں روز کی لڑائی جھگڑے سے بہت پریشان (ہوگیا) تھا۔ اور وہ کنارے پر وہاں کھڑا ہوگیا، جس کے مقابل پانی کے اندر وہ (بالوں کا) گچھا پڑا (رہتا) تھا۔ پھر وہ جھکا اور اُس گچھے کو اُٹھا لیا۔ جس میں ایک عجیب قسم کی خوشبو تھی۔ پھر وہ اسے فرعون کے پاس لے گیا۔ اور فرعون کے (دربار کے) تجربہ کار مذہبی پیشوا بلائے گئے اور انھوں نے فرعون سے کہا:۔

"یہ بال سورج کے دیوتا کی بیٹی کے ہیں' اور اس کے اندر تمام الوہیت ہے' سارا ملک تیرے قبضے میں ہے۔ ہر طرف اپنے سفیر بھیجدیئے کہ اس کو ڈھونڈھ لائیں' لیکن جو سفیر کوہ صنوبر کو جائے اس کے ساتھ میرے آدمی بھی جائیں کہ وہ اسے یہاں لاسکیں۔"

اور بادشاہ نے کہا:۔

"تم نے جو کچھ کہا (وہ تو) بہت (ہی) عمدہ بات ہے۔"

اور لوگ بھیجدیئے گئے۔ بہت دن گزر جانے کے بعد وہ لوگ پلٹے' جو (مختلف) مقامات کو بادشاہ کے لئے (اس معطر گیسوؤں والی کو) لینے گئے تھے۔ لیکن وہ لوگ نہیں پلٹے جو کوہ صنوبر کو گئے تھے' کیونکہ باتو نے ان کو قتل کر دیا تھا' اور صرف ایک آدمی کو زندہ چھوڑ دیا کہ بادشاہ کو خبر کردے۔

پھر بادشاہ نے بہت سی فوج' سوار اور پیدل' روانہ کی کہ جاکر اُس کو لائیں' اور اُن میں ایک عورت بھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں قسم قسم کے زنانہ زیور دیئے گئے۔ تب (کہیں) اس کے ساتھ وہ عورت (باتو کی بیوی) مصر میں آئی اور اس کے سبب سے سارے ملک میں خوشی اور جشن کیا گیا۔ اور بادشاہ اس سے بہت محبت کرتا تھا' اور اس کی حیرت آفریں خوبصورتی کے مطابق اُس نے (بادشاہ نے) اُس کی خاطر و دلداری کی۔ اور انھوں نے (اگلوں نے) اس سے کہا کہ اپنے شوہر کا حال بتادے۔ تب اس نے بادشاہ سے کہا۔

"صنوبر کے درخت کٹوادو تو وہ فنا ہو جائے (گا)"

پھر مسلح آدمی روانہ کئے گئے جو صنوبر کو کاٹ ڈالنے کے لئے کلہاڑیاں لے گئے اور وہ اس صنوبر کے پاس آئے اور انہوں نے اُس شگوفے کو کاٹ ڈالا جس کے اندر باتو کی جان تھی۔ پھر وہ (شگوفہ) گر پڑا اور باتو مر گیا جب زمین (پھر) روشن ہوئی اور نیا دن نکلا تو وہ صنوبر کا درخت بھی کاٹ ڈالا گیا' اور انیپو' باتو کا بڑا بھائی اپنے گھر میں گیا اور ہاتھ دھونے بیٹھا اور اس نے جو کے پانی کا برتن لیا جسے اس نے رال سے بند کر دیا' اور ایک دوسرے (برتن) کو شراب سے (بھرا) اُسے مٹی سے بند کیا' اور اس نے اپنی لکڑی اٹھائی' اور اپنے جوتے (پہنے) کپڑے بھی نئے اور سفر کا ناشتہ لیا اور کوہ صنوبر کا راستہ پکڑا، اور وہ اپنے چھوٹے بھائی کی جھونپڑی میں پہنچا۔ اور اُسے چٹائی پر پڑا پایا۔ وہ مر گیا تھا۔ چھوٹے بھائی کو مردے کی طرح پڑا دیکھ کر وہ رونے لگا۔ پھر وہ اپنے چھوٹے بھائی کی روح کو ڈھونڈھنے صنوبر کے درخت کے نیچے گیا جس کے نیچے اس کا چھوٹا بھائی شام کو لیٹا تھا' اور وہ تین سال تک ڈھونڈھتا رہا۔ مگر پتا نہ ملا۔ جب چوتھا سال آیا تو مصر کو واپس ہونے کی خواہش ہوئی اور اس نے (اپنے آپ) کہا' میں (کل) صبح بہت تڑکے چلا جاؤں گا۔"

اس میں اس کا (ایک) مطلب تھا۔ جب زمین روشن ہوئی اور ایک نیا دن نکلا' وہ اس صنوبر کے نیچے پہنچا۔ اور روح کو (بھائی کی) روح کو ڈھونڈھتا پھرا، اور جب وہ شام کے وقت گھر کو پلٹنے لگا اور اِدھر اُدھر دیکھا تو اُسے ایک پھل نظر آیا' اور جب وہ اُسے لے کر گھر پہنچا تو اُس کے چھوٹے بھائی کی روح وہاں موجود تھی۔ تب اس نے ٹھنڈے پانی کا برتن اٹھا کر اس میں اس (پھل) کو ڈال دیا' اور خود بیٹھ گیا' جو اُس کا روز مرہ کا معمول تھا۔ اب رات ہوتے ہی وہ روح پانی چوستی رہی' اور باتو نے اپنے تمام اعضاء کو جنبش دی' اور اپنے بڑے بھائی کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن اس کا قلب حرکت نہ کر سکتا تھا۔ اور انیپو' اس کے بڑے

بھائی نے ٹھنڈے پانی کا برتن اٹھالیا جس میں اُس کے چھوٹے بھائی کی روح تھی (اور وہ پانی) اسے پلا دیا۔ اور (اُس کی) روح اپنی جگہ پہنچادی گئی۔ تب وہ ویسا ہی ہوگیا جیسا کہ پہلے تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے کو چھاتی سے لگایا، ایک دوسرے سے باتیں کیں، اور باتو نے بڑے بھائی سے کہا۔

"دیکھ (اب) میں اپنے تئیں ایک بیل کا چولا بدلتا ہوں جس پر سب مقدس نشانیاں ہوں گی۔ اس کا راز کسی کو معلوم نہ ہوگا، اور تو میرے اوپر سوار ہو جانا (اور لے چلنا) اور جیسے ہی سورج نکلے گا ہم وہاں پہنچ جائیں گے جہاں میری بیوی ہے، بتا دکیا، تو مجھے وہاں لے چلے گا؟ اس سے تیری سب خواہشیں پوری ہوں گی جو مناسب ہوں گی۔ اگر تو مجھے فرعون کے سامنے لے جائے گا تو سونے چاندی سے لاد دیا جائے گا، کیونکہ میرا نصیبہ بہت چمکنے والا ہے، ملک کے تمام لوگ خوشی کے نعروں سے میرا خیر مقدم کریں گے۔ لیکن (اب) تم اپنے گاؤں کو (چلے) جاؤ۔"

جب پھر روشنی ہوئی اور ایک نیا دن نکلا تو باتو نے (بیل کا) چولا بدل لیا، جیسا کہ اُس نے اپنے بھائی سے کہا تھا، اور انیپو اُس کا بڑا بھائی، سویرے پو پھٹتے اُس کی پیٹھ پر سوار ہو کر روانہ ہوگیا، اور جب وہ اس مقام کے قریب پہنچے تو لوگوں نے بادشاہ کو خبر کی، اور جب بادشاہ نے اس کو دیکھا تو بہت خوش ہوا اور اس کے خیر مقدم میں ایک بہت بڑا جشن کیا، اُس سے بڑا جو بیان میں آسکتا ہے، کیونکہ یہ بہت بڑی خوش نصیبی (کی بات) تھی، اور اُس کی وجہ سے سارے ملک میں خوشی تھی، اس کے بڑے بھائی کے لئے جو اپنے گاؤں میں رہتا تھا، لوگ بہت سا سونا چاندی لائے، اور بہت (دوسری) چیزیں (بھی اُسے) دیں، اور فرعون اس کی بہت عزت کرنے لگا۔ سارے ملک کے لوگوں سے زیادہ (اس کی عزت کرتا تھا)

کچھ دن کے بعد وہ بیل "حرم" میں داخل ہوگیا، جا کھڑا ہوا جہاں وہ حسینہ (اُس کی بیوی) تھی، اور اُس سے کہنے لگا۔
"ادھر دیکھ! میں ابھی زندہ ہوں۔ اور سچ مچ"!

اس پر وہ بولی:۔
"تو کون ہے"؟

"میں باتو ہوں! اس وقت جب تو صنوبر کو کٹوا سکتی تھی تو نے فرعون کو میرا پتہ بتا دیا تھا تاکہ میری زندگی ختم کردی جائے (مگر) مجھے دیکھ، میں اب بھی سچ مچ زندہ ہوں، البتہ ایک بیل کی صورت میں ہوں۔

تب اس کی حسین بیوی نے یہ سن کر کہ اُس کا شوہر (بھی) اس سے بات کر رہا ہے بہت ڈری۔ پھر وہ "حرم" سے نکل گئی۔ اور بادشاہ اس کے برابر بیٹھ گیا، اور اس نے دیکھا کہ بادشاہ ابھی تک اُس پر مہربان ہے۔ اور وہ (خود) اس کی نظروں میں بہت محبوب ہے، تب اُس نے بادشاہ سے کہا۔

"مجھ سے دیوتاؤں کی قسم کھاؤ کہ تم جو میں کہوں گی اُسے پورا کروگے"!

پھر اُس (بادشاہ) نے وعدہ کیا کہ وہ جو کچھ کہے گی (وہ اُسے) پورا کرے گا، تب وہ کہنے لگی۔

"میرے کھانے کو اس بیل کی کلیجی ہونی چاہئے، کیونکہ تمہیں اس کی ضرورت نہیں ہے"

جب اس نے اس (بادشاہ) سے یہ کہا تو وہ اُس کی بات سن کر بہت رنجیدہ ہوا۔ اور فرعون بہت بڑی مشکل میں پڑ گیا

جب دنیا روشن ہوئی اور ایک نیا دن نکلا اور ایک بڑا جشن ترتیب دیا گیا کہ بیل کے سامنے قربانی چڑھائی جائے تو اس وقت بادشاہ کا ایک خاص خادم بیل کو مار ڈالنے کے لئے بڑھا اور جب وہ اس کو ذبح کر دینا چاہتا تھا۔ یہ واقعہ ہوا کہ لوگوں نے اُسے بچانا چاہا اور جب اس نے اس (بیل) کی گردن پر ہاتھ مارا تو خون کے دو قطرے، اُچٹ کر اس مقام پر جا پڑے جہاں فرعون کے محل کا پھاٹک تھا اور پھاٹک کے دو کھمبے نصب تھے۔ ایک قطرہ فرعون کے دروازے کے ایک جانب اور دوسرا دوسری جانب (جا) گرا اور وہاں الگ الگ دو خوبصورت درخت نمودار ہوگئے؛ تب لوگوں نے بادشاہ کے پاس اطلاع پہنچائی کہ خود شاہی محل کے پھاٹک پر دو خوبصورت درخت پیدا ہوگئے ہیں اور اس وجہ سے سارے شہر میں خوشی ہے، چند دن کے بعد بادشاہ جواہر کا پہنچے اور پھولوں کی مالائیں گلے میں ڈالے، اپنے سنہری رتھ میں سوار جب شاہی پھاٹک پر پہنچا تو (اس نے) ان دونوں درختوں کو دیکھا فرعون کی سواری کے پیچھے اُس کی خوبصورت ملکہ بھی اپنی رتھ میں سوار آئی

www.taemeernews.com

تھی۔ بادشاہ ایک درخت کے نیچے ٹھہر گیا۔ اور اس درخت نے ملکہ سے کہا۔

"آہ، بیوفا عورت! میں یا تو ہوں۔ میں ابھی زندہ ہوں میں نے چولا بدل لیا ہے، تو نے فرعون کو میرا پتا دیا تھا کہ میں جان سے مار دیا جاؤں۔ میں ہی بیل بھی تھا اور (بیل کے روپ میں بھی) تو ہی میری موت کا سبب تھی۔"

بہت دن گزر گئے، اور (جب وہ) حسین عورت بادشاہ کی نظر میں مقبول تھی اور وہ اس کو عزیز رکھتا تھا۔ اس نے بادشاہ سے کہا۔

"دیوتاؤں کی قسم کھا کر مجھ سے کہو کہ جو کچھ میں کہوں گی وہ سب پورا کرو گے!"

اس (بادشاہ) نے پھر اس کی ہر طرح کی خواہش پوری کرنے کا وعدہ کر لیا، تو وہ کہنے لگی۔

"ان دونوں درختوں کو کٹوا دو تاکہ اس میں سے خوبصورت میزیں بنائی جائیں۔"

اور اس کی جو خواہش تھی وہ سب پوری کی گئی۔ بہت دنوں کے بعد بادشاہ نے حکم دیا کہ ہشیار کاری گر آ کر فرعون کے درختوں (کی لکڑی) کو چیر ڈالیں، اور (وہ) حسین ملکہ قریب کھڑی تھی، اور ایک چھپٹی لکڑی کا ریزہ اڑ کر اس کے منہ میں جا پڑا۔ اور کچھ عرصے کے بعد یہ واقعہ رونما ہوا کہ اس کے ایک لڑکا پیدا ہوا، اور بادشاہ کو خبر پہنچائی گئی۔

"آپ کے شہزادہ پیدا ہوا ہے۔"

اور (وہ بچہ) باہر لایا گیا، اور اس کی نگہداشت کے لئے دایہ اور خادمائیں مقرر ہوئیں، اور سارے ملک میں خوشی منائی گئی لوگوں نے اسے ایک تہوار بنایا اور اس کا (لڑکے کا) نام رکھا گیا، اس وقت سے بادشاہ اس سے بہت محبت کرنے لگا۔ اور اسے "شاہزادہ حبش" کا لقب دیا۔

بہت عرصے کے بعد بادشاہ نے اسے ساری سلطنت کا نائب شاہ بنا دیا اور جب نائب کی طرح کام کرتے بہت دن گزر گئے تو بادشاہ مر گیا، فرعون آسمانوں پر پرواز کر گیا۔ اور دوسرے (شاہزادے) نے کہا۔

اب سارے بڑے بڑے، سرداروں اور بڑے بڑے درباریوں کو جمع کرو، میں ان کو پوری تاریخ سناؤں گا کہ میرے اور ملکہ کے درمیان کیا (واقعہ) گزرا ہے اور اس کی (فرعون) کی بیوی ان کے سامنے لائی گئی، اور اس نے (شاہزادے نے) سب کے سامنے اپنے تئیں اس (عورت) کو پہچنوایا اور انھوں نے (درباریوں نے سزا کا) فیصلہ سنا دیا، اور (پھر) اس کے پاس اس کے بڑے بھائی کو لائے۔ اور اس نے اس کو (بڑے بھائی کو) سارے ملک کا نائب سلطنت مقرر کیا۔ اس نے تیس سال شاہِ مصر کی طرح حکومت کی۔

جب وہ یہ تیس سال تک زندگی گزار چکا (مر گیا)، تو اس کے بھائی نے اس کے دفن کے دن اس کی جگہ لے لی (سلطنت اختیار کی)

نئی کتابیں

سیف و سبو۔ جوش ملیح آبادی کا خود کیا ہوا انتخاب۔	صہ
عرش و فرش۔ جوش ملیح آبادی کا نیا مجموعۂ کلام۔	للعہ
ایک ادبی ڈائری۔ از اختر انصاری	للعہ
روحِ عصر۔ اختر انصاری کا نیا مجموعہ	عہ
رعنائیاں۔ شکیل بدایونی کا مجموعۂ کلام	سے
۴۴ء کی معیاری غزلیں اور نظمیں۔	عہ
۴۴ء کی منتخب نظمیں۔	عہ
۴۴ء کی بہترین نظمیں۔	۱۲
مشعلِ راہ۔ نخشب کے کلام کا مجموعہ۔	سے

ملنے کا پتہ

نگارستان ایجنسی اردو بازار دلّی

عصرِ جواں

جوشؔ ملیح آبادی

اُٹھ اے ندیم کہ رنگِ جہاں بدل ڈالیں
زمیں کو تازہ کریں آسماں بدل ڈالیں

ہر اک لحاظ سے پکوان اس کا پھیکا ہے
یہ پاسِ ذوق یہ اونچی دکاں بدل ڈالیں

عروجِ نوعِ بشر کو فلک سے ٹکرا کر
خیالِ رفعتِ کروبیاں بدل ڈالیں

غم و خوشی کو مرتب کریں بہ طرحِ جدید
یہ شکلِ خندہ، یہ طرزِ فغاں بدل ڈالیں

بہت ہی تنگ ہے یہ جامہ ذہن و معنی پر
یہ سست لہجہ یہ سطحی زباں بدل ڈالیں

جو زنگ خوردہ ہے مدت سے اور جو بیجاں
وہ کہنہ تیر، وہ ٹوٹی کماں بدل ڈالیں

تخیلاتِ اضافی کی رہنمائی میں
تعینات زمان و مکاں بدل ڈالیں

تعصباتِ گل و خار کو فنا کر کے
توہماتِ بہار و خزاں بدل ڈالیں

نظامِ وحدتِ اقوام کا ہے یہ منشور
کہ یہ تصورِ سود و زیاں بدل ڈالیں

لباسِ کہنہ، جوانِ عصر پر نہیں پھبتا
لباسِ کہنۂ عصرِ جواں بدل ڈالیں

تمام جبن و تجارت ہے مقصدِ اخلاق
یہ خوفِ نار، یہ شوقِ جہاں بدل ڈالیں

جدید ذوقِ تجسس کا حکم ناطق ہے
کہ یہ تخیلِ ربِّ جہاں بدل ڈالیں

قدیم وہم نے جس کو یقین سمجھا تھا
نئے یقین سے اب وہ گماں بدل ڈالیں

برائے کوکبۂ فکرِ تازۂ انساں
یہ کہنہ طبل و علم یہ نشاں بدل ڈالیں

بس اک فریب ہے یہ قوس توڑ دیں آؤ
بس اک غبار ہے یہ کہکشاں بدل ڈالیں

نظامِ کہنۂ پرہیز و رسمِ تقویٰ کو
بہ حکمِ حضرتِ پیرِ مغاں بدل ڈالیں

اُٹھ اے رفیق کہ اس عالمِ سبک سر کو
بہ نیم جنبشِ رطلِ گراں بدل ڈالیں

یہ ولولہ ہے تو آ، سب سے پیشتر اے دوست
مزاجِ طفلکِ ہندوستاں بدل ڈالیں

www.taemeernews.com

جھجک

مترجمہ شاہد احمد دہلوی

شام کا اندھیرا یلغار کرتا چلا آرہا تھا، وہ کھڑکی میں بیٹھی اس منظر کو دیکھ رہی تھی، اس کا سر کھڑکی کے پردوں سے لگا ہوا تھا اور مرجھاتے ہوئے خاک آلود پھولوں کی کسی ہوئی خوشبو اس کے مشام میں بس رہی تھی، وہ تھکان سے نڈھال ہو رہی تھی۔

بہت کم راہگیر سامنے سے گزر رہے تھے، آخری مکان میں سے ایک آدمی نکلا اور اپنے گھر کی طرف چل دیا، پکی سڑک پر چلنے کی آواز آتی رہی، پھر لال رنگ کے گھروں کے آگے بجری پر چلنے کی کھسکھساہٹ سنائی دی۔ اس جگہ پہلے ایک کھیت تھا جس میں سب بچے مل کر کھیلا کرتے تھے۔ پھر شہر کا کوئی آدمی آیا، اور اس نے کھیت خرید کر اس میں مکان بنوا دیے، ان کے مکانوں کی طرح یہ مکان چھوٹے چھوٹے اور مٹیالے نہیں تھے۔ پختہ بڑی اینٹ کے اور ان پر چمکدار چاندی کی چھتیں تھیں، پڑوس کے سب بچے کھیت میں کھیلا کرتے تھے، اس کے بھائی بہن بھی کھیلتے پھرتے تھے لیکن ارنسٹ کبھی کھیلوں میں شریک نہیں ہوا۔ وہ بہت بڑا ہو چکا تھا، ان کا باپ لکڑی لیے انہیں کھیت میں ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ ایک لنگڑا بچہ عموماً پہرے پر رہتا تھا، اور وہ سب کو خبردار کر دیا کرتا تھا، بچے بڑے خوش رہتے تھے، اس کا باپ اس وقت اتنا سخت گیر نہیں تھا، اور پھر ماں بھی تو جب زندہ تھی۔ یہ بہت دنوں کا ذکر ہے۔ اب وہ اور اس کے بھائی بھی سب بڑے ہو گئے تھے اور ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ پڑوسیوں میں سے کوئی مر چکا تھا، اور کوئی مکان چھوڑ کر چلا گیا تھا، ہر چیز بدلتی رہتی ہے، اب وہ بھی جانے والی تھی، اوروں کی طرح اپنا گھر چھوڑ کر۔

اپنا گھر! اس نے کمرے پر ایک نظر ڈالی، اور اس کی جانی پہچانی چیزوں کو دیکھا۔ ان چیزوں کی خاک اس نے برسوں جھاڑی تھی خدا جانے اتنی خاک کہاں سے آجاتی ہے، شاید آئندہ ان چیزوں کو وہ کبھی نہ دیکھے گی جن سے علیحدہ ہونے کا اسے کبھی خواب میں بھی خیال نہیں آیا تھا، ٹوٹے ہوئے ہارمونیم کے اوپر ایک پادری کی تصویر تھی جو امتدادِ زمانہ سے مدھم اور بدرنگ ہو گئی تھی۔ اس تمام سال کے عرصہ میں اسے اس پادری کا نام معلوم نہ ہو سکا تھا، بس اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ یہ پاپا کا کوئی دوست ہے اسکول کے زمانے کا۔ جب کوئی ملاقاتی اس تصویر کے بارے میں دریافت کرتا تو پاپا کہہ دیا کرتے "یہ اب یہاں نہیں رہتے۔"

اس نے گھر سے چلے جانے کا وعدہ کر لیا تھا، کیا یہ فیصلہ ٹھیک تھا؟ اس سوال کے ہر پہلو پر اس نے غور کیا تھا، اپنے گھر میں آرام سے رہتے اور کھانے پینے کی کمی نہیں تھی، اور وہ سب تھے جنہیں وہ ہمیشہ سے جانتی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ اسے بہت سا کام کرنا پڑتا تھا، گھر میں بھی اور نوکری میں بھی۔ جب یہ سنیں گے کہ وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے تو دکان والے کیا کہیں گے؟ یہی کہیں گے شاید کہ بڑی احمق تھی، اور پھر اس کی خالی جگہ کا اشتہار اخباروں میں دے دیا جائے گا۔ مس گاون بڑی خوش ہوں گی۔ وہ طعن ہی کیا کرتی تھی، خصوصاً جب گاہک زیادہ ہوں۔

"مس ہل، دیکھتی نہیں ہو یہ خواتین کب سے کھڑی ہیں؟"

"ذرا جی لگا کر کام کیا کرو مس ہل۔"

اب اس دکان کے جھگڑوں سے جان چھوٹ جائے گی۔ لیکن اپنے نئے گھر میں کسی دور دراز ملک میں یہ سب کچھ نہیں ہوگا، تب تو اس کی شادی ہو چکی ہوگی۔ لوگ اس کو احترام کی نظر سے دیکھا کریں گے۔ اس کے ساتھ وہ ذلت آمیز سلوک نہیں کیا جائے گا جو اس کی ماں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ وہ اب انیس سال کی ہو گئی تھی، مگر اب بھی پاپا سے پٹنے کا کھٹکا لگا رہتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اسی خوف سے اسے اختلاجِ قلب کے مرض میں مبتلا

کر دیا تھا۔ بچپن میں پاپا نے اس پرانی سنگی شہر کی جنتی سیر کی اور ارنسٹ پر کی۔ محض اس وجہ سے کہ وہ لڑکی تھی۔ مگر اب حال میں یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ ذرا سی فروگذاشت پر پاپا دھمکیاں دینے لگتے تھے اور کہتے کہ اگر تیری ماں نہ مری ہوتی تو تجھے ٹھیک بنا دیتا۔ اور اب اسے بچانے والا کوئی نہیں تھا۔ ارنسٹ مر چکا تھا، اور ہیری نوکر ہو کر باہر چلا گیا تھا، ہر ہفتہ کی رات کو روپے پیسے پر چیخ پکار مچتی تھی، اور وہ اس زندگی سے اکتا چکی تھی، وہ اپنی پوری تنخواہ ہفتے کے ہفتے پاپا کو دے دیا کرتی تھی۔ اور ہیری اپنی کمائی میں سے کچھ نہ کچھ ضرور بھیجا کرتا تھا، مگر جھگڑا اس وقت ہوتا تھا جب وہ پاپا سے اپنے خرچ کے لئے کچھ مانگتی۔ پاپا کہتے "تو روپیہ برباد کرتی ہے، تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے، میں اپنی محنت کی کمائی تجھے اڑانے کے لئے نہیں دے سکتا" اور جو کچھ میں وہ اس سے بھی زیادہ کہہ جاتے، اور ہفتہ کی رات کو ان کا مزاج بہت بگڑ جاتا تھا، لڑ جھگڑ کر پاپا اسے کچھ دیتے اور وہ ضرورت کی چیزیں خریدنے جلدی سے نکل جاتی، اپنا سیاہ چمڑے کا بٹوا ہاتھ میں دبائے بھیڑ میں سے گذرتی جاتی، اور کھانے کے سامان سے لدی پھندی گھر واپس آتی۔ گھر کی دیکھ بھال کی ساری ذمہ داری اس پر تھی، دو چھوٹے بچوں کی نگرانی وقت پر انہیں اسکول بھیجنا اور وقت پر انہیں کھانا دینا، یہ سب ایسے کٹھن کام تھے کہ اس کی زندگی اجیرن ہوتی جاتی تھی۔ مگر اب جو گھر چھوڑنے کا وقت آپہنچا تھا تو یہ زندگی کچھ ایسی بری معلوم نہیں ہو رہی تھی۔

اب وہ فرینک کے ساتھ نئی زندگی شروع کرنے والی تھی۔ فرینک بڑا نرم دل بہادر اور وسیع القلب تھا، اُسے ایک جہاز میں فرینک کے ساتھ جانا تھا، سمندر پار جہاں اس کی بیوی بن کر اُسے رہنا تھا۔ فرینک کا گھر اس کا منتظر تھا، اُسے وہ وقت خوب یاد تھا، جب فرینک کو اس نے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ شاہراہ پر ایک مکان میں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ ابھی اس بات کو چند ہفتے ہی تو ہوئے تھے، وہ دروازے میں کھڑا تھا، ٹوپی پیچھے سر پر کھسکی ہوئی تھی، اور اس کے کانسی رنگ کے چہرے پر بالوں کی لٹیں جھکی ہوئی تھیں، پھر ان دونوں کی ملاقات ہوگئی، دوکان کے باہر فرینک اس کا منتظر رہتا تھا اور چھٹی ملنے پر وہ گھر تک اسے پہنچا کر جایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ فرینک اُسے سینما دکھانے لے گیا، اور وہ مارے خوشی کے پھولی نہ سمائی، اسے موسیقی کا بہت شوق تھا، اور خود گاتا بھی تھا، لوگوں کو معلوم تھا کہ ان دونوں کی شادی ہونے والی ہے، اور جب کبھی وہ ملاح کی محبت کا گیت گاتا تو عجیب طرح سے وہ بوکھلانے لگتی، وہ اسے پیار کے ناموں سے مخاطب کرتا، شروع شروع میں اس کا دل زور سے دھڑکنے لگتا تھا کہ اس کا ایک عاشق ہے۔ مگر پھر خود اسے فرینک سے محبت ہوگئی۔ وہ دور دراز ملکوں کی کہانی سنایا کرتا، اس نے ایک جہاز پر بہت معمولی ملازمت کر لی تھی مگر رفتہ رفتہ ترقی کرتا گیا، اس نے کئی جہازوں پر لمبے لمبے سفر کئے، اور اب اس شہر میں سیر کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ پاپا کو اس معاملہ کی خبر ہو گئی تھی، اور انہوں نے منع کر دیا تھا کہ اس ملاح سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھا جائے، انہوں نے کہا تھا "میں خوب جانتا ہوں ان ملاحوں کو"

ایک دن انہوں نے فرینک کو برا بھلا بھی کہا، اور اس دن سے یہ دونوں چھپ چھپ کر ملا کرتے تھے۔

شام کی تاریکی بڑھ گئی، اس کی گود میں دو خط پڑے ہوئے تھے، اندھیرے میں ان کی سفیدی جذب ہو رہی تھی، ایک خط ہیری کے نام تھا، اور دوسرا پاپا کے نام۔ پاپا اب ضعیف ہوتے جاتے تھے وہ سوچ رہی تھی کہ میری عدم موجودگی انہیں بہت محسوس ہوگی۔ کبھی کبھی وہ بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ حال ہی کا ذکر ہے کہ جب میں بیمار پڑی تو انہوں نے کہانیاں پڑھ کر سنائی تھیں، اور پرہیزی غذا بھی خود ہی پکا کر کھلائی تھی۔ اور جب ماما زندہ تھی تو ایک دفعہ سیر کے لئے بھی لے گئے تھے، اور وہاں پاپا نے ماما کی ٹوپی پہن لی تھی، تو سب بچوں نے قہقہے لگائے تھے۔

اس کا وقت نکلا جا رہا تھا، مگر وہ اسی طرح کھڑکی میں بیٹھی تھی۔ سر کھڑکی کے پردوں سے لگا ہوا تھا، اور مرجھائے ہوئے خاک آلود پھولوں کی بکھری ہوئی خوشبو اس کے مشام میں بس رہی تھی۔ دور کہیں سے باجہ بجنے کی آواز آرہی تھی، اسے یہ طرز یاد تھی۔ عجیب بات تھی کہ آج ہی کی رات یہ طرز سنائی دی، اور اس کے ساتھ وہ وعدہ یاد آیا، جو اس نے اپنی ماما سے کیا تھا۔ یہ کہ جب تک بھی ہو سکے گا سارے گھر کی نگرانی اور انتظام کروں گی، اسے ماما کی بیماری کی آخری رات یاد آئی تاریک کمرے میں وہ ماما کی پٹی سے لگی بیٹھی تھی، اور باہر کوئی ایک غمناک اطالوی دھن بجا رہا تھا۔ باجہ بجانے والے کو

www.taemeernews.com

کچھ دے کر چلتا کر دیا گیا تھا، کچھ دیر بعد پاپا کمرے میں آئے تھے اور بڑبڑا رہے تھے: "یہ کمبخت اطالوی گھسے چلے آتے ہیں"

وہ سوچتی چلی جا رہی تھی، اور ماما کی دکھ بھری زندگی اس کی ہستی کو سحور کرتی چلی جا رہی تھی، اس کی زندگی روزمرہ کی قربانیوں سے عبارت تھی، اور انجام دیوانہ پن، اس کے کانوں میں ماما کی آواز آ رہی تھی، جو پاگلوں کی طرح چیخے جا رہی تھی "بچاؤ، بچاؤ"

خوف کا ایک جھٹکا لگا، اور وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی، ہاں اسے بچنا تھا، فرینک اسے بچا لے گا، وہ اسے نئی زندگی دے گا، اور شاید محبت بھی، وہ زندہ رہنا چاہتی تھی، تو پھر دکھ کیوں بھوگے، اسے بھی خوش رہنے کا حق ہے۔ فرینک اسے اپنی آغوش میں لے لیگا، اُسے اپنے بازوؤں میں لپیٹ لے گا، اور اسے بچا لے گا۔

⁂ ⁂ ⁂

وہ اسٹیشن کی بھیڑ میں کھڑی تھی، فرینک کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھا، اسے معلوم تھا کہ وہ اس سے کچھ کہہ رہا ہے۔ بار بار کچھ کہہ رہا ہے سفر کے بارے میں۔

اسٹیشن فوجیوں سے بھرا ہوا تھا، ہر فوجی پر اس کا سامان لدا تھا، چوڑے دروازوں میں سے اس نے جہاز کے سیاہ ڈھانچ کی ایک جھلک دیکھی، ساحلی دیوار سے لگا لگا یہ جہاز کھڑا تھا، اور اس کی کھڑکیوں میں سے روشنی چھن رہی تھی، وہ کچھ نہیں بولی، اس کے رخسار زرد اور ٹھنڈے تھے، پریشان خیالی کی بھول بھلیوں میں اس نے خدا سے دعا مانگی "مجھے بتا میرا فرض کیا ہے"۔ جہاز نے کہر میں ایک غمناک سیٹی منتشر کی۔ اگر اب وہ چلی گئی تو کل وہ فرینک کے ساتھ سمندر پر اڑی جا رہی ہو گی، سفر کرنے کی اجازت دونوں کو مل گئی تھی۔ فرینک کی تمام مہربانیوں کے بعد بھی کیا وہ رک سکتی تھی؟ دماغی ہلچل نے اس کے جسم میں بے حسی پیدا کر دی اور اس کے لب دعا سے خاموشی میں متحرک رہے۔

اس کے دل میں ایک زبردست گھنٹی بجی، اس نے محسوس کیا کہ فرینک اس کا ہاتھ پکڑ رہا ہے "آؤ"

ساری دنیا کے سمندر اس کے دل کے چاروں طرف طوفانی موجیں اچھالنے لگے۔ فرینک اسے ان طوفانوں میں کھینچے لئے جا رہا تھا، وہ اسے غرق کر دے گا، اس نے دونوں ہاتھوں سے ریلے کے کٹھرے کو پکڑ لیا۔

"آؤ"

نہیں! نہیں! نہیں! بالکل ناممکن، اس کے ہاتھوں نے کٹھرے کو دیوانہ وار جکڑ لیا، اور اس کی چیخ طوفانی سمندروں کو چیرتی چلی گئی۔

فرینک نے پلٹ کر اسے آواز دی "جلدی آؤ" جہاز چھوٹ رہا تھا۔ فوجیوں کا ریلے پر ریلا آ رہا تھا، وہ آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا اور اس کا نام لے کر چیختا جا رہا تھا، اس کا سفید چہرہ فرینک کی طرف اٹھا ہوا تھا، بے حس، جامد۔ اس کی آنکھوں میں فرینک کے لئے محبت کا کوئی پیغام نہیں تھا، ان میں نہ تو جدائی کا غم تھا، اور نہ احساس کی چمک۔

نیا ادب میری نظر میں

لکھنے والے

مولانا عبدالحق، کیفی دہلوی، فیض، وقار عظیم، نیاز فتحپوری سیماب اکبرآبادی، جعفر علی خاں اثر، میراجی، حامد حسن قادری، ماہر القادری، خواجہ محمد شفیع، احتشام حسین۔

قیمت دو روپے

نگارستان ایجنسی اردو بازار دلی

www.taemeernews.com

جگر پارے

جگر مرادآبادی

زندگی ہے مگر پرائی ہے
وردِ عبرت تری دُہائی ہے

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

توبہ زاہد ہم اور توبہ مے
مفلسی وجہِ پارسائی ہے

بس اسی کی ہے زندگی جس نے
آپ اپنے پہ فتح پائی ہے

خاکِ منزل کو منہ سے ملتا ہے
یادگارِ شکستہ پائی ہے

عشق اور شکوۂ فراق جگر
عشق خود عالمِ جدائی ہے

www.taemeernews.com

چاندنی

وزیر حسن دہلوی (عثمانیہ)

"آپا!"

"جی!"

"مبارک بنگلہ پر فون دو کہ نجمہ جلدی آئیں!"

یہ کہتے فرزانہ نے کتاب بند کی، تپائی پر رکھی، آرام کرسی سے اٹھی، اور ٹہلنے لگی۔ سوچ میں کتاب کی یہ عبارت تھی۔

"...... انسان کی بڑی سرمایہ داری اس میں ہے کہ دل کا ناوارث بنے!"

ایسی باتیں فرزانہ کو بہت بھاتی ہیں، وہ اپنے کو بھی ان سے مالامال دیکھنا چاہتی ہے، اس وقت خانہ باغ میں ہے، اور کچھ یہی سوچ ہے۔ یہیں چار پہر آج نجمہ کا بھی انتظار ہے، اسی کے لئے فون دلوایا ہے، جو اس کی چہیتی سہیلی ہے، اور صبح ہی شادی آباد سے آئی ہے۔

کچھ دیر میں موٹر کے آنے کی آواز سنائی دی، پھر بنگلے کے گیٹ پر اس طرح ہارن بجا جیسے کوئی کہتا ہو "ہٹیے صاحب!" یہ وہ سریلا ہارن تھا، جو شہر کے غدار رستوں پر اکثر سنائی دیتا ہے۔ جیسے سر ساگر بجتا ہو، اور جس کے بجنے پر منچلوں کا تو یہ جی چاہتا ہے کہ موٹر سے بچئے کیا سامنے آجائیے۔!

موٹر گیٹ کے اندر آیا۔ اور ایک حسین اسکارا لے کر رکا۔ یوں نجمہ کی آمد آمد ہوئی، اور فرزانہ کے بشرے پر ہو دوڑ گیا۔ پھر نجمہ آتی دکھائی دی۔ فرزانہ نے سوچا "نجمہ سے شکوہ کیجئے کہ ایک تو آنے کا خط نہ لکھا، دوسرے غیروں کی طرح کہلا بھیجا کہ آگئی ہوں، تیسرے چار بجے چار پہ بلایا تو اب سواری آرہی ہے اس لئے آمادہ ہوئی کہ کچھ کہے، مگر زبان نہ اٹھی، بلکہ اپنے آپ قدم ادھر اٹھنے لگے جدھر سے نجمہ آرہی تھی۔ یوں یہ دونوں سہیلیاں ہنستی مسکراتی ایک دوسرے کی طرف بڑھیں، یہاں تک کہ گلے مل گئیں۔ اور دیر تک ایک نے دوسری کو سینے سے لگائے رکھا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی۔ ڈوبتے سورج کی رنگینیاں فضا میں بکھر کے سمٹ رہی تھیں، جوں جوں آسمان پر تارے چھٹکتے پریم پربت کے بنگلے بھی برقی قمقموں سے چراغاں ہوتے جاتے تھے۔ یہ بنگلے شہر کی آبادی سے کچھ دور ہیں، یہیں فرزانہ بھی رہتی ہے۔ ایک سہانی پہاڑی، اس پر کہیں کہیں آبادی، نام کے اعتبار سے پریم کا پربت جلوؤں کے اعتبار سے حسن کا دربار!

(۲)

یونہی فرزانہ سے نجمہ کی دو ایک ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ نجمہ آئی، کچھ دیر ہنسی بولی، جانے لگی تو فرزانہ بھی باتیں کرتی موٹر تک ساتھ آئی۔ آتے آتے خانہ باغ میں یہ سہیلیاں کبھی یہاں ٹھٹکیں، کبھی وہاں ٹھیریں۔ کچھ پھول توڑے، کچھ چنے۔ وہ بلند مقام، وہ ہرا بھرا باغ، وہ پرکیف سناٹا۔ وہ کبھی کبھی شہر کے اچھلتے ہوئے شور و غل کا سنائی دینا، ایک عجیب سماں تھا۔ بارے دونوں موٹر کے پاس آکھڑی ہوئیں۔ اور بڑی ہی دیر باتیں کرتی کھڑی رہیں۔ جب چاند نے ٹھیک کیا تو یہ اس وضع سے کھڑی دکھائی دیں کہ کوئی ان کی تصویر اتار لے، مگر آج جیسے جیسے چاند ابھرتا آتا تھا۔ نجمہ کی نگاہ بھی اس پر جمی رہی تھی، دل ڈوب رہا تھا، اور وہ کچھ گم ہوتی جاتی تھی۔ سبب اس نے فرزانہ نے پوچھا تو نجمہ ٹال گئی۔ اور منہ سے تو کچھ نہ بولی، مگر ایک ٹھنڈی سانس بھری، اور آنکھوں میں آنسو بھر لائی، اب پھر فرزانہ نے غور سے دیکھا، جیسے اس کی ہوشمندی کی دہائی دیتی ہو!

(۳)

"کیا بات ہے نجمہ؟"

"کچھ نہیں، فرزانہ!"

"کوئی بات تو ہے۔"

"نہیں!"

"مجھ سے کہنے میں پردہ ہے؟"

"نہیں!"

"پھر؟"

یہاں نجمہ کی نظریں پھر چاند کی طرف اٹھ گئیں۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں جو آنسو تھے وہ چاندنی میں اور بھی جھلکنے لگے

پھر فرزانہ کو دیکھا، اور اس کے گلے میں باہیں ڈال کے بے محابہ رونے لگی، اس سے فرزانہ بھی کلپ گئی، پھر بھی نجمہ کو سمجھایا، سنبھالا، اور اصرار سے پوچھا تو اس نے نظریں جھکائے جھکائے اس طرح کہا۔

"کیا بتاؤں؟ تم سے کہتے سی لاظ آتا ہے"، فرزانہ! خیر، سن لو شادی سے پہلے چاندنی راتوں، ندی کنارے اکیلی ٹہلنے جایا کرتی تھی؛ اور یہ بات تم سے اس لئے نہیں کہی تھی کہ تمہیں نہیں بھائے گی جس روز کا یہ ذکر ہے، چاند کی کچھ یہی تاریخ تھی جو آج ہے، اور میں موٹر سے اتر کے ٹہل رہی تھی کہ دیکھا سامنے چاند نکل رہا ہے۔ ہائے! اس روز بھی اس کا ایسا ہی طلسمی انداز تھا۔ جونہی چاندنی چھٹکی، ہوا میں دلفریب خنکی آئی، آس پاس کے کھلتے پھول اور مہک اٹھے اور دور و نزدیک کبھی کبھی پرند بھی بولنے لگے۔ ان باتوں سے میں کچھ کھو سی گئی تھی کہ مجھے کسی کے پیروں کی آہٹ سنائی دی۔ تم جانو، رات کا وقت، ہو کا عالم، میں چونک پڑی، مگر کیا دیکھتی ہوں کہ پڑوس میں جو انجینیر صاحب رہتے ہیں، وہ میری طرف آرہے ہیں، وہ آئے، للیائے، گھگیائے، اور پھر کچھ اس طرح باتیں بنانے لگے جیسے بلبلِ ہزار داستاں بولتا ہو۔ مگر میں نے اُن کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا، اور گھر کا راستہ لیا۔ میں گھر بھی آئی تو ایسا معلوم ہوتا رہا جیسے انجینیر صاحب باتیں کئے جاتے ہیں۔ یہ باتیں شدہ شدہ مجھے الف لیلیٰ کی سی کہانیاں معلوم ہوئیں اور زندگی کے ہر گام پر نیند سی آنے لگی۔ پھر یہ نیند بڑھی اور آنکھ اس وقت کھلی جب میں نے انہیں اپنا سرتاج بنا لیا۔ مگر بیاہ کے بعد ہی میں نے یہ جان لیا کہ انجینیر صاحب کہیں سے بھی وہ نہیں جو دکھائی دیتے ہیں، پھر ان کا برتاؤ تو ایسا ہے کہ وہ نہ کسی کو اپنا بنا سکتے ہیں۔ نہ کسی کے بن سکتے ہیں۔ اس لئے میرا تو یہ خیال ہے، فرزانہ! دنیا دیکھنے کی شے ہے، برتنے کی نہیں!" یہ سن کے فرزانہ نے کہا۔

"نہیں، یہ بات تو نہیں۔ دنیا دیکھنے اور برتنے کے سوا سوچنے کی بھی چیز ہے ۔۔۔ پھر تم نے کہا! جوانی میں انسان سمجھ سے زیادہ دل ہوتا ہے، اور محبت جلدی بہکاوے میں آجاتا ہے۔ اس دن تم بھی چھٹکی چاندنی ٹھنڈی ہوا، مہکتے پھول، چہکتے پرندے کھا کر رہ گئیں اور تم نے دل پر بھروسہ کر لیا، پھر وہ بھی جوان دل! بھلا اس خانہ خراب کو کیا نہیں بھاتا بھاتا۔!"

یہ کہہ کے فرزانہ خاموش ہوگئی۔ نجمہ بھی چپ تھی۔ اس وقت چاند بدلی میں آگیا تھا، جس سے چوطرف دھیمی دھیمی روشنی تھی اور اسرار سے منڈلانے لگے تھے۔ نجمہ سوچ رہی تھی کہ فرزانہ نے کیا کہا؟ فرزانہ سوچ رہی تھی کہ ۔۔

"۔۔۔۔ شادی بیاہ میں اگلے وقتوں بڑے بوڑھوں کی پسند ہی بڑی چیز تھی، کیونکہ یہ دل کی بغاوتیں جان رہتے ہیں، مگر نجمہ نے انکو بھلا دیا، اور دوسروں کے دیکھا دیکھی آپ اپنی شادی رچا کے یہ بلا مول لی!

اتنے میں چاند ابر سے نکلنے لگا۔ نجمہ نے سوچتے سوچتے ٹھنڈا سانس لیا اور کہا۔

"۔۔۔۔ سچ کہتی ہو فرزانہ! مجھ سے بڑی بھول ہوئی"

فرزانہ اس وقت جو سوچ رہی تھی اسی سلسلے میں کہنے لگی۔

"۔۔۔۔ یہ تمہاری بھول نہیں، نئی روشنی کی بھول ہے جس سے ہم چکا چوند میں آگئے ہیں، اور اگلے زمانے کی اپنی بہت سی اچھائیاں بھی ہمیں برائیاں دکھائی دینے لگی ہیں۔ غضب خدا، شادی بیاہ میں آج جوان بیٹا بیٹی کی پسند ہی سب کچھ ہو گئی ہے۔ اب یہ کون کہے کہ دل ایک سمندر ہے، جوانی اس کا بھنور، نہ ہو کہ یہ جلن ہمیں ایک دن ڈبو دے!"

(۴)

اس وقت مغرب میں چاند ڈوب چکا تھا، مشرق سے صبح ابھر رہا تھا!

عشقیہ کلام

اس مجموعہ میں ملک کے مشہور شعرا نے وارداتِ دل پر جو کچھ کہا ہے وہ جمع کر دیا گیا ہے۔ قیمت ۱۲/ر

حسن و محبت

ملک کے غزل گو شعرا کا منتخبہ کلام۔ قیمت دو روپے

نگارستان ایجنسی اردو بازار دلی

www.taemeernews.com

شاعر کی جوانی کے منصوبے ——؟

حفیظ جالندھری

دردسے بھرلوں دل کا پیالہ کرلوں بے کیفی کا ازالہ
میرا قفلِ خموشی ٹوٹے قید سے چھوٹیں نغمہ و نالہ
دردسے بھرلوں دل کا پیالہ

ابکی مرتبہ اک ظالم کو سوجھا ہے مضمون نرالا
میری جوانی کے منصوبے پوچھ رہا ہے پوچھنے والا
سوجھا ہے مضمون نرالا

مقصد یہ ہے اپنی بیتی جگ کو پھر اک بار سنادوں
میں یہ دکھڑے رو تو چکا ہوں کیوں نہ کلام اپنا دہرادوں
جگ کو پھر اک بار سنادوں

میری جوانی کے منصوبے میرا سخن میری تحریریں
میرے ارادوں کے افسانے میری حسرت کی تصویریں
میرا سخن میری تحریریں

تو یہ سمجھا میں نے شاید لطف بات چھپا رکھی ہے
آنسوؤں کی تلخی کے سوا بھی اور کوئی لذت چکھی ہے
لطف بات چھپا رکھی ہے

تو یہ سمجھا میری جوانی اک بدمست جوانی ہوگی
رِندی کا اک دریا ہوگا دریا میں طغیانی ہوگی
اک بدمست جوانی ہوگی

اک میخانہ ہوگا جس میں بھاری بھاری مٹکے ہوں گے
دیکھ کے میری عیش پرستی زاھدوں کے منہ لٹکے ہوں گے
بھاری بھاری مٹکے ہوں گے

تو یہ سمجھا میری تسکیں ناچ رنگ کی محفل ہوگی
اور اس منصوبے کی تہ میں کوئی حورِ شمائل ہوگی
ناچ رنگ کی محفل ہوگی

حسن کی منڈی میں بھی شاید میرا آنا جانا ہوگا
رقاصہ کی چاہت ہوگی مطرب سے یارانہ ہوگا
میرا آنا جانا ہوگا

کوئی ایک پری بھی ہوگی میرے خوابوں کی محبوبہ
جس کو اڑا کر لایا ہوگا میری جوانی کا منصوبہ
میرے خوابوں کی محبوبہ

یا اک حسین راہگذر پہ میں نے ڈالے ہوں گے ڈورے
میری بھونڈی گردن ہوگی اس کے بازو گورے گورے
میں نے ڈالے ہوں گے ڈورے

تو کہتا ہے میں یہ فسانے اپنی زباں سے آپ سناؤں
لڑکوں کو ترغیب گنہ دوں بڑے بوڑھوں کی گرماؤں
اپنی زباں سے آپ سناؤں

تو سمجھا میں بھی ہوں وہ شاعر جو بن پئے نہ رہ سکتا ہو
آگ نہ جب تک حلق سے اترے کوئی شعر نہ کہہ سکتا ہو
جو بن پیئے نہ رہ سکتا ہو

تو سمجھا ہے تو نے دیکھا کچھ بھی نہیں جز نفس پرستی
جس کے بیاں سے پا لیتے ہیں بگلے شاعر شہرت سستی
کچھ بھی نہیں جز نفس پرستی

میری جوانی نے بھی دیکھے عام روش کے یہ نظارے
شرم نے لیکن پھیر لیں آنکھیں کرتے رہے گو لاکھ اشارے
عام روش کے یہ نظارے

میری جوانی ہندستانی بیچاری مجبور جوانی
قوم و وطن کے درد میں شامل آزادی سے دور جوانی
بیچاری مجبور جوانی

میری جوانی کے منصوبے شیدا لئے تحصیل ہنر تھے
جب میں جواں تھا میرے ساتھی اہل دل تھے اہل نظر تھے
شیدا لئے تحصیل ہنر تھے

اکثر ہم عصروں کے چلن سے میرا نصب العین جدا تھا
ہاں دنیا کی شرم نہیں مجھ کو بیشک مجھ کو خوف خدا تھا
میرا نصب العین جدا تھا

ایک کاروباری

اختر اورینوی

قرمزی رنگ کی خوبصورت سی سیڈان کار کوٹھی کے پورٹیکو میں زن سے آکر رکی۔ اگلی سیٹ کا پٹ کھلا۔ پائپ کے تمباکو کی خوشبو ایک گٹھیلے پست قد شخص کی پیش قدمی کرتی ہوئی تمام بھیل گئی۔ گہرا سانولا رنگ، دھنسی ہوئی مگر تیز عقابی آنکھیں، ترشی ہوئی بلند پیشانی۔ پہل دار کھوپڑی میں ہلکے گھونگھریالے بال بہت اونچے، طوطے جیسی نما ناک اور لانبا سا چہرہ۔ لانبی ناک اور لانبے چہرے نے چھوٹے سے قد والے کی شخصیت کو پس منظر میں پھینک دینے کی بجائے اسے اور نمایاں کر دیا تھا۔ پائپ منہ میں لگائے برآمدے کی سیڑھیاں وہ بڑی پھرتی سے چڑھا۔ پینٹ اور ہاف شرٹ میں اس کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی۔ چست و چالاک عضلات ایک برق تپاں دماغ کے نہایت ہی موزوں شریک کار معلوم ہوتے تھے۔ وہ تیزی سے ہال کی طرف بڑھتا جا رہا تھا کہ یک بہ یک ٹھٹکا، ذرا اچانک سے کمرے کی طرف مڑ پڑا۔ دوسرے لمحے میں وہ میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ نفیس تمباکو کی بو میرے دماغ میں گھس گئی۔

میں ابھی ابھی اس کے گھر میں مہمان ہوا تھا۔ وہ میرے دوست کا بھانجا تھا۔ میری آمد کی اطلاع پہلے سے تھی۔ مہمانوں کے کمرے کو کھلا دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ میں آگیا ہوں۔ اخلاقاً وہ مجھ سے ملنے کے لئے آگیا۔

وہ مجھ سے خلوص کے بڑے دکھلاوے کے ساتھ ملا خیریت پوچھی، سفر کی زحمتوں کے سلسلہ میں ہمدردی و فکر مندی کا اظہار کیا اور آسائش و آرام حاصل کرنے کے تقاضے کئے پر اس کی گردن گفتگو کے وقت تنی ہوئی اور خمیدہ رہی۔ نرم لب و لہجہ سے خود پسندی اور پندار جھانک رہے تھے۔ جیسے شفاف و نازک شیشے سے شعلہ۔ اس کے لب پتلے تھے۔ ٹھوڑی نیچے لٹکی ہوئی اور نہایت گداز۔ گلے کی جلد بہت تنی ہوئی اور جبڑا استوار۔ گال پچکے ہوئے نہ تھے مگر کچھ اسی طرح معلوم ہوتے تھے۔ چہرے کے نچلے حصہ کی ترتیب سے قدرے مسخرگی اور قدرے حماقت کا انعکاس ہوتا تھا۔ یہ تھی ہماری پہلی ملاقات۔

چھوٹا ناگپور کا حسین مرتفع خطہ ان دنوں فوجی چھاؤنیوں سے بھرا پڑا تھا۔ لاکھوں لاکھ فوجیں پہاڑی ڈھلوانوں جنگل کے کناروں اور مورم کے سرخ ٹیلوں پر چھائی ہوئی تھیں۔ فوجی مشق کے سلسلے میں توپوں کی دھوم گرج، ٹینکوں کی گھڑگھڑاہٹ، طیاروں کے فراٹوں، فوجی دیوزاد لاریوں کے زناٹوں، گھڑسواروں کی یلغاروں اور ننھی منی فیکٹریوں کی ہائیں ہائیں کے باوجود چھوٹا ناگپور کے نظری جلوے ہنوز دعوتِ نظارہ دیتے تھے۔ خوبصورت پہاڑی سلسلے، سکھوا اور دیودار کے ہرے بھرے جنگل، کہستان کی آغوش میں اچھلتی، بل کھاتی ہوئی ندیاں، بلند ٹیلوں اور چٹانوں سے نیچے بہنے والے پرجوش نالے، ہنڈرو اور جونا کے پر زور و نظر افروز آبشار خوش رنگ وادیاں نگاہ و دل اور دماغ و روح کے لئے سامانِ صد نشاط تھیں۔ آثارِ جنگ ان رنگیں وسعتوں میں محلول ہوکر بے آزار ہو گئے تھے۔ فطرت کے رچاؤ نے ان نشتروں کو کند سا کر دیا تھا۔ آدم کا گناہ اس جنت کی سنساریوں میں چھپ گیا تھا جنگل کے ہرے بھرے حاشیوں پر سرخ، خاکی اور سفید خیمے گوٹ کی طرح ٹکے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور سامنے لاریوں اور ٹینکوں کی قطاریں عظیم الجثہ جنگلی جانوروں کی مانند دکھلائی دیتی تھیں۔ دھان کے سبز کھیتوں کے درمیان ہوائی جہاز کا ایروڈرم اور لینڈنگ کے خطے ٹانک کی طرح جڑے ہوئے تھے۔

چھوٹے چھوٹے گاؤں کے کنارے پر اور میدانوں میں اینٹ کے لال لال بھٹے اور کھپروں کے پجاوے فضا کی نیرنگی اور دلچسپی میں اضافہ کرتے تھے۔ کھیتوں اور جنگلوں کے درمیان سے اچانک سر اٹھاتی ہوئی چمنیاں غیر متوقع مسرت کا سامان مہیا کرتی تھیں۔ مگر یہ سب غیر فطری مظاہر مل کر بھی فطرت کے بے پایاں حسن کے سامنے ہیچ تھے۔ ان کی حیثیت ماتھے کی بندی سے بھی کم تھی۔ وہ جنوبی بہار کی سطح مرتفع کا لامحدود جمال! اس دیا

www.taemeernews.com

میں سپاٹ پن تو نام کو بھی نہیں۔ نقشہ اور منظر ہر ہر قدم پر بدلتے رہتے ہیں۔ نئے خطوط نئے دائرے، جدید زاویے، نوع در نوع نشیب فراز، رنگ اور سائے کی نیرنگیاں، افق کا انوکھے سے انوکھا پھیلاؤ، زمین کی تازہ تر دلنوازیاں اور مہربانیاں بادل کے کھلاڑی پن سے آسمان پرنت نئی مصوّری اور ان سب کی بدعت بداماں ترتیب و تنظیم۔ تنوع کے امکانات بے پایاں اور لذّت کی نوعتیں بے حساب! برسات تو اس علاقے میں جادو کی بانسری بجاتی ہوئی آتی ہے۔ ڈھلوانوں اور ٹیلوں کی کوروں پر سبزۂ خوابیدہ جاگ اٹھتا ہے۔ درختوں کا ہریالا پن سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جنگل اتنے سحر انگیز طور پر جاندار ہو جاتے ہیں کہ ان کی روحانیت پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ نشیبی میدانوں میں دھان کے کھیتوں کے اندر سفید بیل۔ مشک رنگ مرد اور عنبریں عورتیں یہ سب مل کر مٹی کو سونا بنانے کے حقیقی کیمیا کو عملی شکل دینے میں مشغول نظر آتے ہیں۔ اساڑھ کے دھواں دھار بادلوں کا ایک چھینٹا پڑتے ہی کشت زاروں میں سبز مخملیں قالین بچھ جاتا ہے۔ لال لال مورم کے ٹیلے اپنا سر بلند ہی رکھتے ہیں اور اپنی سرخ روئی پر دھبہ آنے نہیں دیتے۔ مہوا، آم، جامن، سکھوا اور کٹھل کے پیڑوں کے جھنڈ ایسے ایسے خواب آور دوسکوں پرور گوشے اور سجیلے رسیلے سوچتے ہوئے کنج بنا دیتے ہیں کہ وہیں آسودگی سے لیٹ کر سانس لیتے ہوئے عمر تمام کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ ساون بھادوں کی لہک اور جھک کو پوچھئے نہیں۔ چیت سے کوئلیں کوکتے کوکتے ساون کی بہاروں پر تو قربان ہی ہو جاتی ہیں پپیہوں کی ہوک مسرّت و درد سے اضطرابِ مسلسل بن جاتی ہے اور گھریلو مرغے بانگ دیتے دیتے نڈھال ہو ہو کر بھی موسم کے تقاضے پورے کرتے جاتے ہیں۔ بولتا ہوا جنگل اور گونجتی ہوئی وادیاں اور کہسار زندگی کے چونچال پن کو تیوہاری کیف و نشاط عطا کر دیتے ہیں۔ بھانت بھانت کے پنکھ پکھیرو گیت گانے لگتے ہیں، جھینگر اور بینگ بھی اپنی ہستی پر اترا اٹھتے اور سرمستی میں الاپ لگاتے ہیں۔ حیات کتنے ان گنت منہوں سے میٹھے بول بولنے لگتی ہے۔ جیون سرگم کے تال سُر اور زیر و بم میں کتنا حیرت ناک تنوع پیدا ہو جاتا ہے۔ آبشار اور ندی نالے اچھل پڑتے اور اپنے ستارا ٹھا لیتے ہیں۔ میگھ دیوتا سب کے دامن موتیوں سے بھر دیتا ہے اور پَون کی بیوی چھاگل پہن کر جو ناچتی تھرکتی اور سنکتی پھرتی ہے۔ بہو بہوٹی اور نرالے نرالے رنگین کیڑے پیڑوں کے سائے میں اپنی سبھا جماتے ہیں اور شہد کی مکھیاں دوائی باکس بیل اور چمپا کے جنگلی پھولوں سے سرگوشیاں کرتی اُن کے مُنہ چومتی اور رس چوستی رہتی ہیں۔ برسات کی راتیں خوابناک ہوتی ہیں مگر چھوٹا ناگپور کی شب برشگال اور وہ بھی جب چاند کے رخِ تاباں سے ابر کا پردہ ہٹا ہوا ہو، نیند اُچاٹ کرنے والی ہوتی ہے عجیب عجیب نشیب و فراز، خطوط اور زاویوں، جنگل اور کشت زاروں کے درمیان چاندنی وہ وہ بہروپ بدلتی ہے کہ سطحِ مرتفع پریوں کا دیس معلوم ہونے لگتی ہے۔ سارا منظر نرم و گداز ہو کر سیّال سا ہو جاتا ہے اور جولانِ تخیّل کی نیرنگیوں کے مطابق پہلو بدلتا رہتا ہے۔ پردے اٹھتے اور گرتے ہیں، نئے نئے مناظر آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے سامنے آتے اور پھر اوپ ہو جاتے ہیں سطحِ زمین کے اتنے پہلو نشیب و فراز نے بنا رکھے ہیں کہ وہ چاندنی کی روپہلی چھوٹ سے آئینہ خانہ بن جاتی ہے اور تنوعِ نور سے آنکھوں کی نیند ناچنے لگتی ہے۔ برسات کی بھیگی چاندنی مدھ بھری رہتی ہے اور سرشار نرم خرام لطیف ہوا سے مہر آمیز سازش کر کے دل پر یہ اثر پیدا کرتی ہے کہ جیسے رخسارِ یاسمینہ و زلفِ نم آلود کا اتصال حاصل ہے۔ فضا کے دامن سے بھینی بھینی رس عشرت افشانی کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ چاندنی کی بسلاتی میں گم گشتہ نغموں کا سراغ ملتا ہے۔ چاندنی صرف چاندنی نہیں رہتی بلکہ نورِ مہتاب بانسری کی لَے، شراب کے سُکر، شہد کی شیرینی، بیلے اور جوہی کی خوشبو کی لطافت اور صبیح دوشیزاؤں کی حسین آنکھوں کی ناقابلِ اظہار محبت کناں مستیوں کا ساحرانہ مجموعہ بن جاتی ہے۔ جنوب بہار کی سطحِ مرتفع کی جاگتی ہوئی رات! کھیتوں سے بھیگی ہوئی مٹی کی سوندھی خوشبو اٹھتی ہے نم پروردہ جنگلوں سے نشیلی تیز لپٹیں آتی ہیں، اور پیڑوں پر انجان پرندے نرالی بیاکل کر دینے والی آوازیں اچانک بلند کرتے ہیں اور دور کے گاؤں میں آزاؤں منڈا اور کول نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنے سجیل، ترشے ہوئے گٹھیلے بدن کی

www.taemeernews.com

سر جوشی کے ساتھ مندرا اور ڈھول کی گتوں پر آدھی رات گئے تک ناچتے اور گاتے ہیں۔ ڈھول کی پیہم ڈھباڈھب اور مندرا کی گنگنک گیت کی طویل نرم تانوں "ای ای ای ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ی ی یا" او او او۔ او۔۔۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وو وو" سے مل کر ماحول کو دلنواز و مترنم بناتی ہوئی قلب گیتی میں تیر جاتی ہیں۔ مہوا اور چاول کی شراب رقص و نغمہ کے بعد بھی جسم و جان کی تھرتھری کو قائم رکھتی ہے۔ رات لڑکھڑا لڑکھڑا کر آغوشِ صبح میں نڈھال گر پڑتی ہے۔

چھوٹا ناگپور دولت مناظر کے ساتھ ساتھ معدنیات کے خزانے بھی رکھتا ہے۔ لوہے، کوئلے، باک سیٹ، ابرک اور تانبے کی کانیں بکھری پڑی ہیں۔ لاکھ جنگلوں میں کثرت سے ہوتا ہے اور یہ جنگلات اچھی اور کار آمد لکڑیوں اور بانسوں کا غیر مختتم مخزن ہیں میں تو اس دیار کا دیوانہ ہوں۔ اس سفر میں مجھے ایک اور دیوانہ ملا۔ مگر وہ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو" ہمارے حال پر صادق نہ آیا۔ میں شہیدِ جلوہ مناظر اور وہ ہلاکِ امکاناتِ صنعت ہر شخص بہ خیال خواہش خبطے دارد" میں جب اپنے مشاغل اور غم روزگار سے تھک جاتا ہوں تو جنوب کا رخ کرتا ہوں۔ ان جنگلوں میں حیات بٹتی ہے اور تمنائے حیات۔ دو ہفتے تک میں ان اضلاع جنوبی کے ایک صدر مقام میں ٹھہرا اور پھر جنگلوں میں آکر میں نے ڈیرا لگا دیا۔ یہ داستان اُن ہی دو ہفتوں کی ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ عروجِ داستان اُن ہی دنوں ہوا۔ ورنہ اس کا ماجرا تو زندگی بہت پہلے سے تیار کر رہی تھی۔

وہ ایک ٹھیکہ دار تھا اور ٹھیکہ داروں میں وہ اول درجہ کا ٹھیکہ دار تھا۔ اُن دنوں چھوٹا ناگپور میں ایروڈروم، سڑکوں، بارکوں اور دوسری تعمیرات کا کام زور شور سے ہو رہا تھا۔ کئی درجن بڑے بڑے ٹھیکہ داروں کے علاوہ سینکڑوں چھوٹے ٹھیکہ دار کام پر لگے ہوئے تھے اور انبار در انبار روپے کما رہے تھے۔ وہ ہمیشہ ایک بیوپاری رہا۔ تھوڑی سی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس کی شادی ہو گئی تھی غریب پسر ہونے کی وجہ سے بھی وہ تعلیم جاری نہ رکھ سکا اس کا باپ کمپاؤنڈر تھا۔ بہت ہی چھوٹے پیمانے پر اس نے بیوپار شروع کیا تھا اور آج وہ لکھ پتی تھا۔ کبھی وہ ایجنسیاں لیتا رہا کبھی کوئلے کی کانوں کے ٹھیکے اور کبھی تعمیرات کا کام کرتا رہا۔ اس کی ترقی اس کی محنت کی مرہونِ منت تھی۔ اور اب تو سرمایہ داری کی مشین محنت کے تناسب سے بے اندازہ بڑھ کر اس کے کیسوں کی صحت و توانائی میں اضافہ پر اضافہ کر رہی تھی۔ ابتدائی سیڑھیوں پر چڑھنے میں تو خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے مگر جب سرمایہ کا پہیہ کچھ بلندی پر چڑھ کر ہاتھ لگ جاتا ہے تو پھر دولت خود دیکھ لیتی ہے اور ہزاروں کا خون پانی کر کر کے بیوپاری کے چہرے کی آب و تاب بڑھاتی رہتی ہے۔

کامیابی کی پروردہ اس کے اندر بڑی خود اعتمادی پائی جاتی تھی۔ ہر مسئلے کے متعلق اس کی رائے قطعی ہوتی تھی اور چند ہی مسئلے ایسے تھے جن کے بارے میں وہ ذرا سکوت اختیار کر لیتا تھا۔ تجارت اور بیوپار تو اس کی اختصاصی چیز ہی تھی مگر وہ تعلیم و تربیت کے سلسلے میں بھی بند نہیں تھا۔ پہلی ملاقات کے بعد اسی رات کو کوٹھی کے احاطے میں ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ بیوپار کے کام دھندے ختم ہو چکے تھے جب اطمینان ہوا تو میز کے گرد سکوت تھا۔ یہ سکوت گراں بار ہوتا جاتا تھا۔ میں، میرے دوست، صاحبِ خانہ اور اس کا ایک رشتہ دار کارندہ یہ چار شخص بیٹھے ہوئے تھے۔ بے جوڑ سی صحبت تھی ہر شخص کسمسا رہا تھا۔ جب یہ خاموش تناؤ ناقابلِ برداشت ہو گیا تو میں محض سہارے کے طور پر ایک بات پوچھ بیٹھا "میں نے سنا ہے آپ نے چند علاقے بندوبست لئے ہیں جن میں کوئلے کی کانوں کے نکلنے کی توقع ہے؟"

پھر کیا تھا۔ تقریر شروع ہو گئی۔ وہ عموماً کم سخن تھا عام بیوپاریوں کی طرح وہ اکثر سنجیدگی کے عالم میں سوچتا ہی رہتا تھا یہی بیوپار کے جوڑ توڑ، اونچ نیچ، بھاؤ بٹہ، داؤ پیچ۔ اس نے اپنا مکمل پروگرام پیش کر دیا۔

"جی ہاں! میری بہت بڑی اسکیم ہے۔ میں نے ایک بہت بڑا علاقہ ایک سو سال کے لئے بندوبست لے لیا ہے۔ اس میں پہاڑ ہیں، جنگلات ہیں، وسیع زمینیں ہے۔ اس کے امکانات بے اندازہ ہیں" بیوپاری کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے پائپ کے کئی کش لئے "میں شیشے اور چینی کے برتنوں اور دوسری ظروف سازی کے کارخانے کھولنا چاہتا ہوں خام اشیا ضرورت کی سب موجود ہیں۔ سلیکا، بوک سیٹ، سیمنٹ، وغیرہ اور پھر کوئلہ وغیرہ

کا خزانہ [illegible] ہندوستان [illegible] جتنے شیشے کے کارخانے ہیں وہ [illegible] رانی گنج سے کوئلے جاتے ہیں۔ مگر میرا کارخانہ کوئلے کی کانوں [illegible] میں ہوگا۔ پھر چھوٹا ناگپور میں مزدوری بھی سستی اور وافر ہے [illegible] فرمائیے پیداوار کا خرچ کتنا کم ہو جاتا ہے۔ میں نصف قیمتوں پر بازاروں میں مال فروخت کروں گا۔ کلکتہ یہاں سے قریب ہے۔ کلکتہ تو کلکتہ سارے ہندوستان کے بازاروں میں میرے مالوں سے سیلاب آجائے گا۔ جنگ کی وجہ سے بیرون ملک سے شیشے اور چینی کے ظروف و آلات بالکل نہیں آتے۔ دوسرے مقابل کے کارخانوں کو بند ہونا یا میرے ساتھ اتحادی ٹرسٹ قایم کرنا پڑے گا۔ ملک بھر میں میری بلاشرکت اجارہ داری قایم ہو جائے گی۔ مال کی کھپت گرانی کے باوجود بہت ہوگی۔ ملٹری آرڈرس ابھی سے میرے پاس لاکھوں لاکھ کے آنے لگے ہیں۔ سول میں بھی کافی مانگ ہے اتنی کہ سپلائی مشکل ہے۔ لاکھوں لاکھ سالانہ کا منافع ہے۔ خیال فرماتے ہیں آپ تجارت کی وسعت اور اس کے ذریعہ سے دولت کمانے کے امکانات کتنے لامحدود ہیں۔ مگر بھائی جان افسوس آپ نہیں جانتے! میں بدنصیب آدمی ہوں۔ بندھا ہوا ہوں بندھا ہوا۔ خیر جانے دیجئے ان باتوں کو۔ جی ہاں! اسکیم یہ بھی ہے کہ مرکزی صنعت کے گرد دوسری ذیلی صنعتوں کا ایک جال بن [illegible] جائے۔ مثلاً پینٹ ورکس، کیمیکل ورکس وغیرہ۔ بعض ان میں سے [illegible] ترقی کر کے خود [illegible] انڈسٹری بن سکتی ہیں۔ آبشاروں سے ہائیڈرو الکٹرک ورکس کی ابتدا [illegible] ہوگی۔ طاقت [illegible] کا سرچشمہ کوئلہ اور روپے جب یہ دو چیزیں میسر ہوں تو کیا نہیں ہو سکتا [illegible]

وہ [illegible] اس کے منہ سے مسلسل طور پر چل ہو گیا تھا۔ پھکا پھک دھواں نکل رہا تھا۔ گردن زیادہ [illegible] اور [illegible] [illegible] نگاہیں آمنے کے چہروں کی بالائی سطح سے [illegible] ہوئی نہ جا [illegible] وہ قدرے چپ رہا۔ پھر اچانک بول اٹھا۔

"بھائی جان! آپ چھوٹا ناگپور نہیں [illegible] یہ سارے اضلاع ایک عظیم الشان ورکشاپ میں تبدیل کئے جا سکتے ہیں! افسوس میں چاروں طرف سے جکڑا ہوا ہوں۔ میری صلاحیتوں کا گلا گھوٹا جا رہا ہے۔ مگر آپ کو کیا معلوم!" وہ کوئی خاص بات کہنے کے لئے بے چین معلوم ہو رہا تھا۔ "کاش میں آزاد ہوتا تو میرے ذریعے سے بہت بڑی قومی خدمت انجام پاتی —"

غرض اُس نے اپنی اسکیموں اور پروگراموں کا ایک شاہنامہ سُنا ڈالا اور پھر بھی چپ نہ ہوا۔ وہ دوسرا دالمیا یا ٹاٹا کا مثل بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ بلکہ اپنی خاص الہامی گھڑیوں میں ٹیچایلڈ اور فورڈ کو بھی اپنے قدموں کے نیچے دیکھتا تھا۔ رات کے ساتھ بات بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ یک طرفہ باتوں سے میں اُکتا گیا تھا۔ مستقبل کے فورڈ نے پوچھا۔

"بھائی جان! آپ محکمۂ تعلیم میں ہیں نہ؟ تعلیم کے متعلق آپ کے کیا خیالات ہیں؟"

میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اُس نے سلسلۂ کلام جاری کر دیا۔ "بھائی جان!" یہ اُس کا تکیہ کلام تھا۔ "ہمارا نظام تعلیم قطعی لغو ہے۔ ناکارہ مگر خوش پوش نوجوانوں کے بنانے کی کل اگر دیکھنا ہو تو کالجوں کو دیکھئے۔ بگڑی ہوئی مشین سے بھی بدتر آج کل کے پڑھے لکھے نوجوان کوڑی کے تین تین۔ ہمارے نوجوان بزنس نہیں جانتے صبر نہیں تحمّل نہیں۔ محنت کرنے کا مادہ نہیں۔ حساب کتاب کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ مارواڑیوں کو دیکھئے بچپن سے بیوپار کی گھٹی دی جاتی ہے۔ لڑکپن سے ہی گدّی پر تعلیم کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم محض عیاشی ہے۔ بی اے پاس لڑکوں کو پیسہ بنانا نہیں بڑا نا آ جاتا ہے۔ شاعری اور فلسفہ سیکھنے سے کیا حاصل۔ شیکسپیر اور ملٹن سے زیادہ ضروری چیز بازار کا بھاؤ ہے"

دفتاً ہی سلسلۂ تقریر جاری تھا۔ میرا دوست اُٹھ کر چلا گیا۔ وہ بڑا بیزار دکھائی دے رہا تھا۔ روئے سخن اسی کی طرف تھا مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ایسی تقریریں متعدد بار کی گئی تھیں۔ جب کوئی معقول آدمی آجاتا تو یہ ٹاکی چلنے لگتی تھی بات یہ تھی کہ میرے دوست کے خالو نے اُسے کئی دفعہ بیوپار میں لگانا چاہا مگر ہرن پر گھاس لادنی کوئی آسان کام تو نہیں! ہر بار میں نقصان ہوا۔ پلیزر پارک پر گھاٹے کی اوس پڑ گئی اور سینما ہاؤس دم توڑتے توڑتے بچا۔

میز پر اب ہم تین آدمی تھے۔ وہ کارندے صاحب جو رشتہ دار بھی تھے اور گنے نہ گئے تھے مگر خاطر اُچٹے ہوئے تھے۔

www.taemeernews.com

"اچھا یہ فرمائیے بھائی جان کہ میں کیا کروں؟ کوئی اپنا کام کرنے والا آدمی میسّر نہیں آتا۔ میں تو بزنس کا جال بن دوں صنعتوں کے امکانات پر کبھی تفصیلی باتیں کروں گا۔ مگر رونا یہ ہے کہ کوئی بااعتماد اور کارداں اپنا آدمی نہیں ملتا۔ سب سے برا یہ ہے کہ میری ہمت افزائی گھر پر نہیں ہوتی۔ ناحق کی جرح تنقید۔۔۔" جیسے وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ میں اخلاقاً ساری رام کہانی سنتا جارہا اور ٹیلیفون کا ایر پیس بنا بیٹھا تھا۔ وہ پھر گویا ہوا۔

"جی ہاں! بھائی جان! شام کو میں اپنے سارے کام کو بھول جانا چاہتا ہوں۔ دن بھر بیوپار کی دُھن، انتظامات پیپر پلاننگ سینکڑوں کام ہیں۔ بڑا کارخانہ ہے۔ ٹرانسپورٹ بزنس، بلڈنگ کا کام، سینما ہاؤس اور سب سے بڑھ کر نئے کارخانے کی بنا ڈالنے کے لئے کی بورنگ شروع ہو گئی ہے۔ سائٹ مقرر ہو چکا ہے۔ عملے کے لئے کوارٹروں کی تعمیر کی ابتدا کر دی گئی ہے۔ ایک شہر بسانا ہے، پلانٹ فٹ کرنا۔ پاور ہاؤس لگانا۔ بھائی جان! دماغ پگھلتا ہے اس عظیم الشان کام سے اور میں تنہا ہوں۔ رات کے وقت جب تک ایک مشغول دماغ کو ایسی تفریح میسر نہ ہو جو نئی اُمنگ پیدا کر دے، نئی بشاشت لے آئے۔ فکر کش اور غم ربا ہو انرجی واپس نہیں آسکتی۔ بتلائیے میں کیا کروں؟" لفظ کیا بڑے مبالغہ اور بڑی تملاہٹ کے ساتھ ادا کیا گیا۔ "میری زندگی میں کوئی تحریک عمل نہیں کیا کروں! کس کے لئے کروں! بڑے حوصلے رکھتا ہوں مگر مقصد نہیں رکھتا۔۔۔ یہ سارا کام، اتنا بڑا کام ایک قومی امانت ہے، کیا اُسے برباد ہونے دوں؟ بتلائیے میں کیا کروں؟ گھر میں کوئی لطف نہیں، کوئی ہمدردی نہیں۔۔۔۔ مگر آپ نہیں جانتے۔"

آج وہ اپنے خیالات، اپنے حوصلوں، اپنی تمناؤں اور اپنی حسرتوں کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا مگر میرے اخلاق کے قدم اُکھڑ گئے اور میں اس کی پوری الف لیلہ سنے بغیر معذرت کر کے اُٹھ گیا اور اپنے پلنگ پر جا کر دراز ہو گیا اور سوچتا رہا کہ نہ جانے وہ اور کیا کچھ کہنا چاہتا ہے۔ شاید رازِ درونِ خانہ؟ اب میز پر دو آدمی رہ گئے۔ مگر فوراً ہی دو اور پکڑ بلائے گئے ایک منشی اور ایک سٹور بابو۔ بوس کی خواہش تاش کھیلنے کی تھی۔ تاش کا مشغلہ تا بہ دیر جاری رہا۔ گرمیوں کے دن تھے سب لوگ صحن میں ہی سوتے تھے۔ تاش کی وجہ سے بجلی کا ٹیبل لمپ جلتا رہا اور ہُلڑ بھی ہوتا رہا۔ میری نیند اُچاٹ ہو گئی خدا خدا کر کے کھیل ختم کیا گیا۔ بوس نے بھی آرام کی ٹھانی ایک ملازم نے بوس کے پلنگ کے قریب ایک چھوٹی سی میز پر دو شیشے کے گلاس، ایک دوا پینے کا پیمانہ، پیٹنٹ دواؤں کی تین عدد شیشیاں اور معجونوں کے دو ڈبے لا کر رکھے۔ دو دوائیں اسی وقت پی گئیں اور بقیہ رات کی آنے والی گھڑیوں میں سامانِ تقویت و راحت پیدا کرتی رہی ہوں گی۔ میں سو گیا۔

بوس کی ذات اور اس کے متعلقات و ماحول سے مجھے متجسسانہ دلچسپی ہو گئی۔ بوس کو بھی مشقِ سخن کے لئے ایک سننے والا مل گیا۔ اُس پر اُن دنوں بحرانی کیفیت طاری تھی۔ فرصت کے لمحات میں وہ مجھ سے بہت خلوص و بے تکلفی کو راہ دینے لگا۔ میں جب شہر سے دور چھوٹا ناگپور کی پہاڑوں کے عین آغوش میں جانا چاہتا تو وہ مجھے روک لیتا۔ گاؤں کی طرف نقلِ مکانی کرنے کے انتظامات میں بھی کچھ دیر ہو گئی۔ غرض میں دو ہفتے شہر میں ہی رہا اور ایک داستان کے آخری مراحل کو رونما ہوتے دیکھتا رہا۔

بوس کی شخصیت اور اس کا ماحول بہت ہی دلچسپ تھے رہائشی کوٹھی کے گرد بہت بڑا احاطہ تھا۔ اس کے ایک گوشے میں چند آم، جامن، کٹھل، گلاب جامن اور لیچی کے درخت تھے۔ دوسرے گوشے میں لکڑیوں کی چرائی کا کارخانہ۔ تیسرے میں [illegible] کا ایک مختصر اہرام ملامت شاہ کا مقبرہ بنا ہوا تھا۔ اور یہ پلے جیتھڑوں، پرانی چٹائیوں، دیوار کے ساتھ خوردہ [illegible] سائز کے پرانے کنستروں، دندان نما پھٹے ہوئے جوتوں [illegible] اکھڑی ہوئی رکابیوں کٹوروں، دامنِ عاشق کی طرح تار تار ٹوکریوں اور بہت سی زندہ و بے جان مخلوقات کے چڑھاوے چڑھے ہوئے تھے۔ زندہ ہستیوں میں مرغے، مرغیاں، کتے دیمک، بھانت بھانت کے پلو، گرگٹ وغیرہ ہوتے تھے۔ کوڑے کے اہرام کے اندر نہ جانے اور کبھی گراں مایہ چیزیں پوشیدہ ہوں گی محکمۂ آثار قدیمہ کی مدد کے بغیر ان کا انکشاف کسی ایک فرد کے بس کی بات نہیں تھی۔ اور یہ اہرام باہر کے پائخانہ جانے کے راستے میں حائل تھا۔ اس کو صبح کی ایک خاص نازک گھڑی

www.taemeernews.com

میں عبور کرنا کوہ پامر کے پار کرنے سے کم نہ تھا۔ پھر وہ ایک قبیلہ کا تنہا پاگخانہ، صبر و ضبط، دوربینی و سابقت اور سحر خیزی کی تعلیم دینے والا وہ ایک شاندار اور دلکش ادارہ تھا۔ یہ طومار غلاظت کوٹھی کی پیش نشست کے عقبی پہلو میں تھا اور بوس اندر کے پاگخانے کو استعمال کرتا تھا۔ ہاں گاہے گاہے کھڑے کھڑے پیشاب کرنے کو وہ ادھر آنکلتا۔ احاطہ کا یہ حصہ بوس کی اچوک، باضابطہ جزرس پُرزور کار و بارانہ صلاحیتوں کی منجدھار کے پہلو میں ایک لیس آبہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی زندگی کے بہاؤ میں اور بھی چند لیس آبے تھے۔ احاطے کے چوتھے حصّے میں ٹٹ گھر اور جھونپڑیوں کی کئی قطاریں تھیں۔ ان میں ریزے ریزیاں رہتی تھیں یعنی مزدور اور مزدورنیں۔ زیادہ تر نوجوان اُدھڑ عورتیں اور مُشنڈا لڑکیاں بھی تھیں۔ لڑکے کم تھے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ بوس کے لئے یہ سب گھریلو ڈربوں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ جب چاہا ایک جوڑا پکڑ لیا، کسی مرغی پر ہاتھ صاف کیا۔ خاص مصرف کے علاوہ ان ریزے ریزیوں کا عام مصرف ٹرانسپورٹ ٹرکوں پر سفری مزدوری کا کام کرنا تھا۔ آم اور جامن کے درختوں کے سایہ میں ٹرانسپورٹ کا مرکزی شڈ تھا۔ وہاں بہت سے منشی، مستری اور مزدور ٹرکوں اور موٹروں کی دیکھ بھال اور مرمّت شرمت میں مشغول رہتے تھے۔ کوٹھی کے مختلف کمروں میں آفس اور اسٹور تھے۔ بوس کے پاس دس بڑی بڑی ٹرکیں تھیں اور پانچ سیڈان کاریں۔ شورلٹ، فورڈ ڈوج، پل مین اور آسٹن۔ یہ سب آم اور جامن کے درختوں کے نیچے یوں پڑی رہتی تھیں جیسے باغ وحوش میں بڑے بڑے ہاتھی، اونٹ، گھوڑے، خچر اور گدھے۔ صرف ایک بوس کی خاص سواری کی کار گراج میں رہتی تھی۔ پیش نشست اور بے ترتیب خانہ باغ کے درمیان چٹائیوں سے گھیر کر ایک حلقہ بنا لیا گیا تھا جس میں ترکاریاں بوئی جاتی تھیں۔ وسط میں ایک کنواں تھا۔ اُس میں لاٹھا لگا ہوا تھا۔ وسیع احاطے میں کہیں برائے پھول نام کو بھی نہ تھا۔ تین سوکھے ہوئے گملے کاروبارانہ افادیت کے ستم رسیدہ کوٹین کے قریب ہی پڑے ہوئے تھے۔ صحن میں ایک درجن سے زیادہ نئی درآمد کی ہوئی ٹرکوں کی عارضی چوبی پیٹیوں سے تکیہ دار بنچوں کا مصرف لیا گیا تھا۔ احاطے میں ایک بیڈمنٹن کورٹ بھی تھا جس میں اتنی دھول اُڑتی تھی کہ شام کو بانس کے ڈنڈے اور جال لگ جانے کے پہلے میں اُسے ایک بڑا سا اکھاڑا سمجھا تھا۔ جبرا کیا تھا! وہاں بیڈمنٹن بھی یونہی کھیلا جاتا تھا جیسے کشتی لڑی جاتی ہو۔

غیر ذی العقول کا بیان تو ہوا مگر ذی العقول کا بیان اتنا آسان نہیں کیونکہ اس کا تعین اُس پینڈیمونیئم میں سخت مشکل تھا کہ صاحب عقل کون ہے اور کون نہیں۔ یا تو سب ہی بلا کے خردمند تھے یا پھر آوے کا آوا بگڑا ہوا تھا لہٰذا جاندار اور غیر جاندار کی تقسیم زیادہ مناسب ہے۔ جاندار ہستیوں میں بوس کے بعد سب سے اہم ہستی مسٹر پیارے کی تھی، وہ کشمیری برہمن تھا مگر اس کا خاندان سیالکوٹ پنجاب میں آکر بس گیا تھا۔ سُرخ و سپید رنگت، بھولا بھالا ناک نقشہ، جسم فربہ اور توند جسم کی فربہی کی نسبت سے زیادہ موٹی اور نیچے کی طرف مائل۔ بہت مسکرا مسکرا کر نرمی سے باتیں کرتا تھا۔ بوس کے احکام بڑے غور اور بڑی مودب سعادتمندی کے ساتھ یوں سنتا تھا جیسے اُس پر ملاءِ اعلیٰ سے الہام ہو رہا ہو۔ بوس سننے کے اس انداز کو بڑے غرور و پندار کے ساتھ پسند کرتا تھا۔ اُس کے خود پسندی اور آمریت کے جذبہ کی مکمل تسکین صرف پیارے کی سخن شنوئی سے ہوتی تھی۔ پیارے کی کامیابی کی پہلی کنجی یہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ چغل خوری میں وہ ماہر تھا اور اس کا رخیر کو اتنی صنّاعی کے ساتھ کرتا تھا کہ یا بید و شاید۔ وہ بوس کی رگ رگ پہچانتا تھا۔ شکایت و غیبت کا مرکزِ ثقل یہ ہوتا کہ فلاں رشتہ دار یا فلاں کارندے نے بوس کی ہدایات کے خلاف ہدایت دی یا کارروائی کی۔ بھلا بوس اس شرک عظیم کو کیسے برداشت کرتا۔ وہ بپھر اٹھتا تھا۔ پنڈت تب اُس شخص کی سفارش کرتا اور اس شخص کو سامنے بلوا کر کرتا۔ اس طرح مغضوب شخص کی گردن پر اپنا بارِ احسان ڈال دیتا اور اُسے اپنا گرویدہ بنا لیتا۔ یہ پتہ نہ چلتا کہ شکایت کس نے کی۔ صرف یہ ظاہر ہوتا سفارش

www.taemeernews.com

کس سے ہوئی۔ پیارے بوس کی نظریں پڑھتے ہوئے لوگوں کو اسی طرح گراتا تھا۔ وہ بوس اور اس کے سارے کاروبار کا مختارِ مطلق بن گیا تھا۔ بذلہ سنجی اس کی تفریح تھی اور اس کی ترقی کی گاڑی کا موبل آئیل بھی۔ چھوٹے ٹھیکہ داروں سے رو پیہ اینٹھنے اور ماتحتوں کو خوش رکھنے کے لئے وہ منجملہ اور حرفتوں کے اپنے لطیفوں اور اپنے مذاق کو بھی استعمال کرتا تھا۔

جمیل انور ٹرانسپورٹ انچارج تھا۔ لانبا سا چست چالاک نوجوان۔ لکھنوی مگر عادتاً پنجابی یعنی بہت ہی لفاظ لیکن چوکس اور نہایت محنتی۔ خاندانی مسلمان۔ ایک بی۔ اے۔ بی۔ ٹی پاس کرسچن لڑکی کے شوہر بننے کی عزت حاصل کرنے کے لئے ویسے عیسائی ہوگیا تھا۔ پر انشاء اللہ اور لاحول ولا قوۃ اب تک کہتا تھا۔ بائبل کے پندرہ نسخے گھر میں رکھ چھوڑے تھے۔ سنگار دان کے اوپر صلیب لٹکاتا تھا لیکن چرچ کبھی نہ گیا۔ اپنی عیسائیت کو بعض حلقوں میں چھپاتا تھا اور . . . . بعض حلقوں میں مبالغہ کے ساتھ ظاہر کرتا تھا۔ بلا کا کام چلاؤ تھا۔ بڑے سے بڑے افسر کو ٹھیک کر لیتا تھا۔ پٹرول کوپن حاصل کرنے میں ماہر تھا۔ بوس کے فرم کے حصے سے دوگونا پٹرول صرف اپنی چرب زبانی اور حکام رسی سے حاصل کر لیا کرتا تھا۔ ٹرافک اور ٹرانسپورٹ کی دنیا بھر کی غلطیاں بلکہ حکم عدولیاں اس کے چٹکی بجاتے عین قانون بن جاتی تھیں۔ پولیس کو وہ اچھی طرح جانتا تھا اور پولیس اسے خوب جانتی تھی۔ وہ پولیس کو اپنے کارندے کہا کرتا تھا ایسے کارندے جنہیں مشاہرہ ذرا بے ضابطہ طور پر دیا جاتا ہو۔ بوس کے پاس جو ٹرکیں تھیں وہ حکومت سے اس شرط کے ساتھ خریدی گئی تھیں کہ ان سے صرف جنگی تعمیرات کے کام میں مدد لی جائے گی اور حسب ضرورت اُجرت کے عوض یہ سنٹرل پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کے کام بھی کریں گی مگر ہوتا یہ تھا کہ رات کو احاطہ سے ٹرکوں کی ایک فلیٹ نکلتی تھی اور سینکڑوں روپے کرائے کے لے کر چور بازار کے لکھ پتیوں کے مال منزلِ مقصود تک پہنچاتی تھی۔ دن کو تو دفاع کے کام اور رات کو "سبوتاج" یا دودن سبیل سے بوس کی دولت بڑھتی جاتی تھی اور کاروبار کا مقصد یہی کیا تھا۔ اس رات کے چشنے کا پورا انتظام جمیل انور کے سپرد تھا۔ مانگ بے حد گاہک

اوپر تلے بیٹھ شب چمکا ہوا تھا۔ پولیس امن کی ذمہ دار تھی ہر کام بڑے پُرامن طریقے سے ہوتا تھا۔ اور بھی چند اونچے درجے کے ٹھیکہ دار دیدہ دلیری سے رات کی کمائی کرتے تھے مگر جتنے بے داغ طریقے سے بوس کا ٹرانسپورٹ منیجر نائٹ ٹرافک کراتا تھا بازار میں اور کوئی اتنی سینہ زوری اور صفائی کے ساتھ نہیں کرا سکتا تھا۔ پٹرول کا راشن ملتا تھا۔ بے جا طور پر راشن لینے پر بھی چور بازاری کے مطالبے پورے نہ ہو سکتے تھے، مگر چو کفر از کعبہ برخیزد، قسم کے ایک مرکزی ادارے سے "ڈرم کے ڈرم پٹرول سستے داموں مل جاتے تھے۔ جمیل انور پٹرول کے اس جہاد زمزم کی بڑی زیارت گاہ کا پیرانا زائر تھا۔ اپنی ان "سیہ بازاریوں" کے علاوہ وہ بوس کی جنسی فتوحات پر مرغوب لب و لہجہ میں تجاہلِ عارفانہ نوعیت کے توصیفی اشارے کر کے بھی اس کی نظروں میں دوسرا درجہ حاصل کئے ہوئے تھا۔ بوس اپنے جنسی تعددِ اختلاط کے نیم برہنہ تذکروں کو بڑی طمانیت اور بڑے فخر کے ساتھ سنتا تھا۔ یہ اس کے دل کا دوسرا دروازہ تھا۔ جمیل اسے اکثر کھٹکھٹایا کرتا تھا۔ نیز وہ احاطے کی جھونپڑیوں کی "ریزیوں" کو حسنِ انتخاب کو راہ دیتے ہوئے بدلتا بھی رہتا تھا۔

تیسری ہستی مسرور کی تھی۔ یہ بوس کا خزانچی، منیجر، منشی مشیر کار، تانش کا پارٹنر تھا اور نسبتی بھائی تھا۔ اقبال منچندانی ایروڈروم قسم کی چندیا اور کفایت شعار گردن۔ مسرور باضابطہ نمازیں پڑھتا، بوس کو مستحکم گالیاں سناتا اور اس کی حماقتوں پر کڑھتا تھا۔ وہ سارے عملے کے کچے چٹھے سے واقف تھا مگر اپنے کو لئے دیئے رہتا تھا۔ مسرور کہتا تھا کہ پیارے اور جمیل دونوں ظاہراً ایک دوسرے کے مخالف ہیں مگر در پردہ چور کے بھائی گرہ کٹ۔ ان دونوں نے مل کر چنی لعل ٹھیکہ دار کا دیوالہ نکلوا دیا مسرور اپنی ہوشیاری اور باریک بینی سے بوس کی فطرت کے اس تضاد کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اس پر اشرفی لٹی جائے کوئلے پر مہر کی مثال صادق آتی تھی۔ چوکس ہوتے ہوئے بھی خود رائی، خود بینی اور لاغری کی وجہ سے وہ نرکتے پر نکتہ کھا جاتا تھا بوس کسی پر اعتماد نہیں کرتا تھا۔ ایک ایک کام پر کئی ذمہ دار کارکن مقرر کر دیا کرتا تھا۔ کہیں پر خرچ میں خساست اور کہیں بے

www.taemeernews.com

فضول خرچی۔ طبیعت کی روانی میں اگر نقصان بھی اٹھانا پڑے تو اس کی پروا نہیں۔ جو کوئی بھی خواہ ٹوک دے تو اس سے برا کوئی نہیں۔ مسر وران باتوں سے کڑھتا رہتا تھا۔ مگر اپنی قدر اچھی طرح پہچانتا تھا۔

ان کے علاوہ بہتیرے تھے۔ ایک خنخنانے والا افغان تھا جو بوس کو دوائیں، مفرحات، مقویات اور "بنگلا پانی" پلاتا تھا۔ ایک نائب پیش خدمت جو بوس کی چمپی کرتا اور ضروریات شب پوری کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ بوس کا بدن جتنا بھی دبائیے اسے تسکین نہیں ہوتی اور اس کے تبدیلیٔ ذائقہ کی کوئی انتہا نہیں۔ اس سلسلے میں بوس کا معیار ذرا ٹھوس قسم کا تھا۔ وہ عورت میں نزاکت سے زیادہ استواری کو پسند کرتا تھا اور وہ موٹر مستری جو بالکل ٹھکری کا بادشاہ معلوم ہوتا تھا۔

ترے بغیر

(نواب) مکرم علیخاں مکرم

ساقی ہمیں حرام ہے پینا ترے بغیر
خالی پڑے ہیں ساغر و مینا ترے بغیر

آنکھوں میں اشک، سینہ میں سوزش، جگر میں درد
دشوار ہو گیا ہمیں جینا ترے بغیر

موجیں بھی تیز تیز۔ ہوا بھی خلاف ہے
ساحل سے کیا لگے گا سفینہ ترے بغیر

ہر لمحہ زندگی کا۔ ترے واسطے ہے وقف
مرنا ترے بغیر نہ جینا ترے بغیر

ساون کی رت میں اور مکرم یہ ترک مے
کیونکر کٹے گا ہم سے مہینہ ترے بغیر

ایک رات

میرزا ادیب (بی۔ اے آنرز)

یکایک ننھی چڑیا کی ننھی ننھی آنکھوں میں آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے امنڈ پڑے۔ سینے میں درد و غم کا شدید طوفان برپا ہو گیا اور وہ بمشکل اپنی سسکیوں پر قابو پاتے ہوئے گلوگیر لہجے میں بولی۔ "کاش میری طرح ہر ایک کا دل نرم ہوتا۔ دوسروں کے دکھوں کی کسی کو کیا خبر؟" یہ الفاظ سن کر شمع کے دئیے کی لو تھرتھرائی اور کہنے لگی "میری نرم دل ہمسائی پھر کہیں کچھ دیکھ آئی ہے؟ دوسروں کی مصیبتوں پر کڑھنا صرف تمہاری قسمت ہی میں لکھا ہے۔ یوں ہی غمگین ہو کر آنسو بہانے سے فائدہ؟" دئیے کا یہ فقرہ حساس چڑیا کے کانوں میں ایک نشتر کی طرح چبھا اور وہ مایوس ہو کر دیوار کے ساتھ جا لگی۔ وہ یقیناً اس بات سے بے خبر نہیں تھی کہ دیا اُس کی طرح رحمدل نہیں ہے مگر اسے یہ خبر نہیں تھی کہ اس کا ہمسایہ بدنصیب انسانوں کے دکھوں سے اس قدر بے نیاز بھی ہو سکتا ہے۔ جو منظر اس نے ابھی ابھی دیکھا تھا اس سے اس کا ننھا سا دل بیٹھا جا رہا تھا لیکن دیا کل کی طرح آج بھی ویسے ہی بے حس تھا۔ بے حس اور بے نیاز۔ جیسے غریب طالب علم کی دلخراش داستان کا ایک لفظ بھی اس کے کانوں تک نہیں پہنچا۔ جیسے اس کے نقطۂ نظر سے مصیبت کی اس کہانی اور عام ادھر اُدھر کی باتوں میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ فوراً اپنے اس گھونسلے کو چھوڑ کر کہیں اور چلی جائے۔ ممکن ہے کسی اور جگہ اسے اتنا آرام دہ گھونسلا میسر نہ آئے لیکن وہاں ایک سنگدل ہمسائے سے تو نجات مل ہی جائے گی۔ دئیے نے اس کا ارادہ فوراً بھانپ لیا اور ناصحانہ انداز میں بولا "ننھی چڑیا۔ خانقاہ کی اس دیوار کے اوپر میں نے زندگی کا ایک لمبا عرصہ گذارا ہے۔ اس عرصے میں میں نے انسانی زندگی کے ایسے ایسے پہلوؤں کو دیکھا ہے جن کا تم کبھی خیال بھی نہیں کر سکتیں اوروں کی زندگی کے تجربات سے میں نے صرف ایک ہی سبق سیکھا ہے اور وہ ہے سب کچھ دیکھو اور خاموش رہو۔ تم نے ابھی دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی اور معمولی معمولی باتوں پر خواہ مخواہ کڑھتی رہتی ہو۔ مجھے خدشہ ہے ایک دن اپنی آگ ہی میں جل کر خاکستر ہو جاؤ گی۔" اس پر چڑیا جھنجلا اٹھی۔ "چپ چاپ دیکھتی رہوں! یہ نہیں ہو سکتا۔ میرے پہلو میں گوشت کا دل ہے۔ پتھر کا ٹکڑا نہیں ہے۔ تمہارا کیا ہے۔ بوڑھے ہوئے بے حس ہو چکے ہو۔"

چڑیا کے یہ گرم گرم الفاظ سن کر دیا ہنس پڑا "میں بوڑھا ہو کر بے حس ہو چکا ہوں۔ یہ نئی بات ہے میرے لئے۔ میں بے حس نہیں ہوں۔ سب کچھ سمجھتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں۔ مگر تمہاری طرح جذبات کی رو میں بہہ نہیں جاتا! دن کے وقت تم ادھر اُدھر اڑتی پھرتی ہو مگر رات کے وقت تمہاری حالت دگرگوں ہو جاتی ہے۔"

"دگرگوں ہونے کی وجہ شاید تم نہیں جانتے۔ سب کچھ سمجھتے ہو اور اپنے آپ کو انجان ظاہر کرتے ہو۔ جس دنیا میں! میں سانس لے رہی ہوں اس دنیا میں خوشیاں بہت کم ہیں، مگر دکھوں سے کوئی دل بھی خالی نہیں ہے۔ مفلسی، بیچارگی اور بے کسی۔ انسانی زندگی میں کیا کچھ نہیں ہے جب میں ہر روز، ہر رات اپنے ارد گرد دردناک اور دلدوز مناظر دیکھتی ہوں تو سینے میں میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے" چڑیا نے بڑے غمناک لہجے میں جواب دیا۔

کچھ دیر تک چڑیا خاموش رہی۔ کیونکہ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کے الفاظ کا دئیے پر کچھ اثر بھی نہیں ہوا۔ اور یہ حقیقت بھی تھی۔ دیا بدستور سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہا تھا آخر خاموش رہنے کے بعد چڑیا بولی "تم اپنی آگ ہی میں جلتے رہتے ہو۔ دوسروں کی آگ میں جلو تو بات بھی ہے۔"

دیا بولا "چڑیا بہن! معاف کرنا میں نے تمہاری باتیں غور سے نہیں سنی تھیں۔ اس وقت میں ہوا کے ایک تیز و تند جھونکے کا مقابلہ کر رہا تھا۔ تم جانتی ہو اگر میں اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ تیز ہوا کا مقابلہ نہ کرتا رہوں تو مجھے ختم ہونے میں ذرا سی دیر بھی نہ لگے۔ طالب علم کی کہانی کیا ہے۔ ایک بار پھر سنا دو۔ ممکن ہے تمہیں میرے دل ہونے کا ثبوت مل جائے اور تمہاری مدد کے ساتھ میں کسی غریب کے کام آسکوں!"

چڑیا سمجھ گئی کہ اس کا ہمسایہ غریب طالب علم کے حالات کو محض اس مقصد کے ماتحت سننا چاہتا ہے کہ وہ اس کے اندر اپنی دلچسپی

www.taemeernews.com

کا سامان ڈھونڈ سکے۔ اس کے علاوہ اس کے پیش نظر اور کوئی بات نہیں ہے
تاہم وہ کہنے لگی " وہ چھوٹا سا مکان دیکھ رہے ہو نا اس کونے میں۔ اس میں ایک غریب طالب علم رہتا ہے۔ جو انتہائی تنگدستی کے عالم میں گزر اوقات کر رہا ہے۔ کل اس کا امتحان ہے اور اس وقت آدھی رات کو اس کے دیئے کی بتی دم توڑ رہی ہے۔ بیچارے کی آنکھیں کتاب کے صفحے پر لگی ہوئی ہیں اب تک یقیناً اس کے ارد گرد تاریکی پھیل چکی ہوگی کیا ہم دونوں مل کر اس کی مدد نہیں کر سکتے۔ اگر تم کہو تو میں تمہاری بتی لے جا کر اس کے دیئے میں رکھ دوں۔ کچھ دیر کے لئے تو اس کے کمرے کی فضا ضرور روشن رہے گی۔ کیا یہ بات سن کر بھی تمہارا دل نہیں پسیجا؟" یہ کہکر چڑیا پُر امید نظروں سے دیئے کی طرف دیکھنے لگی۔ دیا بدستور خاموش تھا چڑیا کے ذہن میں ایک نئی امید ابھرنے لگی۔ اُسے یقین ہونے لگا کہ اس کا ہمسایہ طالب علم کی کہانی سن کر کافی متاثر ہو رہا ہے۔ اور ابھی وہ اسے اپنی بتی لے جانے کی اجازت دے دے گا۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنے لگی کہ طالب علم نئی روشنی میں اپنی کتاب کا مطالعہ کر رہا ہے۔ اور یہ خیال کرکے وہ دل ہی دل میں بڑی خوش ہوئی دیئے کی لو تھرائی اور کہنے لگی " یہ کوئی ایسا اہم معاملہ نہیں ہے۔ تم تو خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ امتحان ہوتے ہی رہتے ہیں اور طالب علموں کا پاس فیل ہونا بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا!"

چڑیا مایوس ہو کر بولی " افسوس میں تمہارے متعلق غلط رائے قایم کر رہی تھی۔ باتیں بنانا خوب جانتے ہو تم!"

دیا ہنسا اور کہنے لگا " حقیقت کی جس گہرائی تک میں پہنچ سکا ہوں وہاں تک تمہارا تصور نہیں جا سکتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ مجھے اس طالب علم سے قطعاً کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ سنو۔ اس تمہارے ہیرو کا باپ تمام عمر کلرکی کرتا رہا اور زندگی کے کسی حصہ میں بھی اس نے اپنے غلامانہ ماحول کے خلاف بغاوت کی جرأت نہیں کی اس کا بیٹا بھی باپ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یعنی پڑھ لکھ کر کلرک بن جانا اس کا مقصد حیات کلرکی ہی کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ غلامی کی مشین کے ان پرزوں سے مجھے سخت نفرت ہے۔ میں اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی غلامی کو پرورش کرنے والی تعلیم کے لئے صرف نہیں کر سکتی" اب تمہیں معلوم ہو گیا میں بہانہ ساز نہیں ہوں حقیقت شناس ہوں"

چڑیا حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ یہ بات تو اس کے ذہن میں کبھی بھی نہیں آسکتی تھی۔

دیا جوش انگیز لہجے میں کہنے لگا " چڑیا بہن! مجھے معلوم نہیں تم اس وقت کیا سوچ رہی ہو۔ ممکن ہے میری بات کو محض ضرب سمجھ لو۔ مگر میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ایک حقیقی دکھی انسان کے لئے میں اپنی زندگی بڑی خوشی کے ساتھ قربان کر سکتا ہوں۔ میری بساط ہی کیا ہے۔ وقت کے ایک حقیر حصہ کے لئے مختصر سی فضا کو روشن کر دینا۔ اس سے بڑھ کر میں اور کر بھی کیا سکتا ہوں رات کی اس تاریک دنیا میں ضرور کوئی نہ کوئی ایسا انسان موجود ہوگا جسے میری روشنی کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی۔ اگر تم ایسے انسان کو ڈھونڈھ لاؤ تو مجھے اپنی روشنی دینے میں ہرگز انکار نہیں ہوگا بلکہ سچ پوچھو تو میں بہت خوش ہوں گا۔"

چڑیا نے اطمینان کا سانس لیا جیسے اس کے دل سے بھاری بوجھ اتر گیا ہے۔ یکایک اس کے دماغ میں ایک نیا خیال جاگ اٹھا۔ اور وہ سوچنے لگی آخر میرے پروں میں اتنی طاقت پرواز کہاں کہ ہر جگہ اُڑتی پھروں اور پھر اس اندھیری رات میں۔ اتنے گہرے اندھیارے میں!!

دیئے نے اس کا یہ خیال بھانپ لیا اور بولا " اب تم یہ سوچ رہی ہو کہ اندھیری رات میں کہاں کہاں اُڑتی پھروں گی۔ شاید تمہیں یہ معلوم نہیں کہ کچھ دیر ہوئی تم نے خود ہی کہا تھا۔ میں آج رات ضرور ایسے انسان کا پتہ لگاؤں گی جسے ہم دونوں کی مدد کی سخت ضرورت ہوگی اور یہی مقصد لے کر تم نے طالب علم کا پتہ لگایا تھا غریبوں کے محلے میں جا کر دیکھو تو سہی زندگی کیسے کیسے جانفرسا حادثات میں سے گزر رہی ہے۔ تمہارا خلوص تمہاری مدد کرے گا۔ میں بڑی بے تابی کے ساتھ تمہارا انتظار کرتا رہوں گا!"

چڑیا نے ادھر اُدھر دیکھا۔ چاروں طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی خوفناک اور بھیانک تاریکی۔ آسمان پر نہ چاند تھا نہ ستارے۔ فضا میں سیاہ بادل اڑے چلے جا رہے تھے۔ وہ سوچنے لگی اس تاریکی میں گھروں کے اوپر اڑنا ہے مکانوں کے اندر جانا ہے اور دکھی انسان کی تلاش کرنا ہے۔ اگر وہ کہیں کسی دیوار سے ٹکرا کر گر پڑی تو ہمیشہ کے لئے سرد ہو جائے گی۔ ایک لمحے کے لئے وہ جھجکی۔ اس کی نگاہ جب دیئے کی لو پر پڑی جو شاید مسکرا رہی تھی۔ اس کے سینے میں کوئی چیز چبھنے لگی اور وہ ایک تیز و تند جذبے کے زیر اثر بے خوف و خطر تاریک پُرسکوت

www.taemeernews.com

اور سرد فضاؤں میں اُڑنے لگی۔ اندھیرے کی تہوں میں سے گزرتی ہوئی وہ مکانوں کے اوپر ہی اوپر ایک خاص بلندی پر تیرتی چلی جارہی تھی۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ کبھی بلندی پر کبھی نیچے۔ بے خوف، بے جھجک ہوا کے سرد سرد جھونکے اس کے جسم کو چیرتے ہوئے گزر رہے تھے، اندھیرا لمحہ بہ لمحہ بھیانک ہوتا جارہا تھا۔ ایک مرتبہ کبوتروں کا بانس اس کے سینے سے لگا۔ ایک اور مرتبہ دیوار نے اس کا راستہ روکا۔ ان رکاوٹوں کے باوجود اس بھیانک، خوفناک تاریکی کے باوجود، وہ پوری تیزی کے ساتھ اُڑ رہی تھی۔ ایک دکھی انسان کو ڈھونڈنے۔ ایک ضرورت مند شخص کی تلاش میں۔

اچانک اس کے کان میں ایک آواز آئی "ماں! دیا جلادو ماں"! اسے یاد آگیا کہ وہ اس مکان کے قریب پہنچ گئی ہے جہاں ایک ننھی بچی کئی دن سے بخار میں تڑپ رہی ہے۔ وہ کھڑکی کے اوپر جا بیٹھی آواز پھر آئی "ماں! دیا جلادو، ڈر آتا ہے"

ننھی بچی کے اس فقرے نے اس پر خاص اثر کیا اور اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ آخر ماں دیا کیوں نہیں جلاتی۔ آرام سے سو رہی ہیں۔ اندھیرے میں بچی کا دل گھبرا رہا ہے۔ بچی نے پھر وہی الفاظ دہرائے اور رونے لگی اب ماں نے جواب دیا "سو رہ بچی! دیئے میں بتی نہیں ہے۔ رات گزر چلی ہے سو رہو میری رانی"!

اس پر بچی سسکیاں بھرنے لگی۔ چڑیا دل میں کہنے لگی، کتنا دردناک منظر ہے۔ اندھیرے میں بچی کا دل سخت گھبرا رہا ہے اور دیئے میں بتی تک نہیں ہے۔ میری زبان سے بچی کی بات سن کر ضرور بالضرور دیئے کی آنکھوں میں آنسو آجائیں گے۔ اس گھر میں روشنی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ یہ سوچ کر چڑیا اپنے گھونسلے کی طرف اڑنے لگی۔ بڑی مشکل سے وہ اپنے گھونسلے تک پہنچی۔ دیئے نے ساری باتیں سنیں لیکن اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔

"شاید مجھے ٹالنے کے لئے تم کوئی معقول بہانہ ڈھونڈ رہے ہو"! چڑیا بولی۔ اس کے الفاظ درد و غم میں ڈوبے ہوئے تھے۔

"ہرگز نہیں ---" دیئے کی لو تھرتھرا کر کہنے لگی "تم نے جو کچھ کہا ہے غلط یہ لفظ صحیح ہے۔ اندھیرے میں بچی سخت گھبرا رہی ہے۔ اور دیا تیل اور بتی سے محروم ہے۔ میری نگاہیں دور تک دیکھ سکتی ہیں مگر وہاں روشنی کی ضرورت نہیں ہے۔ بہن چڑیا! اگر کوئی روشنی ہوتی تو بچی کی دکھیاری ماں پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ اس کا شوہر ابھی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر اپنے مکان سے اتر کر یہاں سے گزرا ہے۔ اگر میں تمہیں یہ بتادوں کہ وہ کدھر جارہا ہے تو تمہیں بڑا رنج ہوگا۔ صبح ہوتے ہی وہ واپس آجائے گا۔ اب تمہیں معلوم ہوگیا ہوگا کہ وہاں روشنی کی کیوں ضرورت نہیں ہے"!

"میں تو کچھ بھی نہیں سمجھی ---" چڑیا نے اپنے ذہن میں ایک الجھن محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"معاملہ صاف تو ہے ---! بیوی کو اپنے شوہر پر اعتبار ہے اور یہی چیز اس کی زندگی کا سہارا ہے۔ جب وہ روشنی میں اپنے شوہر کی چارپائی خالی دیکھے گی تو اس کے دل کی کیا حالت ہوگی۔ اس کا اندازہ تم نہیں کرسکتیں۔ انسانوں کی دنیا میں یہ اکثر ہوتا رہتا ہے۔ ہونٹوں پر پیار اور محبت کی باتیں اور دل میں جھوٹ اور فریب کی گندگی"

یہ کہکر دیئے نے سکوت اختیار کرلیا۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد وہ پھر بولا "چپ چاپ کیوں بیٹھی ہو میری بہن! اس تاریک دنیا میں اڑ کر جاؤ۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں ایسا گھر ضرور نظر آئیگا جس میں میری روشنی کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی۔ یہ بھی کیا ستم ظریفی ہے۔ زندہ انسان روشنی کی ایک ایک کرن کو ترس رہے ہیں اور میں یہاں ایک قبر کے اوپر اپنی زندگی کا جوہر، اپنی روشنی قایم کرتا ہوں یہ دیکھ کر مجھے کتنا افسوس ہوتا ہے۔ کاش تم اس کا اندازہ لگا سکتیں"

دیئے کے الفاظ نے چڑیا کے دل پر خاص اثر کیا۔ اور وہ اسی لمحے گھونسلے سے نکل کر فضا میں اُڑنے لگی۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گئی تھی کہ اس کے کانوں سے پُرجوش الفاظ ایک گرم رو بن کر ٹکرائے وہ نیچے اتری اور کھڑکی میں سے اندر چلی گئی۔

چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اور اس اندھیرے میں ایک پرجوش آواز گونج رہی تھی۔ وہ آواز پہچان گئی۔ یہ ایک شاعر کی آواز تھی جو بیحد غریب تھا۔ چڑیا کو اس شاعر سے بڑی محبت تھی اور وہ اکثر اس کے سامنے کھڑکی کے اوپر بیٹھا کرتی تھی۔ شاعر کے انقلاب انگیز نغمے اکثر اس کے سینے میں نئی نئی امنگیں بھر دیا کرتے تھے اور وہ حیران ہوتی تھی کہ انسانوں پر اس کی نظموں کا اثر کیوں نہیں ہوتا۔ وہ بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ اس کی آواز سننے لگی۔ یہ ایک قومی ترانہ تھا جس کے لفظ لفظ میں آگ بھری ہوئی تھی۔ وہ سوچنے لگی،

www.taemeernews.com

اتنے بڑے شاعر کے گھر میں مٹی کا دیا بھی نہیں ہے جس کی روشنی میں وہ اپنی شاہکار نظم کو مکمل کر سکے۔ اس وقت آمد کا یہ عالم ہے گویا اس کے ذہن سے ایک سیلاب بہہ رہا ہے کاش اس کے پاس تھوڑی سی روشنی ہو اور وہ ان الفاظ کو محفوظ کر لے۔ اور یکایک اس نے ایک آواز بھی سنی کھرکھری سی آواز۔ وہ سمجھ گئی کہ شاعر اپنے ناخنوں سے دیوار پر لکھ رہا ہے مگر سارے الفاظ کیونکر محفوظ رہ سکیں گے اگر یہ موقعہ نکل گیا تو پھر یہ قومی ترانہ کبھی بھی مکمل نہ ہو سکے گا۔ کیا یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ اس انقلابی نظم سے ملک کے سرد دلوں کے اندر غیرت کے شعلے بھڑک اٹھیں اور وہ سب کے سب غلامی کے خلاف صف آرا ہو جائیں اس شاعر سے بڑھ کر دنیا میں اور کس کو روشنی کی زیادہ ضرورت ہے۔؟ وہ جلدی سے کھڑکی سے باہر نکلی اور اپنی پوری قوت پرواز کے ساتھ گھونسلے کی طرف اڑنے لگی۔۔۔!

دیئے نے بڑے غور اور ہمدردی سے سارا واقعہ سنا۔ چڑیا کے دل میں یہ یقین پیدا ہو گیا کہ اب دیئے کو روشنی نہ دینے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آئے گی اور نہ وہ کوئی معقول وجہ بتانے میں کامیاب ہو سکے گا۔ دیا کچھ دیر تک خاموش رہا۔ چپ چاپ نہ معلوم کس بات پر غور کرتا رہا۔ دھوئیں کی ایک باریک سی لکیر اس کی لو سے نکل نکل کر فضا میں تیرتی ہوئی آہستہ آہستہ غائب ہوتی رہی۔ کئی لمحے گزر گئے لیکن دیا خاموش رہا آخر اس کی لو تھرتھرا کر کہنے لگی "تم نے جو کچھ کہا ہے اس کا ایک لفظ بھی غلط نہیں ہے۔ شاعر کے گھر میں مٹی کا دیا سوکھ چکا ہے اور نظم کے الفاظ کو محفوظ کرنے کے لئے وہ انتہائی دقت کا سامنا کر رہا ہے۔ نظم مکمل ہونے کے بعد بھی مکمل نہیں ہو گی۔ اپنے ناخنوں سے دیوار پر جو کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا ہے روشنی میں اسے پڑھنا قریب قریب ناممکن ہو گا۔ مجھے یہ بات ماننے میں کوئی انکار نہیں ہے کہ اس شاہکار شعری تخلیق معتدبہ حصہ ضائع ہو جائے گا مگر یہ صرف تصویر کا ایک رخ ہے تصویر کے دوسرے رخ سے تم واقف نہیں ہو اگر تم اندھیرے میں میری طرح دور دور تک دیکھ سکتیں تو دیکھتیں کہ شاعر کے قریب ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر اس کی فاقہ زدہ لاغر و نحیف بیوی لیٹی پڑی ہے۔ دیر تک وہ اپنی مفلسی اور غربت پر چپکے چپکے آنسو بہاتی رہی ہے اور ابھی تک اس کے پچکے ہوئے گالوں پر آنسوؤں کی نمی موجود ہے۔ اگر گھر میں روشنی ہو اور شاعر کی نگاہیں اپنی بیوی کے رخساروں پر آنسوؤں کے قطروں کو دیکھ لیں تو معلوم ہے کیا ہو۔ اس کا سارا جوش سارا ولولہ، سارا درد و کرب، ٹھنڈا پڑ جائے۔ وہ ایک فقرہ بھی نہ لکھ سکے!"

یہ کہہ کر دیا خاموش ہو گیا۔ اس پر پھر ویسی کی ویسی متانت چھا گئی۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔

"چڑیا بہن! اب تم تھک چکی ہو۔ میرا خیال تھا تم ضرورت مند انسان کا کھوج نکالنے کے بعد آرام کرو گی مگر میں محسوس کر رہا ہوں اب تمہارے بازو جواب دے چکے ہیں۔ اور یہ ایک قدرتی بات ہے رات کی اس بھیانک دنیا میں تم نے کافی چکر لگائے ہیں۔ اچھا اب سو رہو۔ مجھے تو ساری رات جلنا ہے۔ افسوس صرف اس بات کا رہے گا کہ میری مختصر سی روشنی کسی ضرورت مند انسان کے کام آنے کی بجائے ساری ساری رات ایک قبر پر نچھاور ہوتی رہی کیا معلوم اب رات میری زندگی کی آخری رات نہیں ہے؟"

چڑیا کا سینہ جوش سے ایک بار پھر لبریز ہو گیا اور وہ چھاتی پھیلا کر کہنے لگی۔ تھکاوٹ۔؟ میں نہیں جانتی تھکاوٹ کسے کہتے ہیں میں پھر آؤں گی اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر ہی واپس آؤں گی خواہ اس مرتبہ مجھے گھنٹوں اڑنا پڑے۔ خواہ اڑتے اڑتے میری زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔!"

"میں تمہارے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ میری زندگی کا وہ لمحہ مسرور ترین لمحہ ہو گا جب مجھے معلوم ہو گا کہ میری روشنی ایک ضرورت مند کے کام آ رہی ہے۔" دیئے نے کہا اور ہوا کے ایک سرد جھونکے کا مقابلہ کرنے لگا۔

چڑیا اڑتی ہوئی بلندی کی طرف جانے لگی۔ ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر، پستی سے بلندی کی طرف اور پھر بلندی سے پستی کی طرف وہ اڑتی چلی جا رہی تھی، اڑتی ہی چلی جا رہی تھی۔ ہوا کے سرد سرد جسم خراش اس کے جسم کو چھیلتے، مکانوں کی اونچی اونچی دیواریں اس کی راہ روک لیتیں، اور تھکاوٹ سے اپنے آپ کو سنبھالنا بھی اس کے لئے مشکل ہو جاتا مگر وہ کہیں بھی ایک لمحے کے لئے بھی رکنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ ہمت ہارنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ اگر وہ ہمت ہار کر بیٹھ گئی تو پھر اڑنا ناممکن ہو جائے گا۔ وہ اندھیرے میں اڑ رہی تھی۔ اس امید کے ساتھ اڑ رہی تھی کہ ابھی ایک دردناک آواز

www.taemeernews.com

اس کے کانوں میں آئے گی۔ ابھی ایک دلدوز چیخ فضا میں گونج اٹھے گی۔ مگر فضا میں کوئی آواز کوئی صدا نہیں تھی۔ خاموشی کے ساتھ بادل آ جا رہے تھے خاموشی کے ساتھ ہوا چل رہی تھی اور تاریکی لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی جا رہی تھی اُسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ تاریکی کبھی بھی دور نہیں ہوگی۔ اس رات کے بعد کبھی بھی صبح نہیں ہوگی۔ دور ایک دیوار پر اس کا ہمسایہ نظر آ رہا تھا۔ اندھیاری دنیا میں بس یہی روشنی تھی دیئے کو دیکھ کر اس کے سینے میں ایک ہل چل مچ گئی۔ ایک نیا ولولہ اس کے دل کی گہرائیوں میں جاگ اٹھا۔ وہ یہ نہیں برداشت کر سکتی تھی کہ دیا اسے پست ہمت سمجھے یا اس کے خلوص کا مذاق اُڑائے۔ وہ مکانوں کے ساتھ ساتھ اُڑنے لگی ایک دیوار سے ٹکرا کر گر پڑی مگر پھر اُڑنے لگی یکایک ایک نہایت کمزور بوڑھی آواز اس کے کان میں آئی۔ بیٹا! آ گئے!"

یہ کس کی آواز تھی اور کدھر سے آئی تھی۔ یہ آواز اس کے کانوں کو آشنا معلوم ہو رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی یہ اس بڑھیا کی آواز تو نہیں ہے جس کے اکلوتے بیٹے کو جدا ہوئے سات سال کی لمبی مدت گزر چکی ہے اور جس نے اس عرصے میں ایک بار بھی اپنے بیٹے کی شکل نہیں دیکھی۔ یقیناً یہ وہی بدنصیب بڑھیا ہے اور اس کے ذہن میں خیالات کا ایک طوفان برپا ہو گیا پچھلے کئی واقعات یکے بعد دیگرے اس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگے۔ اس کا بیٹا اکثر ماں سے کہا کرتا تھا" ماں! اس وقت وطن کو غلامی سے آزاد کرانا ملک کے ہر نوجوان کا فرض ہے۔ اگر مجھے جیل جانا پڑے تو افسوس نہ کرنا" یہ الفاظ سن کر ماں کے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر چہرے کی جھریوں میں غائب ہو جاتے۔ وہ جانتی تھی بیٹے کو اس اقدام سے روکنا ناممکن ہے۔ اور وہ روکنا چاہتی بھی نہیں تھی ایک دن بیٹے نے آ کر کہا" ماں! شاید میں آج جیل چلا جاؤں۔ ایک بہادر سپاہی کی ماں کی طرح مجھے رخصت کرو" اور چڑیا نے دیکھا کہ بڑھیا کی آنکھیں آنسوؤں سے پرنم ہو گئیں۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے اس نے ہتھیلی سے آنسو پونچھتے ہوئے صرف اتنا کہا" جاؤ بیٹا! میں تجھے روک نہیں سکتی ــــ! میں تیرا انتظار کروں گی!" اور بیٹا اسی دن حکومت کے خلاف ایک بہت بڑی تحریک میں حصہ لینے کی وجہ سے گرفتار ہو کر سات سال کے لئے جیل بھیج دیا گیا۔ ماں نے بڑے صبر کے ساتھ یہ فیصلہ سنا اور اسی دن اس کی غیرت نے فیصلہ کر لیا کہ وہ محنت کر کے زندہ رہے گی اور کسی کی محتاج نہیں ہوگی۔ لیڈروں نے اس کے لئے چندہ جمع کیا مگر اس نے چندے کو ٹھکرا دیا۔ اس کی غیرت کسی کا احسان اٹھانے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھی۔ چڑیا کو اس بوڑھیا سے کتنی ہمدردی تھی یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ وہ ہر روز دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہتی تھی۔ بوڑھیا کو دنیا میں صرف دو کام تھے۔ محلے کے بچوں کو پڑھانا اور کپڑے سینا۔ اسی طرح سات سال گزر گئے تھے اور آج اس کے بیٹے کو آ جانا چاہئے تھا مگر وہ سارا دن نہیں آیا تھا۔

چڑیا پھدکتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ اب وہ بوڑھیا کی چارپائی پر پہنچ چکی تھی۔ اس کی چونچ بڑھیا کے سرد جسم کو چھو رہی تھی۔ چڑیا نے محسوس کیا کہ بڑھیا پر سکرات موت کا عالم طاری ہے۔ اس کی سانس گھٹ رہی ہے اور وہ صرف چند لمحوں کی مہمان ہے۔

چڑیا کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ بڑھیا اس انتظار میں اپنے بیٹے کی فرقت میں تڑپ تڑپ کر جان دے گی۔ آخری وقت میں بھی اس کا بیٹا نہیں آئے گا۔ وہ بیٹے کی شکل نہیں دیکھ سکے گی اپنی آخری حسرت کو سینے ہی میں لئے ہوئے دنیا سے چلی جائے گی۔

"بیٹا! آ گئے تم ـــ" ماں کی کمزور اور نحیف آواز آئی۔

چڑیا نے سوچا۔ پرجوش نوجوان نے جیل سے نکلتے ہی ضرور کوئی ایسا اقدام کیا ہے کہ حکومت نے پھر اسے جیل میں بھجوا دیا ہے اس کے نہ آنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہے۔

ماں آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی" بیٹا! آ گئے ـ بیٹا!" اور یکایک سبز جھیوں سے آواز آئی" ماں"! یہ اس کے بیٹے کی آواز تھی ایک لمحہ ضائع کئے بغیر چڑیا اپنے گھونسلے کی طرف اڑنے لگی ـــ دیئے نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ اب کے ناکام ہو گی تو مجھے سخت افسوس ہوگا۔ اتنا عرصہ کہاں رہیں تم۔ میں دیکھ نہیں سکا۔

چڑیا نے جلدی جلدی سارا واقعہ سنا دیا۔ دیئے کی آواز سے تھرتھرائی" شکر ہے میری آرزو پوری ہو گئی۔ لے جاؤ میری بتی کو۔ جلدی کرو ابھی میں نے سپاہیوں کو ادھر سے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ اس محب وطن کی تلاش میں جا رہے ہیں! مگر دیکھو تو تم نے سارا تیل اپنے اوپر گرا لیا ہے۔ اب انتہائی احتیاط کرنا۔ کہیں تمہیں آگ نہ لگ جائے۔ چڑیا کو کچھ بھی معلوم نہ ہوا وہ کیا کر رہی۔ کیا کرنا چاہتی تھی

www.taemeernews.com

اب بوڑھیا اور اس کا بیٹا اس کے سامنے تھے۔ بوڑھیا نے بیٹے کو دیکھتے ہی اپنے بازو اس کی گردن کے گرد حمایل کر دیئے — اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور پھر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اس وقت چڑیا کو کتنی خوشی ہوئی اس کا دل ہی جانتا تھا — !

صبح کے وقت بڑھیا کی لاش لے جانے کے بعد جب کمرے کو صاف کیا گیا تو کسی نے بھی یہ نہ سوچا کہ چارپائی کے اوپر مٹھی بھر خاکستر کہاں سے آئی ہے۔

روحِ انقلاب

احسان دانش

منزل کی دُھن مجھے، وہ تلاشِ خضر میں ہے
یہ ذوق مجھ میں اور مرے ہم سفر میں ہے
اب نطق بن گئی مری خاموشیٔ گناہ
جو دل میں دفن تھا وہ فسانہ نظر میں ہے
میرا سفر جنوں کی حدوں تک ہوا تمام
اب میرے واسطے مری منزل سفر میں ہے
کچھ ظلمتوں کی حد بھی ہے، اے روحِ انقلاب
مخلوق انتظارِ طلوعِ سحر میں ہے
"خیر" اس کے بس کی چیز نہ "شر" اسکے بس کی بات
انساں غریب کشمکشِ خیر و شر میں ہے
انجام کی ہو فکر تو رسوائیٔ حیات
تقدیرِ شب میں ہے نہ نصیبِ سحر میں ہے
فردوس، بندگی کی جزا میں نہ دے ہمیں
فردوس میں جو ہے وہ ہماری نظر میں ہے

پاؤں میں پھول

خواجہ احمد عباس

میرے دوست رام کشن کا شمار ہندوستان کے اچھے فلم ڈائریکٹروں میں ہوتا ہے۔ دس برس سے فلمی دنیا میں ہے۔ بہت اپنے کام میں ہوشیار ہے۔ درجنوں چوٹی کے اداکار اس کے فلموں میں کام کر چکے ہیں، سب سٹوڈیو والے اس کی عزت کرتے ہیں مگر اس میں بس ایک کمزوری ہے۔ وہ یہ کہ کوئی فیصلہ خود نہیں کر سکتا جب تک آدھی درجن دوستوں یا جاننے والوں سے مشورہ نہ کرے۔ بدقسمتی سے میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ ہر چوتھے پانچویں ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے اور رام کشن صاحب کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے۔

"ارے بھائی میں ہوں رام کشن"

"ہاں۔ ہاں وہ تو میں سمجھ ہی گیا۔ کہو کیا کام ہے؟"

"شام کو فرصت ہو تو ذرا ادھر سے ہوتے جانا۔ ایک نئی کہانی آئی ہے۔ چاہتا ہوں تم بھی ذرا سن لیتے۔"

اگر نئی کہانی نہیں تو کسی نئی گانے والی کی آواز کا ٹسٹ ہے، یا سٹوڈیو میں کوئی نیا سیٹ لگا ہے یا فلم کے لئے کسی ناچ کا ریہرسل ہے یا تاریخی فلم کے لئے ہیروئن کے کپڑے اور زیور تیار ہو کر آئے ہیں۔ اور ڈائریکٹر رام کشن ان کے بارے میں فیصلہ نہیں کر سکتے جب تک زید بکر عمر گوپال، ولسن اور موہن کی رائے معلوم ہو جائے۔

ہاں تو کوئی سال بھر کا ذکر ہے کہ ایک دن میں دفتر میں "آخری صفحہ" لکھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور ایک جانی بوجھی آواز سنائی دی۔

"ارے بھائی میں ہوں رام کشن۔"

"بولو کیا بات ہے؟"

"شام کو فرصت ہو تو ذرا ادھر ہو جانا ایک معاملے میں مشورہ کرنا ہے۔"

"آخر کس معاملے میں؟"

"یہ جب آؤ گے تب بتاؤں گا۔ رات کا کھانا میرے ساتھ ہی کھانا" اور ٹیلیفون کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔

خیر صاحب شام کو رام کرشن کے فلیٹ پر پہنچے۔ دیکھا کہ داؤد بریلی، وسنت داوڑکر اور شکور پہلے سے موجود ہیں اور چائے اڑا رہے ہیں۔ میں نے کہا کیوں بھائی لوگو آج کونسی نئی آفت آئی ہے کہ رام نے ہم سب کو بلایا ہے۔

شکور نے جواب دیا "یہ رام ہی سے پوچھنا۔ وہ ابھی کپڑے پہن کر آتا ہے۔" اور میں نے شکور کے پتلی دھاری والے نیلے سوٹ کو دیکھا تو سمجھ گیا کہ کام جو کچھ بھی ہو اس میں کسی لڑکی کا دخل ضرور ہوگا۔

رام آیا تو سفید کلاپ لگے ہوئے چکن کے کرتے، سفید ڈھیلے پاجامے اور سفید چپلوں میں ملبوس۔ بال کنگھا کئے ہوئے۔ میں نے کہا "خیریت تو ہے؟ آج کس کے قتل کا سامان ہے؟"

تب یہ بھید کھلا کہ رام کو اپنے نئے فلم "معصوم قاتل" کے لئے ایک ڈانسر یعنی ایک رقاصہ یعنی ایک ناچنے والی کی تلاش تھی۔ اور چونکہ جتنی مشہور و معروف ناچنے والیاں فلموں میں کام کرتی ہیں وہ سب دوسرے سٹوڈیوز میں کام کر رہی تھیں یا روپیہ زیادہ مانگتی تھیں یا عمر سے باہر ہو گئی ہوئی تھیں یا بہت موٹی ہو گئی تھیں یا بہت دبلی ہو گئی تھیں۔ غرض مطلب یہ کہ ایک نئی ناچنے والی کی تلاش تھی اور اس غرض سے یہ قافلہ روانہ ہونے والا تھا! ......

کم سے کم فلموں میں آپ نے ان نڈر اور جیوٹ شکاریوں کو دیکھا ہوگا جو افریقہ کے جنگلوں میں شیر کے شکار کو جاتے ہیں۔ کس طرح کیل کانٹے سے درست ہو کر نکلتے ہیں! ایک کاندھے پر بندوق دوسرے پر رائفل۔ پیٹی میں چھرا۔ گلے میں دوربین لٹکی ہوئی۔ سر پر خوفناک قسم کا ٹوپ۔ پاؤں میں موٹے تلے کے اونچے اونچے بوٹ بس کچھ اسی طرح سے فلم والے "نئے چہروں" کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ یونیفارم ذرا مختلف ہوتی ہے۔ تلوار بندوق کے بجائے جیبوں میں بادکریا شیفر کے فاؤنٹین پن رکھے جاتے ہیں تاکہ شکار پھنستے ہی اس سے کنٹراکٹ پہ

دستخط کرا لئے جائیں. کارتوسوں کے بجائے سگریٹوں کے ڈبے ہوتے ہیں۔ بٹوے میں دو تین سو روپے والے نوٹ اور دس بارہ دس روپے والے نوٹ ہوتے ہیں۔ آنکھوں میں جستجو اور دلوں میں کسی اچھے "شکار" پھنسنے کی امید ہوتی ہے۔

جنگل میں کسی شیر کے شکار کو جائیے یا فوراس روڈ پہ ایسے چہرے کی تلاش میں ایک "گائیڈ" کی ضرورت لازمی ہے۔ "گائیڈ" یعنی راہبر۔ یعنی وہ معتبر انسان جو جنگل کے ہر راستے اور پگڈنڈی سے باخبر ہو اور جو دور سے شکار کی بو سونگھ سکے اور جو جنگل کے ہر جانور کی عادات و خصلات کمزوریوں اور چالاکیوں سے اچھی طرح سے واقف ہو۔ رام کشن کی موٹر فوراس روڈ کے جنگل (یا کہنا چاہئے جنگلوں) میں داخل ہوئی تھی کہ نہ جانے کہاں سے ویسا ہی ایک انسان چلتی موٹر کے پائیدان پر اچک پڑا۔ اس کی ہیئت کذائی پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ اس کا پیشہ کیا ہے۔

"کیوں صاحب لڑکیاں دیکھنی ہیں؟ بالکل تحفہ مال ہے"

اور یہ کہہ کر اس انداز سے آنکھ ماری کہ مارے جھینپ کے رام کے ہاتھوں سے سٹیرنگ ڈھیل ہی ڈھیل گیا اور روشنی کے کھمبے سے ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ رام نے خیریت اسی میں سمجھی کہ موٹر روک کر بات کی جائے۔

"دیکھو میاں ہمیں ایک ناچنے والی چاہئے۔ فلم کے لئے۔ سمجھے! اچھی شکل ہو اور ناچتی بھی اچھا ہو"

"تو چلئے میرے ساتھ۔ عین آپ کے مطلب کی لڑکی آج ہی آئی ہے۔ ناچ میں سادھنا بوس اور آزوری کو مات کرتی ہے ....."

"مگر شکل صورت کیسی ہے؟" شنکور نے جلدی سے پوچھا۔

"حور کا بچہ ہے صاحب۔ بس نسیم اور دینا کا مجموعہ سمجھ لیجئے"

ایک بدبودار زینے کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے کوٹھے پر پہنچے تو دیکھا کہ جس کو ہمارے "گائیڈ" صاحب حور کا بچہ اور نسیم اور دینا کا مجموعہ بتا رہے تھے وہ پیلے پیلے شیر کی رنگت کی کم از کم تیس سالہ طوائف تھی جو فلمی ناچوں کی بھدی نقل اتارتی تھی۔ نام اب بھول گیا ہوں۔ شاید پریم بالا تھا یا پریم بالا تھا۔ مگر یہ کہانی اس پریم لتا یا پریم بالا یا جو کچھ بھی اس کا نام تھا کے متعلق نہیں ہے۔ نہ ان چھ موٹی دبلی، کالی، سانولی، چیچک منہ، داغ، پستہ قد، بلند قامت ناچنے والیوں کے متعلق جن کے ہاں یکے بعد دیگرے ہمارا "گائیڈ" ہمیں لے گیا۔ نہ آپ کو اس سے کچھ دلچسپی ہو سکتی ہے کہ ایک کوٹھے پر جو پہنچے تو میں نے دیکھا کہ طبلچی پانی پت کا ایک ڈوم ہے اور اس سے کہ یہ وہاں جا کر سب سے کہے گا کہ میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر اسٹیج پر بھاگا۔ اور اس سے بھی کیا غرض کہ پان کی مختلف تھالیوں میں رام کشن کو تقریباً بیس پچیس روپے ڈالنے پڑے اور میں دل میں سوچتا رہا کہ سٹوڈیو کا خزانچی اس رقم کو کس مد میں لکھے گا۔

قصہ مختصر یہ ہے کہ بارہ بجے ہم نے "گائیڈ" صاحب سے صاف صاف کہہ دیا کہ اب ہم کسی "حور کے بچے" کو دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور نہ ہمیں کسی "نادھوری اور سلوچنا کے مجموعے" میں دلچسپی ہے۔ مگر وہ بھی عجب ڈھیٹ انسان تھا۔ کہنے لگا "اچھا اب میری خاطر ایک جگہ اور چلئے یہ بھی آپ کو نا پسند ہو تو جو چور کا حال سو میرا حال۔ مگر کانگریس ہاؤس جانا پڑے گا"

"کانگریس ہاؤس؟" ہم سب نے ششدر ہو کر کہا۔ "یا الٰہی العجائب کیا جب سے پولیس نے کانگریس ہاؤس پر قبضہ کیا ہے وہاں یہ سرگرمیاں ہوتی ہیں؟"

"گائیڈ" نے ہماری حیرانی دور کرنے کے لئے کہا "میرا مطلب ہے کانگریس ہاؤس کے پاس سینڈی برج کے نیچے"

دسنت داد رکو بھوک لگ رہی تھی۔ اس کی رائے تھی کہ اب زیادہ تلاش بیکار ہے۔ میں بھی کچھ اسی خیال کا تھا۔ مگر رام کشن کا سیٹ لگا ہوا تھا۔ اور ناچنے والی نہ ملنے کی وجہ سے فلم مکمل ہونے میں دیر ہوئے جا رہی تھی۔ رہے شنکور اور داد رتو وہ رات بھر چکر لگانے کو تیار تھے ..... یا جب تک رام کشن کی جیب میں پان کی تھالیوں میں روپے ڈالنے کو موجود تھے!۔

"چلو یہ بھی سہی۔ مگر اس کے بعد سیدھے گھر واپس" میں نے کہا اور ہماری موٹر لیمنگٹن روڈ ہوتی ہوئی کانگریس ہاؤس کے سامنے سے گذر کر ایک اندھیری گلی میں رک گئی۔

اونچی پانچ منزلہ عمارت تھی۔ نئی نئی ہوئی کھلی ہوئی کھڑکیوں میں سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ گھنگرو بھی چھنک رہے تھے۔ دو چار فوجی بیتابانہ ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔ ایک ہوٹل کا "باہر والا" پکا ہوا سوڈے کی بوتلیں لئے اوپر جا رہا تھا۔ کسی کمرے میں کوئی عورت بے تحاشہ قہقہہ مار کر ہنسے جا رہی تھی۔ جیسے ہنسی کا دورہ پڑ رہا ہو۔ اس قہقہہ کی آواز کو چیرتی ہوئی کسی اور عورت کی چیخ سنائی دی۔ مگر فوراً ہی بجلی کی ریل کی خوفناک گڑگڑاہٹ قہقہہ اور چیخ دونوں پر چھا گئی۔ جب ریل گذر گئی تو گھنگرو بدستور چھنک رہے تھے۔ طبلہ بدستور کھڑک رہا تھا، اور کوئی بے سری آواز گا رہی تھی "ہماری گلی آنا"

www.taemeernews.com

اور اس عرصہ میں ہم سب سیڑھیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ طے کر چکے تھے۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کمرے میں فرش بچھا ہوا تھا۔ جو کبھی نہ کبھی ضرور سفید رہی ہوگی۔ دیوار کے سہارے گاؤ تکیے لگے تھے۔ ایک بوڑھے ملازم نے "آئیے آئیے" کہہ کر ہمارا استقبال کیا اور ہم جوتے اتار کر بیٹھ گئے۔ مگر کمرہ خالی تھا۔ ایک کونے میں ہارمونیم کی پیٹی پڑی تھی اور دوسرے میں طبلوں کی جوڑی۔ ایک میلے سے پردے کے پیچھے دوسرے کمرے میں جانے کا دروازہ تھا۔ ہمارا "گائیڈ" بے تکلفی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا اور تھوڑی دیر میں وہاں سے پان کھاتا ہوا آیا۔

"باہر گئی ہوئی ہے مگر ابھی آتی ہے۔ بس پانچ منٹ انتظار کرنا پڑے گا۔"

بوڑھا ملازم جس کی داڑھی مہندی سے رنگی ہوئی تھی، اور جس کی آنکھوں میں کچھ عجیب افسردگی تھی پانوں کی تھالی لے کر آیا۔۔۔ ہمارے سامنے رکھ دی۔ اور پھر چپ چاپ چلا گیا۔

شکور نے کہا "یار کچھ عجیب ماحول ہے یہاں تو۔"

میں نے کہا "ہاں جیسے اس میلے پردے کے پیچھے کوئی پراسرار راز ہو۔"

داؤد نے کہا "یا کوئی ٹریجڈی ہو۔"

رام کشن نے کہا "تم سب پاگل ہو۔"

شکور نے کہا "اس بوڑھے ملازم کو دیکھو اس کی آنکھیں ...."

"دکھنے آئی ہیں" رام کشن نے فقرہ پورا کیا۔

وسنت نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "ساڑھے بارہ بجنے کو آئے۔ اب چلنا چاہئے۔ آخر کب تک انتظار کریں گے؟"

میں بھی اس کی تائید کرنے ہی والا تھا کہ پردے کے پیچھے سے ایک شخص برآمد ہوا۔ اور اس کے آتے ہی کمرے کی ساکت فضا میں ہلچل مچ گئی۔ اس شخص کا حلیہ تو معمولی تھا۔ درمیانہ قد گہرا سانولا رنگ چھوٹی چھوٹی گرچیلی آنکھیں۔ داڑھی منڈی ہوئی۔ موٹی موٹی فوجی قسم کی مونچھیں۔ مگر اس کی گفتگو کا طریقہ کچھ عجیب تھا۔ جیسے مشین گن چل رہی ہو اس طرح الفاظ کی گولیاں اس کے منہ سے چھوٹتی تھیں۔ میں نے چرب زبان دکاندار بھی دیکھے ہیں اور فلم کے چلتی والوں سے بھی میرا سابقہ پڑا ہے۔ مگر ان حضرت کے سامنے وہ سب ہیچ تھے۔

"آداب عرض۔ آداب عرض۔ نمستے۔ بندگی۔ تشریف رکھئے۔ فرمائیے کیا خاطر کی جائے؟ وسکی برانڈی۔ جو کہئے حاضر ہے۔ یا بیر کا شوق ہو تو وہ منگوائی جائے۔ آپ نہیں پینے کے؟ خیر تو کچھ ٹھنڈا کچھ گرم۔ ارے او میتا ....." اور جب افسردہ آنکھوں والا بڈھا آیا تو اس سے "ذرا پانچ لیمن تو لے آ۔ برف ڈلوا کر" اور پھر ہم سے مخاطب ہو کر "آپ چندرا کا ناچ دیکھنے آئے ہیں نا؟ معاف کیجئے گا انتظار کرنا پڑا۔ بات یہ ہے کہ ابھی ابھی پولیس کلب میں ڈانس کر کے آ رہی ہے۔ بڑی تالیاں بجیں۔ خود پولیس کمشنر صاحب نے اپنے ہاتھ سے ہار پہنایا۔ پورے تین گھنٹے ڈانس کرتی رہی۔ اب بھی بڑی مشکل سے چھٹکارا پاکر آ رہے ہیں ورنہ وہ لوگ کب آنے دیتے تھے۔ پچھلے ہفتہ ریڈیو کلب میں ڈانس کیا تھا وہاں کوئی ہالی وڈ کا ڈائرکٹر آیا ہوا تھا کہنے لگا میڈم چندرا ہم تم کو ہالی وڈ لے جانا چاہتے ہیں وہ تو آج کل جنگ کی وجہ سے جہازوں کا آنا جانا رکا ہوا ہے ورنہ سب معاملہ طے ہو چکا تھا۔ یہ سب تو اخباروں میں بھی آ چکا ہے آپ نے تو پڑھا ہوگا؟"

یہ سوال مجھ سے کیا گیا تھا۔ شاید اس نے بھانپ لیا تھا کہ میں اخبار نویس ہوں۔ اس لئے جھوٹ مجھے بھی بولنا پڑا "جی ہاں یہ خبر تو سارے اخباروں میں آ چکی ہے۔"

اتنے میں ایک عدد سیٹھ صاحب جو نشہ میں چور تھے اور دو عدد ان کے ساتھی داخل ہوئے۔ "چندرا ادھر رہتا ہے؟" سیٹھ صاحب نے فرش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔ "ہم چندرا کا ڈانس دیکھنا مانگتا ہے۔"

مشین گن پھر چل پڑی۔ "آئیے۔ آئیے سیٹھ صاحب نمستے بندگی۔ ادھر تکئے سے لگ کر بیٹھئے چندرا کی تو قسمت جاگ اٹھی ہے کہ آج آپ تشریف لائے ہیں۔ ابھی حاضر ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ گورنمنٹ ہاؤس میں ڈانس تھا۔ وہاں سے ابھی ابھی چلی آ رہی ہے سرکاری معاملہ انکار بھی تو نہیں کر سکتے۔ مگر سچ بات یہ ہے کہ یہ انگریز لوگ آرٹ کی قدردانی بھی خوب کرتے ہیں۔ خود گورنر صاحب نے اپنے ہاتھ سے ہار پہنایا۔ جی ہاں اپنے ہاتھ سے ...." وغیرہ وغیرہ

مشین گن چلتی رہی اور ہم سب حیرت سے اس کا منہ تکتے رہے داؤد نے میرے کان میں کہا "اس بار کوئی آیا تو معاملہ بادشاہ سلامت تک پہنچ جائے گا۔"

"آ گئی آ گئی" میلے پردہ کو ایک جنبش ہوئی اور چندرا داخل ہوئی پیچھے پیچھے لمبی قلموں باریک مونچھوں والا ایک لمبا تڑنگا جوان

www.taemeernews.com

سفید قمیص اور پتلون میں۔

چندرا! اگر آپ اس اختصار پر مصر ہیں کہ میں اس کا بیان کس انداز سے کروں کہ" پردہ کو جنبش ہوئی اور کمرے میں ایک بجلی سی کوندگئی ایک شعلہ جوالہ رقص کرتا ہوا آکھڑا ہوا۔ چندرا ایک عورت نہیں تھی وہ حسن و جوانی کا پیکر تھی۔ کلوپیٹرا کا بے پناہ حسن، نورجہاں کی نزاکت سیتا کی معصومیت اس میں کیا کچھ نہ تھا" تو آپ کو مایوس ہونا پڑے گا چندرا کو کسی طرح سے حسن کا پیکر نہ کہا جا سکتا تھا۔ باوجود پاؤڈر کے سانولی رنگت، کھڑا نقشہ، بھاری ناک۔ نزاکت کے بجائے اس کی ساخت میں ایک قسم کی کرختگی تھی۔ اور معصومیت کے بجائے ایک خاص قسم کا بیباکا پن جو اس طبقے میں پایا جاتا ہے۔ پھر بھی وہ تھی جوان، شباب کا خمیر اس کے بدن میں ضرور تھا۔ عمر زیادہ سے زیادہ بیس برس کی ہوگی مگر وہ اس پودے کے مانند تھی جس کو پوری نشوونما سے پہلے ہی زمین میں سے اکھاڑ کر ایک گملے میں لگا کر بند کمرے میں رکھ دیا گیا ہو۔ اس میں جوانی کا رنگ تھا۔ جوانی کی بو باس تھی مگر جوانی کی تازگی اور شگفتگی نہیں تھی۔

چندرا سب کو سلام کر کے ایک بناوٹی حیا کے ساتھ فرش پر بیٹھ گئی۔ اب سیٹھ صاحب کو ہوش آیا۔ کچھ دیر اپنی آنکھیں اس پر گاڑنے کے بعد بولے "تم چندرا ہو نا؟ تم چندرا نا ہیں؟"

چندرا بناوٹی شرم کو فنی اسحال بالائے طاق رکھ کر بناوٹی ہنسی ہنس پڑی مشین گن کو پھر موقع مل گیا۔

"آپ بھی بڑے پر مذاق آدمی ہیں سیٹھ صاحب۔ مگر اگر لوگ اسے نہیں پہچانتے۔ تعجب کرتے ہیں کہ سولہ برس کی عمر میں ناچ میں اتنا کمال کوئی کیسے حاصل کر سکتا ہے؟ آج ہی پولیس کمشنر صاحب ——— میرا مطلب ہے گورنر صاحب کے سامنے تھالی کے کنارے پر ڈانس کر کے آئی ہے دنگ رہ گئے سب"

"تھالی کے کنارے پر؟ کمال! کمال!" سیٹھ صاحب چہکے۔

"جی صاحب تھالی کے کنارے پر کیا تلوار کی دھار پر ڈانس کرا لو نگا اس سے" اور پھر چلا کر "سیتا او سیتا۔ ذرا وہ تلوار تو لے آنا۔"

سیتا جب تلوار لے کر آیا تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں افسردگی ہی نہیں بلکہ پریشانی بھی تھی۔ پریشانی سے بھی زیادہ۔ جیسے کوئی بکرا قصائی کے لئے خود چھری لئے چلا آ رہا ہو۔ تلوار میان سے نکالی گئی تو اس کی چمکیلی دھار دیکھ کر سب دم بخود رہ گئے۔ کیا یہ لڑکی سچ مچ اس پل صراط پر قدم دھر سکیگی۔؟

"دیکھا آپ نے۔ ایک دن چندرا اسی تلوار کی دھار پر۔۔۔ آپ کو ڈانس دکھائے گی" اور پھر میان میں واپس رکھتے ہوئے "مگر آج نہیں۔ اس کے لئے تو ایک بڑا جلسہ کرنا پڑے گا۔ ڈانس کے بڑے بڑے ماہر استاد آئیں گے۔ کیا عجب ہے خود گورنر صاحب بہادر ——— میرا مطلب ہے پولیس کمشنر صاحب بھی قدم رنجہ فرمائیں" اور پھر سیتا سے "لو یہ اندر رکھ آؤ" نہ جانے کیوں میری نظر پھر بوڑھے ملازم کے چہرے پر پڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں افسردگی بدستور تھی۔ مگر ہلکی سی جھلک اطمینان کی بھی۔ جیسے قصائی نے بکرے کو ذبح کرنا ملتوی کر دیا ہو۔ اور بکرے کی آنکھوں میں پھر زندگی کی امید آ گئی ہو۔ یا شاید یہ سب میرے دماغ کی خیال آرائی تھی؟

سب کی فرمائش پر چندرا نے ناچنا شروع کیا۔ یہ تو فوراً معلوم ہو گیا کہ اس بیچاری نے اس فن کی کوئی تعلیم نہ پائی تھی۔ نہ اس کے رقص میں آرٹ تھا نہ ٹکنیک۔ نہ کوئی مدا درست تھا نہ پاؤں کے توڑے۔ گھنگروؤں کی جھنکار اکثر بے سری ہو جاتی تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ تھی پیدائشی رقاصہ۔ اس کے بدن میں ایک عجیب دلفریب لچک تھی۔ اور وہ ہر جذبے کو اپنی آنکھوں سے ظاہر کر سکتی تھی۔ اس کے قدموں کی ٹھوکروں میں ایک والہانہ پن تھا۔ ایک قدرتی آہنگ۔ اس کی آواز سریلی نہ تھی مگر بری بھی نہ تھی اور فلمی گیتوں کی نقل کرنے میں وہ کمال رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی اداؤں میں ایک عامیانہ بے تکلفی ایک بازاری پن تھا جو اکثر فلمی ناچوں کی مقبولیت کا راز ہوتا ہے۔ رام کشن کو اپنے فلم کے لئے ایسی ہی ناچنے والی کی ضرورت تھی۔

"کیوں کیا خیال ہے؟" رام نے داؤد پرملی سے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"چلے گی"

"تم کیا کہتے ہو؟" خطاب مجھ سے تھا۔ میں ان معاملات میں داؤد کو استاد مانتا ہوں اس لئے میں نے بھی ہاں میں ہاں ملا دی۔

چندرا گا رہی تھی "چھلی نیلی رنگا دو ستیاں" نہ جانے اس کو

www.taemeernews.com

کیسے معلوم ہوگیا کہ ہمارے گروہ کا سردار رام کشن ہے۔ بار بار اس کے پاس جا کر گاتی تھی۔ آنکھ مارتی تھی۔ انداز دکھاتی تھی۔ اور سیٹھ صاحب تھے کہ دیکھ دیکھ کر جل رہے تھے۔ ایک دفعہ اس نے رام کے پاس آ کر جب "چولی نیلی رنگا دو سیاں" کہا تو رام سے نہ رہا گیا اور اس نے کہا "تم آؤ تو میری جان۔ چولی بھی رنگا دیں گے۔ لہنگا بھی" جس پر بڑا قہقہہ پڑا مگر سیٹھ صاحب نہیں ہنسے۔

ناچ ختم کر کے چندرا نے پان تقسیم کئے اور تھالی میں بہت سے روپے جمع ہو گئے۔ سیٹھ صاحب کے پاس گئی تو انہوں نے فرمایا "اپنے ہاتھ سے کھلاؤ" چندرا نے ناز سے گلوری اٹھائی اور سیٹھ صاحب کے منہ میں رکھ دی جس پر تھالی میں دس روپے کا اضافہ ہو گیا۔ مگر سیٹھ صاحب اتنے التفات پر اکتفا کرنے والے نہ تھے۔ ہاتھ پکڑ کر چندرا کو بٹھا لیا اور نشے سے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولے "یہاں بیٹھو میری جان۔ ابھی جوان جوانوں کے پاس جاتی ہو۔ ہمارے پاس آتے گھبراتی ہو۔ ایک دن تم بھی بوڑھی ہو جاؤ گی چندرا" اور ایک خوفناک قہقہہ لگا کر "چندرا! نائیں۔ تم چندرا نائیں"

میں گھبرایا کہ اب کوئی جھگڑا کھڑا ہوا۔ اور اگر کسی چیز سے میں دور رہنا چاہتا ہوں تو وہ شرابیوں کی دھینگا مشتی ہے۔۔۔ مگر چندرا کا جواب سن کر میں دم بخود رہ گیا۔ اور مدہوش سیٹھ لاجواب وہ بولی "سیٹھ صاحب جو جوان ہے وہ بوڑھا ضرور ہوگا۔ جو بوڑھا ہے وہ ایک روز ضرور مر جائے گا۔ نہ موت کے ڈر سے بچہ حاصل نہ بڑھاپے کے خوف سے" اور پہلی بار میں نے اس کی آنکھ کی چمک میں ایک افسردہ گہرائی دیکھی! اور اس کی آواز میں ایک عجیب تلخی محسوس کی جو بازاری بات چیت کی نقلی مٹھاس سے کہیں بہتر تھی۔ سیٹھ صاحب نے نشہ میں کچھ سنا اور کچھ نہ سنا مگر ان کا تجربہ کار ہاتھ آپ سے آپ چندرا کی گداز برہنہ بانہوں پر پہنچ گیا۔ چندرا وہاں سے سرک کر دور بیٹھ گئی۔

"جھینپتی ہو؟" اور پھر سیٹھ صاحب نے ایک خوفناک قہقہہ مارا "میری جان جب اوکھلی میں سر دیا تو دھمکیوں سے کیا ڈر" پھر نہ جانے کیوں میری طرف پلٹ پڑے "کیوں مسٹر تم کیا کہتے ہو؟"

میرا جی نہ چاہتا تھا کہ کچھ جواب دوں کون شرابی کے منہ لگے! مگر وہ بندۂ خدا میرے پیچھے ہی پڑ گیا "بولو مسٹر کیا رائے ہے تمہاری"

"ٹھیک فرماتے ہیں سیٹھ صاحب آپ" میں نے اسے ٹالنے کے لئے تنگ آ کر الل ٹپ جواب دیا۔ اگر کوئی چلتی ہوئی مشین میں ہاتھ ڈالے گا تو ضرور کٹ جائے گا"

"جی ہاں" چندرا کی آواز سن کر میں چونکا "اور اگر پاؤں ڈالے گا تو پاؤں کٹ جائے گا" یہ کہہ کر اس نے بلا تکلف لہنگے کو ٹخنوں سے اوپر اٹھا لیا۔ جہاں گھونگرو چمڑے کے تسموں سے کسے ہوئے تھے وہاں زخم پڑ گئے تھے۔ مرہم کے پھائے لگے تھے اور ایک ٹخنے پر پٹی بھی بندھی تھی۔

سیٹھ صاحب اشارہ پا کر تہمد والے آدمی کے ساتھ دوسرے کمرے میں کوئی کاروباری گفتگو کرنے چلے گئے۔ اب ان تیلی مونچھوں والے نوجوان صاحب کو بات کرنے کا موقع ملا۔ نہایت بے تکلفی سے بولے "چندرا کچھ معلوم بھی ہے یہ صاحب کون ہیں؟ یہ ہمارے مشہور ڈائرکٹر رام کشن صاحب ہیں۔ جنہوں نے "نیا مجنوں" اور "کالی شلوار" جیسے فلم بنائے ہیں"

رام بیچارے کا سب بھانڈا پھوٹ گیا۔ حالانکہ اس نے "گائیڈ" سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ یہ ہرگز نہ ظاہر کیا جائے کہ ہم کسی فلم کمپنی کی طرف سے آئے ہیں۔ مگر اب تو مجبوری تھی اور سب کا بھی تعارف کرانا پڑا۔ جب میری باری آئی تو رام نے اپنا بدلہ مجھ پر اتارنے کے لئے خوب بڑھا چڑھا کر تعریف کی اور کہا "ان کے مضمون اور کہانیاں تو آپ نے اخباروں اور رسالوں میں ضرور پڑھی ہوں گی" اور چندرا نے صاف جھوٹ بولا "جی ہاں کیوں نہیں" اور پھر انداز سے منہ بنا کر "ہم پر بھی ایک کہانی لکھ دیجئے نا"

مگر تیلی مونچھوں والے صاحب گفتگو کا رخ اپنی جانب موڑنے پر تلے ہوئے تھے۔ رام صاحب خاکسار کو امرت لال کہتے ہیں۔ میں بھی آپ کی طرح یو۔ پی ہی کا رہنے والا ہوں اور جناب تو آپ ہی کی دعا سے ہم پیشہ بھی ہوں۔

"جی۔۔۔۔ آپ بھی۔۔۔؟"

"جی ہاں میں بھی اسی ڈائرکشن لائن میں ہوں۔ اپنے پہلے فلم کا سینریو لکھ رہا ہوں۔ کبھی فرصت ہو تو سنئے اور کوئی مشورہ دیجئے"

"کون سی کمپنی میں ہیں آپ؟"

"کام تو بہت سی کمپنیوں میں کیا ہے۔ پربھات ابھی ٹاکیز

پرکاش ابھی کچھ دنوں سے سوہن میں تھا۔ اب ایک نئی کمپنی کھلی ہے اس کے لائسنس کا انتظار ہے۔"

"کہئے کیا کاسٹ لے رہے ہیں؟ ذرا ہم غریبوں کا بھی خیال رہے۔" داور کو ٹھاکر صاحب کی ٹانگ کھینچنے کا موقع ملا تو وہ کب چوکنے والا تھا۔

"کاسٹ میں مس چندرا تو ہوں گی ہی۔ ویسے میل لیڈ کے لئے سوچ رہا ہوں۔ موتی لال کو لوں یا پرتھوی راج کو۔ ابھی طے نہیں کیا۔"

"آپ خود کیوں نہیں ہیرو کا پارٹ کر لیتے" یہ شکور کم بولتا ہے مگر جب زبان کھولتا ہے تو نشانہ خطا نہیں جاتا۔

ممکن ہے بات آگے بڑھتی مگر اسی وقت سیٹھ صاحب تہمد والے صاحب کے ساتھ باہر آ گئے۔

"بیٹی سیٹھ صاحب کو نمسکار کرو۔ وہ جا رہے ہیں۔"

"اچھا چندرا ہم جائیں گا۔ کل رات کو آئیں گا بھولنا مت۔"

یہ کہہ کر سیٹھ صاحب نے نہایت اطمینان سے چندرا کے گالوں کو کھینچا اور اپنے ساتھیوں کے سہارے لڑکھڑاتے ہوئے چل دیئے۔

"سیتا آبا!" چندرا نے آواز دی "ذرا ایک گلاس پانی دینا۔"

سیتا آبا؟ اور آبا پر اس قدر پیار بھرا زور! افسردہ آنکھوں والا بوڑھا ملازم باہر گیا ہی تھا کہ مشین گن پھر چل پڑی۔

"بڑا پرانا ملازم ہے ہمارا۔ بچپن میں چندرا کو گود کھلایا ہے۔ اس لئے سیتا آبا ہی کہتی ہے۔" اور پھر موضوع بدلنے کے لئے۔ "کہئے ڈائرکٹر صاحب کیا حکم ہے؟"

رام کشن نے فوراً مطلب کی بات چھیڑ دی "اپنی بیٹی کے فلم میں کام کرنے کے بارے میں کیا رائے ہے آپ کی؟"

اجی کام کا تو اس کو بڑا شوق ہے۔ اور یوں ٹرائل کے طور پر سوہن پکچرز کی "ایرانی حور" میں سائیڈ ہیروئن کا کام بھی کر چکی ہے۔ مگر اب میں نے طے کر لیا ہے۔ کہ ہیروئن کا رول ہی ملے گا تب ہی بھیجوں گا۔"

"ہیروئن رول" رام کشن نے زور دیتے ہوئے الفاظ دہرائے۔

"جی ہاں" اور پھر کچھ گھبرا کر کہ ایسا نہ ہو کہ موقع ہاتھ سے نکل جائے "مگر یہ تو اوروں کے لئے ہے۔ آپ جیسے قابل ڈائرکٹر کے ہاں تو کوئی اچھا کام مل جائے کافی ہے۔"

"تو دیکھئے کوئی کام نکلا تو ہم پروڈکشن منیجر کو بھیج دوں گا۔"

رام کشن جانتا تھا کہ روپے پیسے کی بات چیت کرنا اس کے بس کا کام نہ تھا۔ "اچھا تو اب ہم چلتے ہیں۔"

وہ سین مجھے ہو بہو اب تک یاد ہے۔ ہم اٹھنے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ دروازے میں ایک نوجوان پھولوں کی ٹوکری لئے نظر آیا۔ بیس بائیس برس کی عمر ہوگی۔ خاصا خوش شکل بھی تھا۔ ٹوکری میں ہار گلدستے اور بالوں میں لگانے کے ہلال نما گجرے جو "بینی" کہلاتے ہیں۔ چندرا پاؤں پسارے آدھی بیٹھی اور آدھی لیٹی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے پھول والا نوجوان اس کو دیکھ کر مبہوت سا رہ گیا۔ پھر گا کر بولا "بابو پھول والا آیا۔ ہار اور گجرے اللے لایا ـــــ"

چندرا نے تنک کر کہا "کچھ نہیں چاہئے۔"

"ایک بینی ہی لے لیجئے۔ بالوں کے لئے۔"

"دیکھتا نہیں ہے پہلے ہی لگی ہے۔" اور چندرا نے اپنے جوڑے کو پیار سے تھپکی دی۔ جہاں پھولوں کا نیم دائرہ بالوں کے گرد لگا ہوا تھا۔

"تو پھر پاؤں ہی میں باندھ لیجئے۔" اور یہ کہہ کر چشم زدن میں اس نے ٹوکری زمین پر رکھی اور اس میں سے سب سے اچھی "بینی" چھانٹ کر چندرا کے ٹخنے پر پازیب کی طرح باندھ دی۔ روزانہ ناچنے کی مشق نے اس کے ٹخنوں کو بڑا سڈول اور خوشنما بنا دیا تھا۔ اس کے گرد پھولوں کے گجرے نے ایک عجیب مگر دل کش کیفیت پیدا کر دی۔ پھول والے کی یہ حرکت اس قدر بے ساختہ اور بھولی تھی کہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے اور وہ خود کھسیانا ہو کر چل دیا۔ چندرا چلاتی ہی رہی "پیسے تو لیجا!"

خیر ہم چلے آئے۔ "روز گائیڈ" صاحب کو پانچ روپے دیکر رخصت کر دیا گیا۔ واپسی پر راستے میں حسب معمول فقرے چلتے رہے۔

"بھئی اس لڑکی کے تین آبا نکلے" رام کشن نے کہا۔ "تہمد والے دلال آبا، سیتا آبا اور ڈائرکٹر آبا۔"

www.taemeernews.com

داؤد فوراً "مادری" زبان پر اتر آیا۔" اور تینوں کے تینوں "—

"اچھا یہ بتاؤ کہ یہ چندرا ہے کس کی بیٹی؟" میں نے سوال کیا۔

"طوائف کی بیٹی ہے۔ حضرت اپنی ماں کی بیٹی ہے" آپ پیش کرنے فوراً اپنا فلسفیانہ فیصلہ دیا۔

"میرے خیال میں ٹھاکر صاحب کے تعلقات ہے جو چندرا کی ماں کا ملازم رہا ہوگا اور اب بیٹی کے خیال سے پڑا ہوا ہے"

"تو دلال آبا سے کیا رشتہ داری ہے"؟ ہم لوگ گویا جاسوسی ناول میں قاتل کا سراغ لگا رہے تھے۔

"معلوم ہوتا ہے دلال آبا نے چندرا کی ماں سے شادی کرلی ہے تاکہ بیٹی کی آمدنی پر قانونی حق ہو جائے"

"اور ڈائرکٹر آبا"؟

یہ ایک فلم زدہ نوجوان معلوم ہوتا ہے۔ جو اس تاک میں ہے کہ چندرا کے سہارے ڈائرکشن مل جائے۔ جانتے نہیں ہو کتنے ہی گدھے ایک جاذب نظر لڑکی کے طفیل میں ڈائرکٹر بن جاتے ہیں دلال آبا ٹھاکر کو اس لئے شہ دے رہے ہیں کہ چندرا کو کسی فلم میں ہیروئن کا رول مل جائے۔ روپیہ چاہے سیٹھ کی جیب سے آئے چاہے کسی فلم سٹوڈیو کی تجوری میں سے۔ بہر حال دلال آبا کی جیب میں جانے والا ہے"۔

معاملہ بالکل صاف اور سیدھا تھا۔ چندرا شیرے کا ایک قطرہ تھی۔ جس پر بھن بھن کرتی ہوئی زہریلی مکھیاں منڈلا رہی تھیں۔ چندرا کا جسم روپے بنانے کی ایک مشین تھی جس پر ہر شخص قبضہ کرنے کی تاک میں تھا۔ مگر خود چندرا کیا تھی۔ یا وہ صرف ایک طوائف زادی تھی۔ جو بچپن۔ ۔ ۔ اس پیشے کے لئے ہی تیار کی گئی تھی؟ چندرا۔ دلال آبا۔ سیتا۔ امرت ٹھاکر۔ شرابی سیٹھ۔ ان سب کے کردار، ان سب کے اغراض و مقاصد کھلے ہوئے تھے۔ جسم فروشی کی اس دنیا میں ان سب کی ایک مخصوص جگہ تھی۔ لالچ اور شہوانیت کے اس ڈرامے میں وہ سب اہم کردار کر رہے تھے مگر وہ پھول والا اور اس کی معصوم حرکت .... ان کا اس "دنیا" اس ڈرامے سے کیا تعلق تھا؟

اس رات کو دیر تک میرے دماغ میں ایک تصویر گھومتی رہی..... چندرا پیر پسارے ہوئے اور اس کے پاؤں میں پھولوں کی پازیب۔ پاؤں میں پھول! پاؤں میں پھول!! پھول اور پاؤں۔ پاؤں اور پھول۔ ایک دلفریب نقش۔ ایک بلیغ اور جامع اشارہ، ایک معنی خیز نشان۔ مگر کسی اصلیت کا نشان؟ کس طرف اشارہ؟ کئی گھنٹے کے سوچ بچار کے بعد بھی میرا دماغ اس نکتے کو حل نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ میں سو گیا اور اگلے دن جب اٹھا تو پچھلی رات کے نقوش اتنے مدھم پڑ چکے تھے کہ روزانہ کے معمول میں، میں چندرا یا اس پھول والے کا خیال بھی نہ کر سکا۔ اور یوں کئی مہینے گزر گئے۔

کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی بلکہ شروع ہی ہے۔ چندرا نے رام کشن کے فلم میں ناچا جس کا معاوضہ اس کو پانچ سو روپے دیا گیا۔ میں نے یہ ناچ صرف اس وقت دیکھا جب فلم تیار ہو گیا۔ ناچ میں سوائے نیم عریانی اور بازاری اشاروں کے کوئی خاص بات نہ تھی۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ عوام نے اس کو بہت پسند کیا اور اس کی وجہ سے چندرا کو کئی فلموں میں کام ملا۔ دلال آبا نے کئی بار رام کشن کو اپنے ہاں دعوت دی مگر وہ ایک دفعہ بھی نہ گیا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے نہ چندرا سے ملنے کا کوئی موقعہ درپیش آیا اور نہ کبھی مجھے اس کا خیال آیا۔ مگر ایک دن پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

"ارے بھائی میں ہوں رام کشن"

"کہو کیا بات ہے"؟

"شام کو فرصت ہو تو ذرا ادھر ہو جانا۔ تم سے کچھ کام ہے"

"خیر صاحب دفتر سے فارغ ہو کر رام کشن کی فلیٹ پر پہنچا وہ اکیلا ہی تھا۔ کہنے لگا —" دیکھو بھئی ایک کہانی کی ضرورت ہے اپنے اگلے فلم کے لئے"

میں نے کہا "تو پھر دوسرے صاحب سے بات کرو۔ اگر وہ مصروف ہیں تو کمال امروہوی، آغا جانی، دیوان شرر۔ مدھوک درجنوں کہانی لکھنے والے موجود ہیں"

اس نے کہا "مگر مجھے کوئی نئی چیز چاہئے۔ وہ تم ہی دے سکتے ہو"

"اگر تمہارا مطلب "نیا" یا "نئی" کے نام سے ہے تو وہ سب ختم ہو گئے ہیں۔ نیا ترانہ۔ نیا زمانہ۔ نئی دنیا۔ نئی زندگی۔ نئی روشنی۔ اب ایک ہی نیا نام رہ گیا ہے۔ نیا پرانا"

"نہیں۔ مجھے نیا یا نئی کا نام نہیں چاہئے۔ نئی قسم کی کہانی

چاہیئے۔ ایسی کہانی جس کے قدم زندگی کے اصلیت میں گڑے ہوں"

میرا خیال ہے کہ ہر شخص کے دماغ کے کسی کونے میں ایک چھوٹا سا ہمزاد بیٹھا رہتا ہے جو وقت بے وقت، کان میں کچھ کھس پھس کر دیتا ہے۔ اسی کو آمد یا "تخلیقی تحریک" کہتے ہیں۔ میرا یہ بھی تجربہ ہے کہ یہ ہمزاد پڑا سوتا رہتا ہے جب تک کوئی اقتصادی ضرورت اس کو کچوکے دے کر نہ اٹھائے۔ بہر حال یہ واقعہ ہے کہ اس زمانے میں میری مالی حالت خراب تھی۔ مہنگائی نے کمر توڑ دی تھی۔ دفتر کے ۸۰ روپیے ماہوار پر کیسے گزارہ ہوتا ؟ مگر کہانی بک جائے تو کئی ہزار مل سکتے ہیں !۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ جب رام کشن نے ایک نئی قسم کی کہانی لکھنے کو کہا تو میرے ہمزاد نے ایک عورت کی آواز بنا کر میرے کانوں میں کہا "ہم پر بھی ایک کہانی لکھ دیجیئے نا"!

"تو سنو ایک کہانی" میں نے رام کشن سے کہا۔

"پنجاب کے کسی شہر میں ایک طوائف رہتی تھی۔ اس کے ناچ گانے کا دور دور شہرہ تھا۔ دیکھا تم نے ناچ گانے کا انتظام تو فوراً ہوگیا، ہاں تو اس طوائف کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس پر بڑا جشن منایا گیا کیونکہ بیٹی ہی تو طوائف کا خزانہ ہوتی ہے جو بڑھاپے میں کام آتا ہے۔ اس طوائف نے اپنی بیٹی کو بڑے نازونعم سے پالا ناچ گانا بھی سکھایا اور لکھنا پڑھنا بھی۔ اس کی دلی خواہش یہ تھی کہ بڑی ہوکر اس کی بیٹی کو پیشہ نہ کرنا پڑے بلکہ کسی شریف گھرانے میں اس کی شادی ہو جائے۔ اسی لالچ میں اس نے ایک سفید پوش آدمی سے خود شادی کرلی جو دراصل چھٹا ہوا بدمعاش تھا اور جو خود طوائف کی بیٹی کو ذریعہ آمدنی بنانا چاہتا تھا۔ جب لڑکی جوان ہوئی تو وہ بمبئی آیا۔ بیوی کو مکان لے کر الگ رکھا اور بیٹی کو بازارِ حسن میں ایک کوٹھے پر وہ چاہتا تھا کہ اس سے فلموں میں کام کرانے اور ساتھ میں پیشہ بھی اور ساری آمدنی پر خود قبضہ کرے۔ مگر اس عرصے میں لڑکی کو ایک پھول بیچنے والے نوجوان سے اصلی محبت ہو گئی . . . . "

"اور اس کہانی کا نام ہے چندرا ؟" رام کشن نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں — چندرا نہیں — پاؤں میں پھول"

"اچھا۔ آگے چلو"

"ہاں تو اس لڑکی کو پھول والے نوجوان سے از حد محبت ہوگئی، وہ اپنی زندگی سے متنفر تھی۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ شادی کرکے غریبانہ مگر شریفانہ زندگی بسر کرے گی دیکھا کس طرح گناہ پر پاکبازی کا جذبہ غلبہ پاتا ہے، مگر اس کے سوتیلے باپ کو جب اس کا پتہ چلا تو وہ غصے میں آپے سے باہر ہوگیا۔ اس نے لڑکی کی خوشامد کی، اس کو دھمکیاں دیں، لالچ دلایا، کہ وہ ایسا قدم اٹھانے سے باز رہے۔ لیکن لڑکی کی محبت پکی اور سچی تھی۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس پر اس کو کمرے میں بند کر دیا گیا۔ مگر لڑکی کی ماں کی مدد سے پھول والے نے اس کو پیغام بھیجا کہ وہ رات کو اسے بھگا کر لے جائے گا۔ آخری وقت پر سوتیلے باپ کو بھی یہ معلوم ہوگیا . . . . . "

"پھر کیا ہوا ؟" رام کشن نے بے چینی سے پوچھا۔

"پھر کیا ہوا ؟ . . . . . پھر کیا ہوا ؟ . . . . . یہ ابھی نہیں معلوم۔ یہ کل بتاؤں گا" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کہانی خوب ہے، دوست۔ اگر اس کا انجام بڑھیا بنا لاؤ تو چار ہزار دلوائے دیتا ہوں"

چار ہزار کا لالچ بھی کتنا زبردست ہوتا ہے !۔ میں فوراً ٹیکسی لے کر دن دہاڑے اس بدنام گلی میں پہنچا۔ کونے پر ایک پھول والے کی دکان تھی۔ میں نے اس سے پوچھا "کیوں میاں، یہاں ایک بابو پھول والا ہوا کرتا تھا۔ کہاں ہے اس کی دکان ؟" بوڑھے پھول والے نے کہا "اجی صاحب وہ اس کی دکان یہی تھی جہاں میں بیٹھا ہوں۔ مگر وہ اب بابو پھول والا نہیں رہا مجنوں پھول والا ہوگیا ہے" اور یہ کہہ کر اس نے ایک معنی خیز نگاہ اس عمارت پر ڈالی جہاں چندرا رہتی تھی۔

"کہانی کی ایک کڑی تو ٹھیک بیٹھی" یہ سوچ کر میں نے خواہ مخواہ آٹھ آنے کا ایک گلدستہ بنوا لیا تاکہ پھول والے سے اور بات چیت کر سکوں۔

"وہ سامنے ہی رہتی ہے سالی۔ چندرا چندرا کہتے ہیں وسے" وہ گلدستہ بناتا جا رہا تھا اور بولتا جا رہا تھا "اچھے خاصے لونڈے کو پاگل بنا دیا۔ ان حرام جادیوں کا کیا ہے۔ آج یہ تو کل وہ۔ مگر وہ بابو کہیں کا نہ رہا۔ دوکان بھی چھوڑ دی۔ جو کچھ جمع جوڑ تھا وہ سب اس لونڈیا کے پیچھے اڑا دیا . . . . . لوجی۔ یہ گلدستہ بھی تحفہ بنا دیا ہے"

اب کوئی بہانہ بات کرنے کا نہ رہا۔ میں گلدستہ ہاتھ میں

لئے چندرا کے مکان پر پہنچا اور سیڑھیوں کا لا متناہی سلسلہ طے کرتا ہوا اوپر چلا۔ دن کو ساری عمارت سنسان تھی میں نے پانچویں منزل پر جا کر دروازہ کھٹکھٹایا تو اسی افسردہ آنکھوں والے بوڑھے سیتا نے کھولا۔ اور میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں افسردگی کے ساتھ وحشت اور غم کی جھلک بھی تھی۔"

"چندرا ہے گھر پر؟"

میں نے سیدھا سادھا سوال کیا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں سیتا پریشان سا ہو گیا۔ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور آواز دھیمی کر کے کہا "چندرا تو باٹلی والا سپتال میں ہے بڑی بیمار۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" ابھی وہ اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ اندر سے "دلال ابا" نکل آیا اور سیتا دم بخود ہو گیا۔ میں سمجھا کہ آؤ بھگت کی مشین فوراً چالو کر دی جائے گی۔ مگر اس کا حلیہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں لال لال ڈورے۔ میلے تہمد پر چیکٹ بنیان' اور بجائے روغنی چاپلوسی کے نہایت بدتمیزی کا لہجہ "او مسٹر کیا ہے؟ چلتے پھرتے نظر آؤ۔" اور پھر سیتا سے "کیا گھسر پھسر کر رہا تھا؟ چل اندر حرامزادے" وہ بیچارہ تو اندر چلا گیا مگر خونیں آنکھیں مجھے گھورتی رہیں۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نشے میں دھت تھا۔

"پولیس! تم پولیس کے آدمی ہو۔ مگر یہ مت بھولو کہ میں کون ہوں۔ میں پولیس کمشنر صاحب کا دوست ہوں۔ دوست"

"پولیس!" میں نے حیرت سے کہا "تم کیا بک رہے ہو؟"

"ہاں۔ ہاں۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میری چندرا نے پولیس کلب میں ڈانس کیا تھا۔ خود گورنر صاحب نے اس کے گلے میں ہار ڈالا تھا۔ سمجھے!" اور یہ کہہ کر اس نے دھاڑ سے دروازہ بند کر دیا۔

میں اس کا مطلب کچھ نہ سمجھا۔ مگر اسی شام کو ملاقاتیوں کے اوقات پر باٹلی والا ہسپتال پہنچا۔ بڑی مشکل سے چندرا کا پتہ ملا جب میں اس کے پلنگ کے قریب پہنچا تو دیکھا وہ سر سے پیر تک چادر اوڑھے ہوئے لیٹی ہے۔ صرف چہرہ کھلا ہوا تھا مگر اس پر اتنی زردی چھائی ہوئی تھی کہ چند لمحوں کے لئے تو میں سمجھا کہ وہ مر گئی ہے۔ مگر میری آہٹ پا کر اس نے آنکھیں کھولیں۔ میں کرسی نزدیک سرکا کر بیٹھ گیا اور گلدستہ اس کے تکیہ پر رکھ دیا۔ چندرا نے میری طرف کروٹ لی تو اس کا چہرہ گلدستے کے عین مقابل آگیا۔ خوشبو نے اس کے حواس کو بیدار کر دیا۔ اس کے منہ سے بس ایک لفظ نکلا "پھول"! اور اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ کمزوری اور بیماری اور آنسوؤں نے اس کے چہرے پر سے گناہ اور ریاکاری کے سب نشانوں کو دھو دیا تھا۔

"آپ! یہاں کیسے؟" اس نے کمزور آواز میں پوچھا۔

یہ تو میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ چار ہزار روپے میں اس کی کہانی بیچنے کے لئے میں انجام کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔ میں نے کہا کہ میں اس سے ملنے اس کے گھر گیا تھا وہاں معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے اس لئے میں نے یہاں آنا اپنا اخلاقی فرض سمجھا۔

"آپ بہت اچھے ہیں" اس نے کہا اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر "آپ کہانی لکھتے ہیں نا؟"۔

کچھ جواب دینے ہی والا تھا کہ میں نے سفید چادر پر ایک سایہ پڑتا ہوا دیکھا۔ پیچھے مڑا تو بابو کو کھڑا پایا۔ شکل سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی راتوں سے سویا نہیں ہے اور شاید روتا بھی رہا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں پھولوں کی ایک "بینی" تھی۔ میرے لالچی ہمزاد نے کہا "کہانی پوری ہوا چاہتی ہے۔ چار ہزار روپے مبارک"

بابو نے نہ جانے مجھے دیکھا یا نہیں۔ وہ چندرا کے سرہانے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور الفاظ کا ایک دھارا بہہ پڑا "مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا' چندرا' کہ تم یہاں ہو۔ انہوں نے مجھ سے بڑے بڑے جھوٹ بولے۔ یہ بھی کہا کہ تم ایک سیٹھ کے ساتھ چلی گئی ہو۔ مگر سچ کہتا ہوں میں نے ان کی کسی بات کا اعتبار نہیں کیا۔ ۔ ۔ ۔ تمہارا یہ کیا حال ہو گیا ہے' چندرا؟ تم غم کی وجہ سے بیمار ہو گئی ہو؟۔ مگر تم اب کوئی غم نہ کرو میں نے کھولی کرائے پر لے لی ہے۔ آج ہی تمہیں اپنے ساتھ لیجاؤنگا۔"

بابو کہے جا رہا تھا اور ٹکٹکی باندھے چندرا کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جہاں مختلف جذبات ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ میں نے پہلے دیکھا کہ بابو کی آمد سے اس کے چہرے پر رونق اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک آگئی ہے۔ مگر پھر نہ جانے کیوں دفعتاً یہ چمک اس طرح غائب ہو گئی۔ جیسے بٹن دبانے سے بجلی کی روشنی گل ہو جائے اور اس کی جگہ مایوسی نے لے لی پھر ان آنکھوں میں ایک نئے اور شاید خوفناک ارادے کی لہر آئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ اور پھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

www.taemeernews.com

میں نہ صرف عورت پرست ہوں بلکہ عام طور سے ان کی پاکبازی محبت اور قربانی کے دعووں کو ایک ڈھونگ سمجھتا ہوں جس کو وہ مردوں کو اپنے جال میں پھنسانے کے لئے رچاتی ہیں۔ مگر میں کبھی خواب میں بھی یہ نہ سوچ سکتا تھا کہ ایک عورت، اتنی طوطا چشم، اتنی سنگدل، اتنی گری ہوئی ہوسکتی ہے جتنی چندرا اس لمحے میں نکلی جب اس نے بجائے بابو کا جواب دینے کے میری طرف مڑ کر کہا "ڈارلنگ۔ اس آدمی سے کہو یہ جائے یہاں سے ——"

ڈارلنگ! اور مجھے؟ جس کی شکل اس نے زندگی میں صرف دو بار دیکھی تھی۔ اور یہ شخص یہاں سے چلا جائے جس نے اپنی محبت، اپنی زندگی، اپنا سب کچھ اس کے قدموں میں رکھ دیا تھا۔ اور کیوں؟ اس کی ایک ہی وجہ ہوسکتی تھی کہ بابو ایک غریب پھول والا تھا اور میں نسبتاً ایک کھاتے پیتے سفید پوش طبقے سے۔ اف رے عورت! کیا تو اسی برتے پر عشق و محبت کے راگ الاپتی ہے؟

بابو چند لمحے تک اس طرح ساکت کھڑا رہا جیسے اس کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ اس کے ہاتھ میں اب بھی پھولوں کی وہ بینی تھی جو وہ چندرا کے لئے لایا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اس کو پلنگ کی پائنتی رکھ دیا "میں۔ ۔ ۔ میں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ لایا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ تمہارے لئے۔ ۔ ۔ ۔"

چندرا نے اپنا رخسار میرے لائے ہوئے گلدستے سے لگاتے ہوئے کہا "اس کی ضرورت نہیں۔ دیکھو یہ کتنے خوبصورت پھول لائے ہیں۔"

"تو پھر پاؤں ہی میں باندھ لینا" یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے جھن سے اس کی امید اور محبت کا تار ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا ہو۔

میں نے چندرا کی طرف دیکھا اور سوچا "اس ذلیل عورت پر غصہ کرنا بیکار ہے۔ یہ سوائے نفرت ۔ ۔ ۔ ۔ عمیق، بے پناہ نفرت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کے اور کسی چیز کے قابل نہیں ہے۔"

وہ بولی "میں نے آپ کے ساتھ گستاخی کی۔ اس کی معافی چاہتی ہوں۔"

میں نے بینی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "معافی مانگنی ہے تو ان پھولوں سے مانگو۔ بات یہ ہے چندرا کہ تم ان بدنصیب عورتوں میں سے ہو جو نہ پھولوں کی قدر جانتی ہیں اور نہ محبت کی۔ اس رات کو جب بابو نے تمہارے پاؤں میں پھولوں کا گجرا ڈال دیا تھا تم اس کو مذاق سمجھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔ مگر میں سوچتا رہا تھا کہ سر کے پھولوں کی یہ تحقیر کہ وہ پاؤں میں ڈالے جائیں۔ آخر کیوں؟ بابو نے تمہارے پاؤں میں پھول نہیں ڈالے تھے بلکہ تمہارے قدموں میں اپنا دل رکھ دیا تھا۔ تمہیں چاہئے تھا کہ ان پھولوں کو پاؤں سے نکال کر اپنے سر میں لگا لیتیں۔ مگر نہیں تمہیں تو پھولوں اور دلوں دونوں کو پیروں سے مسلنے میں مزا آتا ہے۔ آج میری سمجھ میں آیا ہے کہ پاؤں میں پھول کس اصلیت کا نشان ہے؟ یہ تمہاری جیسی عورتوں کی آوارگی اور سنگدلی کا نشان ہے۔ تم پھولوں کو پاؤں میں پہنتی ہو اور پھولوں کی طرح پاک اور پوتر جذبات کو قدموں میں روندتی ہو۔ تو لو۔ ۔ ۔ ۔"

مجھ پر جنون سا سوار ہو گیا "تو لو ان پھولوں کو پہنو اپنے پاؤں میں۔ یہ پھول نہیں ہیں چندرا یہ بابو کا دل ہے" میں نے ایک ہاتھ سے بینی کو اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے پائنتی سے چادر الٹتے ہوئے کہا "وہ کہہ گیا ہے کہ پاؤں ہی میں باندھ لینا۔ میں اس کا کہنا ۔ ۔ ۔ ۔"

فقرہ نامکمل رہ گیا۔ بینی میرے ہاتھ سے گر گئی اس جگہ جہاں چندرا کے پاؤں ہونے چاہئیں تھے۔ مگر وہ پاؤں نہ تھے۔ وہاں کچھ نہ تھا۔ صرف دو ٹانگوں کے ٹھنڈ پٹیوں میں بندھے ہوئے۔

"چندرا!" اور دفعتاً میرے دماغ میں چند تصویریں مجنونانہ طریقے سے چکر کھانے لگیں۔ "دلال ابا" کی خونیں آنکھیں۔ ایک دھاردار تلوار۔ اسمیتا کا افسردہ چہرہ۔ اور پھر وہ خونیں آنکھیں۔

"چندرا!"

"تلوار کی دھار پر ناچنا آسان نہیں ہے۔ بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ یہی انہوں نے ڈاکٹر سے کہا۔"

"چندرا!"

"آپ اتنے پریشان کیوں ہوتے ہیں؟ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ اگر کوئی چلتی ہوئی مشین میں پاؤں ڈالے گا تو اس کا پاؤں ضرور کٹ جائے گا۔"

زندگی کا نور

رشید اختر ندوی

بوڑھا لقمان اپنے وقت کا ایک بڑا فلسفی، ایک بڑا معلم اخلاق اور ایک ماہر مصور تھا، اس نے زندگی کو ہنستے ہوئے، سسکتے، چلتے، پھرتے، بھاگتے، اچھلتے، کودتے اور لہراتے دیکھا تھا. قدرت نے اسے بینائی بخشی تھی۔ اور یہ بینائی، یہ روشنی وہ اپنی اکلوتی بچی صبوحہ کی جھولی میں ڈال دینا چاہتا تھا۔

یہی صبوحہ اس کے بڑھاپے کی لاٹھی تھی، وہ ابھی دس سال کی تھی، کتنی پیاری، کتنی معصوم اور کتنی خوب صورت تھی یہ صبوحہ۔ بوڑھا فلسفی اسے دیکھتا، اس کے چہرہ پر ایک عجیب نور پھیل جاتا؛ اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے آسمان سے ہر طرف نور ہی نور برسنے لگا ہے۔

مگر صبوحہ کو دیکھتے دیکھتے یہ نور کبھی کبھی اندھیرے میں بدل جاتا بوڑھے کے چہرے پر ایک نامعلوم سیاہ سی آپ ہی آپ پھیل جاتی اور بوڑھے کا تخیل ماضی کے دھندلکے میں جا الجھتا۔

بالکل صبوحہ کی شکل و صورت کی ایک جوان، خوب صورت اور انتہائی رعنا عورت بوڑھے کے حافظہ کی تختی پر ابھرتی، وہ سر جھٹک دیتا، مگر یہ خوب صورت عورت اپنی پوری رعنائیوں اور دل فریبیوں کے ساتھ تخیل کے دکش پر اڑتی۔ پاؤں میں چھاگل اور ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے ڈالے، بالکل بہار کی سی رعنائی اور خوشبو کی سی تیزی کے ساتھ آتی۔ یہ صبوحہ کی ماں تھی، بوڑھے فلسفی کی محبوبہ تھی یہ اپنے وقت کی ایک بڑی رقاصہ تھی، عجیب عادات اور انوکھی اداؤں والی رقاصہ تھی، یہ محض اپنے شوق، اپنی چاہت اور اپنی مرضی کے تابع تھی، اس کے خزانے دولت سے معمور تھے، وہ دولت کی محتاج نہ تھی، امرا اور وزرا اس کے در پر آتے۔ رقاصہ چاہتی تو ان کو باریاب کرتی، نہ چاہتی تو ان پر اس کے محل کے دروازے بند رہتے۔

اس نے عجیب مزاج پایا تھا، نغمہ کی طرح پاکیزہ، خوشبو کی طرح بے حجاب۔ وہ ابھی خوش خوش نظر آتی۔ قہقہے پر قہقہے لگا رہی ہوتی، ابھی غم کے بادل اس کے دماغ پر چھا جاتے، وہ برتن توڑ دیتی، کپڑے پھاڑ دیتی، خوشبوئیں الٹ دیتی۔

یہ فلسفی اس کی عجیب و غریب شہرت سن کر اس کے پاس آیا۔

یہ رات کتنی رنگین تھی، کتنی خوب صورت اور کتنی سہانی تھی جب فلسفی نے اس کے محل کے دروازے پر دستک دی، دروازہ کھلا۔ خوشبو کی لپٹیں، اس کی پیشوائی کو بڑھیں، جس لونڈی نے دروازہ کھولا، وہ خود خوشبو تھی، وہ خود مستی تھی، وہ ایک عجیب رعنائی تھی۔ وہ مسکرائی۔ فلسفی سے پوچھا کون ہو۔

فلسفی نے کہا۔ میں لقمان ہوں اپنے وقت کا سب سے بڑا فلسفی۔

لونڈی قہقہہ مار کر ہنسی۔ تم اپنے وقت کے سب سے بڑے فلسفی اور شہنشاہ کے سب سے بڑے درباری ہو۔

یہ ہمیں معلوم ہے۔ مگر تم یہاں کیا لینے آئے ہو۔ اس حسین رات میں مالکہ کسی فلسفی سے ملنا نہیں چاہتی۔ فلسفہ کی خشکی اور کھردرہ پن تو اس رات کی لطافت کو کھو دے گا۔

فلسفی تم جاؤ یہاں سے۔

فلسفی نے سر جھکا لیا، اور واپس ہو گیا۔ مگر دوسری رات کسی قدر ڈراؤنی تھی، آسمان پر بادل چھائے تھے۔ یہ سیاہ بادل زور زور سے ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے۔ اور ان کی آواز کمزور جسموں میں کپکپاہٹ پیدا کر رہی تھی۔ ایسے میں فلسفی نے پھر رقاصہ کے محل کے دروازے پر دستک دی۔ آج کی رات جب لونڈی نے دروازہ کھولا، تو خوشبو کی لپٹیں نہیں آئیں۔ لونڈی اسے دیکھ کر صرف مسکرائی آج اسے یہ فلسفی بڑا خوب صورت اور بڑا وجیہہ معلوم ہوا، اس نے اس سے کچھ نہیں کہا، مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا، اور اسے لیے ساتھ اندر لے گئی۔

محل کیا تھا ایک عجائب گھر تھا، ہر طرف حسن اور ہر طرف رعنائی پھیلی تھی لونڈیاں نیم عریاں لباس پہنے ادھر ادھر اس طرح پھر رہی تھیں جیسے ان کی زندگی محض نغمہ ہے۔

کئی خوب صورت کمروں میں سے گزر کر لونڈی ایک بڑے کمرے کے دروازہ پر پہنچ کر رکی، اس کی نقرئی آواز گونجی۔

ہمارے ملک کے سب سے بڑے فلسفی حاضری چاہتے ہیں۔

اندر سے ایک عجیب آواز آئی۔

آنے دو۔

لونڈی نے پردہ اٹھایا فلسفی کے قدم اندر کی طرف اٹھے، لونڈی واپس ہوگئی، مگر فلسفی کے قدم اٹھتے ہی پھر رک گئے، اس کی آنکھیں فرط مسرت سے بھر آگئیں، ایک عجیب حسن، ایک انوکھی رعنائی دیکھی اس نے ایک نرالا نغمہ سنا، اس نے ایک ان جانی بوجھی خوشبو پھیلی محسوس کی، اس نے . . . .

رقاصہ مسکرائی، چھم چھم کرتی اٹھی، اور حیرت زدہ فلسفی کا ہاتھ پکڑ کر اسے آگے بڑھا لے گئی، اس نے آپ ہی آپ فلسفی کے گلے میں اپنی حسین باہیں ڈال دیں۔

اور فلسفی کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی نس نس اور رگ رگ جوان ہوگئی ہے۔

باہر بادلوں نے گرجنا چھوڑ دیا، آسمان نکھر گیا، حسین تارے ہر طرف چمکنے لگے۔ اور ساری فضا ایک نغمہ بن گئی۔

فلسفی اپنا فلسفہ بھول گیا، رقاصہ ایک عجیب کیف بن کر اس کے دل و دماغ پر چھا گئی۔

وقت کا پرندہ بڑی تیزی سے پر پھڑپھڑاتا اڑتا چلا گیا، رات بیتی دن آیا، دن ڈھلا رات آئی، اور ایسی کتنی راتیں اور ایسے کتنی دن بیت گئے۔ فلسفی نے پھر باہر کی روشنی نہیں دیکھی۔ وہ اس محل میں ایسا گیا کہ پھر باہر نہیں نکلا۔

رقاصہ نے اس کے لئے ایک بچی جنی، صبوحہ اس کا نام تجویز ہوا۔

بچی جننے کے بعد رقاصہ اب فلسفی سے پہلے جیسی محبت نہ کرتی فلسفی سے اس کا جی بھر گیا تھا کسی قدر ـــــ اور ایک رات ایک سال پہلے کی رات کی طرح حسین رات تھی، اور فلسفی شاہی دربار میں حاضری دینے کے بعد گھر کے اندر داخل ہوا تھا، چاندنی ہر طرف پھیلی تھی، وہ بڑے دروازہ کی طرف جانے کی بجائے صحن باغ میں ٹہلنے لگا، اس نے دور سفیدے اور سرو کے درختوں تلے دو سفید سفید سے سایہ سے دیکھے، وہ کچھ کھٹکا، دبے پاؤں پچھلی طرف سے ہوتا ہوا وہ ان سایوں کے قریب آیا، اور ـــــ

ان میں سے ایک اس کی محبوبہ اس کی بچی کی ماں رقاصہ تھی، اور دوسرا ایک نوجوان تھا۔ وہ ـــ دونوں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے تھے!

فلسفی کا سر جھک گیا، ہوا شائیں شائیں کرنے لگی، اسے ایسا معلوم ہوا جیسے ہر طرف طوفان کے اژدہے پھنکارنے لگے ہیں۔

فلسفی نے زندگی میں پہلی بار اپنے اندر ایک عجیب آگ دوڑتی محسوس کی، وہ شعلہ کی طرح جلنے لگا، اور اس نے ایک بھاری پتھر اٹھا کر ان دونوں کے سر پاش پاش کردیئے، وہ دیوانوں کی طرح وہاں سے لپکا محل میں آیا، صبوحہ کو گود میں بھرا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔

وہ اپنے وقت کا سب سے بڑا فلسفی تھا، مگر اس کے دل نے آج سب سے بڑی چوٹ کھائی تھی۔

اب وہ ندیوں اور آبشاروں سے بھرپور وادی میں رہتا، اس وادی پر اس کی حکومت تھی، یہاں کی ہر چیز اس کا حکم مانتی، آدمی بھی اور جانور بھی۔

وہ ہر وقت خوش رہنے کی کوشش کرتا، صبوحہ اس کی زندگی تھی، اور بوڑھے کی زندگی کا یہ پودا اوپر کو اگ رہا تھا۔

وہ عجیب انداز میں اسے تعلیم دے رہا تھا، اس نے اسے ہر قسم کے ذلیل اور برے اثر سے بچایا، اس کے سامنے عورتیں اور مرد ایک ساتھ نہ آتے، جہاں صبوحہ رہتی وہاں صرف عورتیں تھیں، سیدھی سادی عورتیں۔

اور باہر صرف مرد۔ یہ عورتیں اور مرد صبوحہ کے سامنے ایک جگہ بیٹھ نہ سکتے تھے۔

زرد زرد رنگت والی یہ چند عورتیں زندگی کے نور سے محروم تھیں فلسفی نے ان کے چہروں پر زندگی کی کوئی شعاع پڑنے نہ دی، خود فلسفی صبوحہ کو جو تعلیم دے رہا تھا، اس میں عورت اور مرد زندگی کی گاڑی کے دو پہیے نہ تھے۔

www.taemeernews.com

مگر بابا جب اپنی لائبریری میں گم ہوجاتے تو ہولے ہولے گنگنانے لگتی۔ گانے میں اُسے عجیب سکون ملتا۔

کبھی کبھی وہ شام کے وقت پہاڑی کی چوٹی پر گرتے آبشار کی روانی کا تماشہ کرتے وقت آپ ہی آپ گانے لگتی۔

اور اس کا دل عجیب طرح جھوم اٹھتا۔

❖ ❖ ❖ ❖

ایک صبح جب اس کی سالگرہ منائی جا رہی تھی، زرد زرد رنگ والی خادمائیں، اور آس پاس کی بستی کی کنواری لڑکیاں زرد زرد اور سفید سفید پھولوں کے ہار لے کر اس کے گلے میں ڈالنے آئیں، تو ان میں ایک بیاہتا لڑکی بھی تھی، اس نے اپنی سہیلیوں سے کہہ سن کر اپنے بیاہ کی بات چھپادی تھی، ورنہ اسے اس تقریب میں نہ آنے دیا جاتا۔ نہ جانے کیا بات تھی یہی بیاہتا لڑکی صبوحہ کو سب سے زیادہ پسند آئی اور اس کا جی چاہا اس کے ساتھ باتیں کرے، اس کے چہرے پر اُسے عجیب نور نظر آیا، اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس لڑکی اور اس گوالے کی شکل ملتی جلتی ہے، جسے ہر شام وہ پہاڑی پر دیکھنے جایا کرتی۔

سچ مچ یہ اس گوالے کی بہن تھی، اور یہ جان کر صبوحہ کی باچھیں کھل گئیں، اس نے اس کی خوب تواضع کی، اچھی اچھی چیزیں کھلائیں، گوالے کے متعلق پوچھا کہ وہ ادھر کیوں نہیں آتا۔

لڑکی نے پہلی دفعہ اس پر یہ راز افشا کیا کہ سرکار نے ان کے خاندان کو ایک دور کی بستی میں بھیج دیا، اور اس کے بابا کو حکم ملا تھا کہ وہ اور اس کا بیٹا ادھر کبھی نہ آئے۔

صبوحہ کو بہت دکھ ہوا یہ سن کر، اس کے دل میں اب عجیب بے چینی سی رہنے لگی، اور کبھی کبھی وہ اس لڑکی کو اپنے پاس بلا لیتی، اس لڑکی کے پاس بیٹھ کر اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کی بے چینی کچھ کم سی ہو گئی ہے۔

ایک صبح جب یہی لڑکی اس سے ملنے آئی تو وہ بہت خوش تھی، اس نے کہا وہ میکے جا رہی ہے۔

صبوحہ نے نہ جانے کیوں پوچھ لیا، بھائی سے ملوگی؟

لڑکی قہقہہ مار کر ہنسی!

اری! ملوں گی کیوں نہیں،

صبوحہ چیختی ہوئی بولی۔

ان سے ہمارا اسلام کہنا — کہنا ہمیں وہ یاد آتے ہیں۔

اور پھر اس نے ترک کر دی۔

ہاں ان سے کہنا کبھی شام کے وقت تھوڑی دیر کے لئے اس پہاڑی پر آجائیں۔

لڑکی سہم گئی! مگر صبوحہ نے اسے منا لیا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

ایک شام تھی عجیب دھندلی سی شام۔ بوڑھا فلسفی آج بہت بے چین بے چین سا تھا۔

اسے صبح سے کچھ حرارت سی تھی، نہ جانے اس کا جی کیوں چاہ رہا تھا، وہ صبوحہ کی تصویر کو مکمل کر دے۔

اور صبوحہ خود اپنی زندگی کی تصویر میں رنگ بھر رہی تھی۔

وہ پہاڑی پر چڑھ کر اس جگہ جا پہنچی تھی، جہاں پہلی دفعہ حسین گوالا اسے ملا تھا۔

اچانک اس کی آنکھیں چمک اٹھیں، یہی گوالا چیل کے درختوں میں سے ایک چھلاوے کی طرح بڑھتا دکھائی دیا۔

صبوحہ میں نہ جانے آج کہاں سے ایک عجیب نسائیت سی بھر دی۔

اس نے حسین گوالے کو دیکھ کر شرم سے آنکھیں جھکا لیں۔ آج شرم پہلی بار اس کی آنکھوں میں پیدا ہوئی، اس کا تن من عجیب مسرت محسوس کرنے لگا، اور جب گوالا اس کے قریب آیا تو اس نے نہ جانے کس انداز میں اسے دیکھا۔

اور نہ جانے کیسے جب گوالے نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں لے لئے تو اس کا جسم اس زور سے کانپنے لگا کہ وہ گر پڑی۔

گوالے نے اسے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ کر اٹھایا، اور نہ جانے کیسے صبوحہ کی باہیں اس گوالے کے گلے میں جا پڑیں۔

—— اور دور اوپر پہاڑی پر بوڑھا فلسفی اپنے اندرونی اضطراب سے مجبور ہو کر ابھی ابھی آن پہنچا تھا، اس نے ان دونوں کو دیکھا۔

اور سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا

مگر نہ جانے کیسے اس کے اندر ایک عجیب لہر جاگ اٹھی، وہ پیچھے کی طرف بھاگا —— اور لائبریری میں پہنچ کر اس اسٹول پر آن بیٹھا جس کے سامنے صبوحہ کی نامکمل تصویر رکھی تھی، اس نے صبوحہ

اور خود صبوحہ ابھی یہ جانتی نہ تھی، اس کے اندر ابھی عورت کی بینائی پیدا نہ ہوئی تھی۔

مگر نہ جانے کیا بات تھی، صبوحہ کا دل اس ماحول میں کچھ مرجھایا مرجھایا سا رہتا، وہ نہ کھل کر ہنستی، اور نہ جی بھر کر کھیلتی۔

باپ پڑھاتا تو وہ پڑھتی رہتی، باپ کھیلنے کا حکم دیتا، وہ کھیلنے لگتی، اس کے ساتھ کی لڑکیاں اس سے زیادہ عمر کی تھیں، وہ بھی اس کے ساتھ کھیلتیں، اسے اس کھیل میں کوئی خاص کیف حاصل نہ ہوتا۔ فلسفی یہ جانتا تھا، مگر وہ یہ خاص کیف اسے بخشنا نہ چاہتا تھا۔ وقت بھاگتا رہا۔

صبوحہ بارہ سال کی ہو گئی، وہ باپ کے فلسفے کو سمجھنے لگی تھی، وہ خود ایک بڑا فلسفہ بنتی جا رہی تھی، وہ کھوئی کھوئی سی رہتی، باپ کی لائبریری میں گھس کر بہت کم باہر نکلتی۔

مگر ایک شام جبکہ ابھی سورج پوری طرح غروب نہ ہوا تھا، وہ اپنے ایک پالتو ہرن کے تعاقب میں سامنے کی بڑی پہاڑی پھلانگ گئی۔

اچانک اس کی آنکھیں کچھ چندھیا سی گئیں، اسی کی عمر کا ایک خوبصورت لڑکا ایک گائے کی پیٹھ پر لاٹھی رکھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

یہ لڑکا کتنا خوبصورت تھا، صبوحہ کو اسے دیکھ کر عجیب خوشی ہوئی، ایسی خوشی جیسی اس سے پہلے اس نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔

وہ اسے دیکھ کر مسکرا دی۔

لڑکا بھی مسکرایا۔

صبوحہ کا جی چاہا اس سے باتیں کرے، مگر اچانک لڑکے کو کسی نے دور سے آواز دی، لڑکا اس آواز پر لپکا، اور صبوحہ اس کے سڈول جسم اس کے خوبصورت بالوں اور عجیب قسم کی نورانی آنکھوں کو حیرت سے دیکھتی، ادھر کی طرف بڑھنے لگی۔

❖ ❖ ❖ ❖

آج جب وہ گھر آئی تو اس میں ایک عجیب تبدیلی تھی، ایک عجیب خوشی تھی، اس کے چہرہ پر سفیدی کی جگہ پہلی دفعہ سرخی جھلکنے لگی، اب وہ شام کو ہر روز وہاں جاتی، کبھی کبھی اس گوالے سے باتیں بھی کرتی، اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے یہ باتیں فلسفہ سے زیادہ لطیف اور زیادہ پاکیزہ ہیں۔

مگر شاید فلسفی نے اس کی یہ تبدیلی محسوس کر لی، اس لئے اس نے شام کے وقت اس کے باہر اکیلے جانے پر پابندی لگا دی، اب دو بڑی عمر کی خادمائیں اس کے ساتھ ہوتیں۔

وہ پہاڑی کے اس طرف جاتی، گوالا وہاں آتا، صبوحہ کو عجیب طرح دیکھتا، صبوحہ بھی اسے دیکھتی، مگر وہ دونوں مل نہ پاتے۔

صبوحہ میں اس پابندی کے باعث ایک عجیب بے چینی سی پیدا ہو گئی اب وہ کبھی کبھی سخت جھنجلا جاتی، اچانک کے برتن سامنے سے اٹھا کر پرے پھینک دیتی۔

فلسفی نے اس جھنجلاہٹ کا راز معلوم کر لیا، اور اس گوالے کے ماں باپ کو کسی دور کی بستی میں بھجوا دیا۔

مگر یہ جھنجلاہٹ اور زیادہ بڑھتی گئی۔

❖ ❖ ❖ ❖

عمر کا پرندہ اڑتا رہا۔

صبوحہ جوان ہو گئی، باپ نے اپنی ساری حکمت اور دانائی اسے عطا کر دی۔

اب بھی وہ شام کو اس پہاڑی پر جاتی، مگر گوالے کو نہ دیکھ کر اس کی جوانی مرجھا جاتی، اور وہ سوچتی — بابا اس پر یہ پابندی کیوں لگاتے ہیں، اس گوالے کے پاس اسے کیوں جانے نہیں دیتے۔ کبھی کبھی جب بابا تصویر میں رنگ بھر رہے ہوتے، وہ بابا کے پاس آ جاتی، اور بابا کے ہاتھ سے برش لے کر تصویر میں رنگ بھرنے لگتی۔ یہ تصویر صبوحہ کی اپنی تصویر تھی، بابا اس کی تصویر نہ جانے کب سے بنا رہے تھے۔

زرد زرد سی بے جان سی تصویر۔ صبوحہ کا جی چاہتا۔ بابا اس کی آنکھوں میں کچھ عجیب قسم کی مستی، کچھ عجیب قسم کا سوز بھر دیں، ایسا سوز جیسا کبھی صبح کے وقت چارپائی سے اٹھتے وقت اس کی آنکھوں میں آپ ہی آپ موجود ہوتا ہے، اور اس کا جی چاہتا — وہ آئینہ کے سامنے بیٹھ کر گانے لگتی۔

وہ گاتی — بابا کی مخالفت کے باوجود گاتی، جیسے ہی وہ دل کے جذبات سے مجبور ہو کر گانے لگتی، بابا اسے روک دیتے اور اس کا دل ٹوٹ جاتا۔

www.taemeernews.com

کی یہ تصویر مکمل کردی۔

تصویر کی آنکھوں میں جوانی ناچنے لگی تھی، ویسی ہی جوانی جیسے صبوحہ کی ماں اور ظلفی کی محبوبہ کی آنکھوں میں اس رات ناچی تھی، جب ظلفی پہلی بار اس کے حضور باریاب ہوا تھا۔

ظلفی کے دماغ کی سوچنے والی رگ شدت احساس سے پھٹ گئی۔

اور وہ دھم سے زمین پر آگرا۔ اس کا سر شیشے کے گلدان سے ٹکرایا، ایک زور کی آواز پیدا ہوئی۔

اور ماما بھاگی بھاگی اندر گئی۔

اک شور اٹھا

سرکار مر گئے!

صبوحہ کی تلاش ہوئی۔ مگر صبوحہ گھر میں نہ تھی۔ بس خادمہ نے اسے پہاڑی پر چڑھتے دیکھا تھا، وہ بھاگی بھاگی پہاڑی پر چڑھی، صبوحہ کو آواز دی۔

اور صبوحہ گوالے کی جوان آغوش سے اس طرح جاگی جیسے ہم سب کوئی عجیب سہانا خواب دیکھتے وقت جگا دیے جاتے ہیں اس نے آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا، سامنے پہاڑی پر نظر گئی تو کانپ کر گوالے کی گود سے الگ ہو گئی۔

وہ جب اوپر کی طرف بڑھ رہی تھی، تو بری طرح شرما رہی تھی۔

اور یہ شرم عجیب غم میں بدل گئی، جب خادمہ نے ظلفی بابا کی موت کی خبر سنائی۔

صبوحہ بری طرح چیخ اٹھی، گوالا اوپر کی طرف بھاگا۔

صبوحہ روتی چلاتی نیچے کو از رہی تھی، اور گوالا ڈرتے ڈرتے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔

آج وہ باپ کی لاش سے لپٹی بری طرح سے روتی۔

اچانک اس کی روتی آنکھیں اس تصویر کی طرف اٹھ گئیں، جو سامنے پڑی تھی ــــ بابا اس تصویر کو مکمل کر گئے تھے۔

تصویر کی آنکھیں جوانی کے نشہ میں مخمور ہو گئی تھیں، ویسے ہی تیرتے ذرے گوالے نے اندر قدم رکھا، اور نہ جانے صبوحہ کے معصوم چہرہ پر ایک عجیب سرخی سی دوڑ گئی۔

(دامِ خیال کا ایک صفحہ)

نمودِ صبحِ صادق

ضیاء الاسلام

عرش سے کونسا پیغام نیا آیا ہے!

ہم نے اقبال سے کیا سیکھا ہے کیا پایا ہے

تاجِ زرّیں کو بھی آنکھوں سے گرانا سیکھا

عشق کو فقر کا ہم رنگ بنانا سیکھا

جبر کے پنجۂ خونیں کو گھمانا سیکھا

شاہبازوں سے ممولوں کو لڑانا سیکھا

مردِ حق تیغِ خودی لیکے جو ہشیار ہوا

ذہنِ آدم پہ سویرا بھی نمودار ہوا

اقبال کا پیام حیات

سجاد ظہیر

اردو کا سب سے بڑا شاعر اقبال ۱۸۷۷ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوا۔ پنجاب میں انگریزی حکومت کو قائم ہوئے ابھی کوئی بیس سال ہی ہوئے تھے اور سیالکوٹ پنجاب کے ان دو تین شہروں میں سے تھا جہاں انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء کے غدر کے موقعہ پر شورش بھی ہوئی تھی۔ اقبال کے والد متوسط درجہ کے ایک نیک اور پرہیزگار کشمیری مسلمان تھے۔ انہوں نے پہلے اپنے دوست مولوی میر حسن صاحب سے اقبال کو عربی و فارسی کی تعلیم دلائی اور اس کے بعد مولوی صاحب ہی کی رائے سے انہیں سیالکوٹ مشن کالج میں انگریزی تعلیم کے لئے داخل کر دیا۔ انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کے لئے اقبال گورنمنٹ کالج لاہور آئے، اور یہاں سے انہوں نے بی۔ اے اور ایم۔ اے کے امتحان اول درجے میں پاس کئے۔ اس زمانہ میں مشہور انگریز عالم مسٹر آرنلڈ بھی گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے، انہوں نے اقبال کی تعلیمی رہنمائی میں خاص حصہ لیا، ہر طرح سے ان کا دل بڑھایا اور ان کی مدد کی۔ کالج کی تعلیم ختم کرنے کے بعد اقبال لاہور کے اورینٹل کالج میں پڑھانے لگے۔ انیسویں صدی کا ختم اور بیسویں صدی کے آغاز کا زمانہ ہماری قومی اور تہذیبی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، یہ وہ زمانہ ہے جب مسلمانوں میں سرسید احمد خاں کی جدید تعلیم کی تحریک پھیلنے لگی تھی۔ پنجاب میں انجمن حمایت اسلام اس نئی تحریک کی رہنما تھی، سرسید کے ساتھی اور دوست مولانا حالی بھی لاہور میں ہی رہتے تھے، حالی محمد حسین آزاد اور ان کے دوست قدیم رنگ تغزل کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے اردو میں ادبی انقلاب کی ابتدا کر چکے تھے، اقبال ان تحریکوں سے متاثر ہی نہیں ہوئے، انہوں نے اپنی جواں سالی کے باوجود اپنی شاعری سے ان پر بھی اثر ڈالا، ان کی شاعری میں صرف مسلمانوں کی ہی نہیں، سارے ہندوستان کی قومی بیداری کی روح تڑپ رہی تھی، اسی زمانہ میں انہوں نے اپنا مشہور ہندی ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"، اور ہندو مسلم اتحاد کے موضوع پر اپنی لافانی نظم "نیا شوالہ" لکھی، "تصویر درد" جس میں وہ مشہور شعر ہے۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اسی عہد کی نظم ہے۔

یورپ کا سفر

۱۹۰۵ء میں اقبال فلسفہ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے، انہوں نے کیمبرج میں مشہور انگریزی عالموں براؤن، نکلسن وغیرہ سے استفادہ کیا اور پھر جرمنی جا کر فلسفہ عجم پر اپنا مقالہ تیار کیا، اور میونک یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی، انگلستان میں انہوں نے بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ کے تین سال کے قیام نے اقبال پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ اب ایک طرف تو ان میں یہ احساس پیدا ہوا کہ یورپ کی سرمایہ دارانہ تہذیب اپنی ظاہری شان و شوکت اور طمطراق کے باوجود ایک اندرونی بیماری کا شکار ہے، جو ایک نہ ایک دن اس کے زوال کا باعث بن جائے گی، دوسری طرف وہ یہ بھی سمجھنے لگے کہ مشرقی قومیں خاص طور پر مسلمان اگر نجات چاہتے ہیں تو انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیئے، اپنے ماضی کی بہترین روایات کو تازہ کرنا چاہیئے، اور اس طرح ایک نئی زندگی کی تعمیر کرنا چاہیئے، ان خیالات کا اظہار اقبال کے ان اشعار سے ہوتا ہے۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

www.taemeernews.com

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

جنوری ۱۹۰۸ء میں اقبال وطن واپس لوٹے، اب وہ گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے، ساتھ ہی انہیں بیرسٹری کرنے کا بھی موقع ملا۔

مسلمانانِ ہند کی بیداری

یہی زمانہ ہے جب ہندوستانی مسلمانوں میں برطانوی شہنشاہیت کے خلاف جذبات پھیلنے لگے۔ ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد پڑ چکی تھی، اتحادِ اسلامی کی تحریک دنیا کی مسلمان قوموں میں مغربی شہنشاہیت کے تسلط کے خلاف ایک نئی روح پھونک رہی تھی۔ علی گڑھ اور دوسرے انگریزی کالجوں کے پڑھے ہوئے مسلم نوجوان ہندوستان کی آزادی اور مسلمانوں کی حیاتِ ملی کے احیاء کے خواب دیکھنے لگے تھے۔

شبلی نے اسلامی تاریخ کو نئے اور پرجوش انداز میں پیش کر کے درمیانی طبقے کے اردو داں مسلمانوں کو خودداری اور خود اعتمادی کا سبق دیا تھا۔ ایک نئی سیاسی تہذیبی اور روحانی زندگی لوگوں کو متحرک کر رہی تھی، تقسیم بنگال کی منسوخی، جنگ طرابلس و بلقان اور سانحہ کانپور نے مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ اس بیداری کو سیاسی شکل محمد علی، ابوالکلام، محمود الحسن، انصاری وغیرہ نے دی، اس کی علمی اور تہذیبی رہنمائی شبلی نے کی اور اس کا جذباتی اور روحانی پیشوا اقبال تھا۔

اقبال کی مشہور نظم شکوہ جس کا ایک ایک لفظ ہندوستانی مسلمانوں کی اس جذبہ خودداری کا اظہار ہے، جو ان میں اپنی غلامی، غربت اور پستی کے شدید احساس کی وجہ سے پیدا ہونے لگا تھا، اسی زمانے میں لکھی گئی، اس نظم کے پہلے ہی بند سے ساری قوم کی بیداری کا اظہار ہوتا ہے۔

کیوں زیاں کار بنوں، سود فراموش رہوں
فکرِ فردا نہ کروں، محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

کہا جاتا ہے کہ اقبال نے جب یہ نظم انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھی تو لوگ اتنے متاثر ہوئے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، تھوڑے ہی عرصہ میں اقبال کا کلام اور ان کا ترانۂ ملی مسلمانوں کے ہر ایک جلسہ میں پڑھا جانے لگا، اور وہ مسلمانوں کے قومی شاعر بن گئے۔

جنگِ عظیم کے بعد جب انگلستان، فرانس اور برطانیہ وعدہ شکنی کر کے اسلامی ملکوں کو محکوم بنانے لگے، ہندوستان میں مظالم شروع ہوئے، روس میں اشتراکی انقلاب ہوا، تو ان واقعات کا بھی اقبال کی شاعری پر بہت گہرا اثر پڑا، تحریک خلافت میں اقبال نے براہ راست حصہ نہیں لیا، لیکن انہوں نے اس کے ساتھ اپنی ہمدردی کا اظہار کیا علی برادران کی گرفتاری پر انہوں نے ایک قطعہ لکھا۔ گاندھی جی کی بھی ان کے دل میں بڑی وقعت تھی، چنانچہ جب ایک اینگلو انڈین اخبار نے گاندھی جی کے خلاف ایک کارٹون اس طرح کا شائع کیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہندوستان کو غرقاب کر دیں گے۔ تو اقبال نے اس کے جواب میں فارسی کا یہ قطعہ لکھا:-

بیا را بزم بر ساحل کہ آنجا
نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش درآویز
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

(یعنی ساحل پر اپنی بزم نہ آراستہ کرو اس لئے کہ وہاں زندگی کی آواز بہت دھیمی ہوتی ہے، سمندر میں کود پڑو اور اس کی موجوں میں مل جاؤ، اس لئے کہ دائمی زندگی جد و جہد میں پوشیدہ ہے)

مصطفےٰ کمال پاشا کی رہنمائی میں جب ترکوں نے یونانیوں کو شکست دے کر ایشیائے کوچک اور استنبول سے نکال باہر کیا، اور ایک آزاد جمہوری ریاست کی بنیاد رکھی، اس وقت اقبال نے اپنی نظم طلوعِ اسلام لکھی۔ یہ نظم اقبال کی طویل اردو نظموں میں غالباً سب سے اچھی ہے، اس نظم میں امید اور مسرت کے جذبہ کے ساتھ ساتھ جمہوریت، مساوات کی تلقین کی گئی ہے۔ خضرِ راہ میں اقبال نے انقلابِ روس کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دوریِ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک

طلوعِ اسلام میں انہوں نے شہنشاہیت کی بنیادی کمزوری کا ذکر کر کے

محکوم قوموں اور دنیا کے مظلوموں کو بشارت دی کہ نئے دور انسانیت میں فتح ان کی ہوگی، انہوں نے سرمایہ داری اور ملوکیت کی ان الفاظ میں مذمت کی :-

تمیز بندہ و آقا فساد آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اور اس بے انصافی کے نظام کو مٹانے کی یہ تدبیر بتائی

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

فکر ونظر کی بلندی

تحریک ترک موالات اور خلافت کے بعد اقبال کے فکری کلام کا دور زور و شور سے شروع ہوتا ہے۔ اقبال کا نظریہ حیات اور ان کی بہترین فکر ہمیں اسی کلام میں ملتی ہے، انہوں نے اسلام کا ایک نیا اور ترقی پسند تصور مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جو مروجہ اسلامی تصور سے بہت مختلف تھا۔ اقبال کے نزدیک رنگ، نسل اور خون کے امتیاز کی وجہ سے کسی قوم یا شخص کو بڑا یا چھوٹا سمجھنا غلط ہے، انہوں نے شہنشاہیت، ملوکیت، سرمایہ داری اور جاگیرداری کو بھی اسلامی تعلیم کے خلاف قرار دیا۔ انہوں نے غلامی اور محکومی کو انسان کے لئے بدترین لعنت قرار دیا۔ انہوں نے ملاؤں کی رسم پرستی کی سخت مذمت کی، انہوں نے کہا کہ جمہوریت، اخوت، مساوات اور آزادی کی بنیاد پر انسانی سماج کی تعمیر ہونی چاہئے۔ اس مقصد کو حل کرنے کے لئے انہوں نے انسانوں کو اپنی روحانی قوت کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے اور نیکی، بھلائی اور انصاف کی راہ میں مسلسل اور ان تھک جدوجہد کرنے کی تلقین کی، انہوں نے اپنی تقریر میں فرمایا :-

"قرآن کی تعلیم ہے کہ زندگی ایک مسلسل تعمیری عمل ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر عہد کو اپنے پہلے کے زمانے سے سبق حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بھی اجازت ہونی چاہئے کہ وہ اپنے مخصوص مسائل کو بغیر کسی رکاوٹ کے حل کرے"

چونکہ اقبال زندگی کو تغیر پذیر اور مسلسل بدلتی اور ترقی کرتی ہوئی سمجھتے تھے، اسی لئے ہم ان کی شاعری میں حالات کے تقاضے کے مطابق ایک تدریجی تبدیلی اور ترقی دیکھتے ہیں، اسی وجہ سے ان کا کلام نیا نے دمل کا ایک زندہ جاوید پیام بن گیا ہے، اس میں شک نہیں کہ وہ سماج جو اقبال کا نصب العین تھا اشتراکی نصب العین سے بہت ملتا جلتا ہے یہی سبب ہے کہ جہاں اس مفکر اعظم نے ہندوستان کے مسئلہ آزادی کا حل ۱۹۳۰ء میں یہ بتایا کہ مسلمانوں کو ان کے مخصوص علاقوں میں اپنی آزاد حکومت قائم کرنے کا حق ملے، تاکہ پھر وہ باقی ہندوستان کے ساتھ مل کر مشترک آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیں۔ وہاں "خدا کی طرف سے" فرشتوں کو یہ انقلابی پیغام بھی دیا کہ :-

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو

انہوں نے دنیا کے محنت کشوں اور محکوموں کو یہ بشارت بھی دی کہ :-

با ضعیفاں گاہ نیروئے پلنگاں می دہند
شعلۂ شاید بروں آید ز فانوس حباب
انقلاب
انقلاب اے انقلاب

(کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کمزوروں کو شیروں کی سی طاقت دی جاتی ہے اور حباب کی فانوس سے بھی شعلہ نکل پڑتا ہے)

آج ہم اپنی آنکھوں سے اس مبارک پیشین گوئی کو سچا ثابت ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، مختلف قوموں، نسلوں، مذاہب اور عقیدوں پر مشتمل دنیا کی پہلی مزدوروں اور کسانوں اور دوسرے محنت کشوں کی جمہوری ریاست کامیابی سے فتح یاب ہو رہی ہے، جمہوریت کا پرچم ہر ملک میں بلند ہو رہا ہے، جبر و ظلم، شہنشاہیت و استبداد کی طاقتیں زوال پذیر ہیں، ہر ملک میں عوام منظم و متحد ہو کر اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں، اور وہ دن دور نہیں رہ گیا جس کا خواب اقبال نے یوں دیکھا تھا۔

فروغ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکب تقدیر ما گردوں شود روزے
خیال ما کہ او را پرورش کردند طوفانہا
ز گرداب سپہر نیلگوں بیروں شود روزے

(ایک دن ایسا آئے گا جب خاکی انسانوں کا فروغ نورانی فرشتوں سے بھی زیادہ ہو جائے گا، اور یہ زمین ہماری تقدیر کے ستارے کی گردش سے آسمان بن جائے گی ــــ اور ہمارا خیال جس کی پرورش طوفان نے کی ہے ایک دن اس نیلے آسمان کی بھنور سے بھی باہر نکل جائے گی)۔

www.taemeernews.com

کیلیں

قیصی رامپوری

کیلیں ہی کیلیں تھیں ہر طرف۔ ہر پگڈنڈی پر، ہر راستے پر سڑک پہ اور ہر شاہراہ پر موٹی موٹی مضبوط مضبوط بڑی نوکیلی۔

ان کیلوں کے بڑے بڑے کارخانے تھے۔ جنا دری درکشاپ ان کے لئے ہر ملک سے آ ... لاکھوں ٹن اتنا ہی کوئلہ اور صدہا مشینیں جن پر بڑے بڑے کاریگر رات دن کام کرتے رہتے تھے۔ ان کے پاس جیت ناک سائنس کی ڈگریاں تھیں، خود سوز دار التجارب۔ ان کیلوں کے ڈیزائینر بھی بڑے قابل لوگ تھے جو کاغذ پر ڈیزائن نہیں بناتے تھے بلکہ دماغوں میں بناتے تھے۔ دماغ کی ایک ایک رگ میں ایک ایک شریان ہیں۔

ڈیزائن کا فن حاصل کرنے کیلئے ولایت جانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ خدا کے ان کی رات دن کی زندگیوں میں بھرے ہوئے تھے۔ گھر کی زندگی میں۔ گھر کے باہر کی زندگی میں۔ محلے کی زندگی میں، جماعت کی زندگی میں، ذات پات کی زندگی میں، مذہب کی زندگی میں اور سیاست کی زندگی میں۔ انہی زندگیوں میں سے ڈیزائن اٹھتے تھے۔ احساسات کی جراحت مشاعر کی توڑ مروڑ، عقائد کا پیچ و تاب بہترین ڈیزائن پیش کرتا تھا۔ بعض ذاتی ملکی و قومی اغراض و نفع جوئی نے ان کیلوں کو ایسی نوکیں بخشی تھیں کہ ان پر پڑ کر نگاہ بھی زخمی ہو جاتی تھی۔

ان کیلوں کے کارخانے پہلے تو زیادہ تعداد میں نہیں تھے مگر جیسے جیسے افراد میں تہذیب اور علم و فضل پھیلتے گئے کارخانوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اور جب افراد یعنی ہم اور آپ بہت ہی مہذب، شائستہ عالم ہمہ دان بن گئے تو ان کارخانوں کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص کا سینہ ایک مکمل کارخانہ بن گیا تھا اور یہ تنہا کارخانہ لاکھوں کی تعداد میں کیلیں بنانے لگا۔ اب لوہے کی ضرورت نہ رہی اس کی جگہ کینہ و تعصب کے بخار کو دل کے تہ خانوں میں جمع کر لیا گیا۔ عزم کا آہن جسم کی رگ رگ میں پیدا ہو چکا تھا چنانچہ چند دنوں میں سینے کی بھٹی میں سے صدہا کیلیں ابل ابل کر نکلنے لگیں۔ اور ہر طرف اس قدر کثرت سے بکھر گئیں کہ راہ چلنا دو بھر ہو گیا۔

راہیں بند ہو گئیں لوگ گھبرا اٹھے اور کیل سازوں کو بد دعائیں دینے لگے مگر شاید وہ بھول گئے تھے کہ کیل سازی میں ہر شخص کا حصہ رہا ہے اب جبکہ راستہ چلنا مشکل ہو گیا ہے تو اس نادانستہ برائی کے ذمہ دار وہ خود بھی ہیں۔

خود انتفاعی، انانیت، تعصب، اغراض بینی، اپنی بالا دستی وغیرہ کی یہ بھیانک کیلیں جب ہر شخص کے پیروں کو زخمی کرنے لگیں تو لوگ چیخ اٹھے۔ ادھر ادھر دوڑے مگر جس قدر انھوں نے دوڑ لگائی اسی قدر ان کے تلوے زخمی ہوئے۔ آخر گراؤنڈ کا لفرنسوں کا خیال آیا، بڑی بڑی سبھائیں بلانے کی سوجھی اور خوب سوجھی۔ ان سبھاؤں کے پردھان وہی لوگ تھے جنہوں نے سب سے زیادہ بھاگ دوڑ کی تھی اور سب سے زیادہ زخمی ہوئے تھے۔ انھوں نے تمام دنیا کی تکلیف کا بھی خیال کیا کیونکہ پیرا ور دنیا والوں کو بھی ملے تھے اور کیلوں سے بھری ہوئی ان تمام راہوں پر ان کو بھی چلنا پڑتا تھا۔ اسلئے ان پردھانوں نے بڑی ہمدردی و محبت سے اعلان کیا کہ ہم اپنی مجالس میں ایسی تدابیر —— عملی تدابیر اختیار کر رہے ہیں کہ اس چوطرف پھیلے ہوئے "کیل زار" کا خاتمہ ہو جائیگا۔ ہم جڑ سے چن چن کر ایک ایک کیل اکھاڑ پھینکیں گے تاکہ تمام دنیا والے پھر آسانی سے جس راہ پر چلنا چاہیں بغیر تلوے زخمی کئے چل سکیں۔

یہ پردھان مہا پنڈت بھی تھے۔ ان کے دل کی آنکھیں ظاہری آنکھوں سے زیادہ کھلی ہوئی تھیں اور دماغ —— دماغ تو ان کو ایسا ملا تھا کہ ان کی ذکاوت کو دیکھ کر اقبال بھی جنت میں بیٹھے ہوئے اپنے شعر

کہ از مغز دو صد —— الخ

پر نظر ثانی کرنے کی سخت ضرورت محسوس کر رہے تھے۔

بہر نوع ان قابل و مقتدر لوگوں نے کیلیں اکھاڑنے کا مبارک کام شروع کر دیا۔ مگر ان کے تعجب کی انتہا نہ تھی وہ حیران رہ گئے۔ کیا

www.taemeernews.com

دیکھتے ہیں کہ ایک کیل کو اکھاڑتے ہیں تو اس کے نیچے سے دوسری اس سے بھی تیز نکل آتی ہے۔ اس پر ہتھوڑا مارتے ہیں تو تیسری۔ درخت کے کٹے ہوئے تنوں پر کئی بارشیں گذرنے کے بعد کہیں جان پڑتی ہے۔ مگر یہ کمبخت کیلیں تو اس قدر "زود خیز" تھیں کہ ان پر انسان کے لہو کی ایک بوند گری یا پسینہ ہی ٹپکا کہ زمین سے پیدا ہو گئیں، ابھر آئیں۔ تعجب کی بات کیا تھی۔ کہاں قدرت کے کروڑوں صدی کے فرسودہ قوانین کی مسلسل بارش ہو تو کہیں جاکر زمین پر دوب اگتی ہے اور کہاں سائنس کا "خدا بر طرف کن" جدید عمل کہ بغیر کن یا مکن کہے عالم کے عالم تباہ کرکے رکھدے۔

ان پردھانوں نے کیلوں کی بغاوت کو دیکھ کر آپس میں مشورہ کیا کہ لعنت بھیجو ان پر۔ جب ہمنے انکو بویا ہے تو ان کے پھل بھی ہمکو کاٹنے پڑیں گے۔ چنانچہ انھوں نے تمام ملکوں سے گھاس پھوس لاکر اس کا ذخیرہ کیا اور اس کی دبیز دبیز بوریاں بنا کر تمام کیلوں پر پھیلادیں اس کے بعد نہایت مسرت سے زمانہ کو یہ خوشخبری سنادی کہ نوکیلی کیلوں کا خاتمہ کر دیا گیا ہے، تمہاری روزانہ کی زندگی کا دروازہ کھولدیا گیا ہے، سب راستے صاف ہو گئے ہیں خوب چلو پھرو۔ اب پیروں کے زخمی ہونے کا کوئی خوف نہیں ہے۔

لوگ کیلوں سے تنگ آکر عرصے سے باہر نکلنا ترک کئے بیٹھے تھے معیشت ڈوب چلی تھی اور زندگی کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ اس مژدۂ حیات بخش کو سنتے ہی لوگ مسرت کی چیخیں مارتے ہوئے اور قلابازیں بھرتے ہوئے بھیانک کیلوں سے بھرے ہوئے زندگی کے راستوں پہ دوڑ لگانے لگے اور ان کو کس قدر اطمینان و سکون محسوس ہوا جب اس خوشی کی کود پھاند میں ان کے تلووں میں ایک کیل بھی نہ چبھی۔ واہ رے پردھانوں کمال کر دیا۔ راستے کیسے صاف کر دئے ہیں کہ اب نہ تو کسی خلش کا خوف رہا نہ چبھن کا ڈر۔

اسی لئے تو کند ذہن ناتراش عوام کا گزارا بغیر پردھان کے ناممکن ہے۔ ہم اپنے طور پر سینکڑوں باتیں سوچتے ہیں مگر اپج اور ایجاد کا مادہ ہمارے اندر نام کو نہیں ہے۔ مخترع دماغ ہی نہیں پایا ہے ہمنے ہاں ایک دل کمبخت تو ایسا ہے کہ کسی کے میٹھے بول سنے نہیں کہ حریر کی طرح فوراً ملائم پڑ جاتے ہیں۔ مگر اس موجود بوجھ کی دنیا میں اب دل کی ضرورت نہیں اگر ہے تو صرف اس قدر کہ فریادی قبر پہ چڑھاوا چڑھانے کے کام آئے۔ اب تو سائنٹیفک دماغ کی ضرورت ہے جو تڑپتی ہوئی حیات اور خون کے آنسو روتی ہوئی زندگی کی خاطر رحم و مروت کے ہاتھوں نہ بک جائے بلکہ ہر پکار کو متبد سیاست کے کانوں سے سنے اور سائنٹیفک طریقے سے دیکھے۔

پھر یہ غریب، یہ مزدور، یہ مفلس، یہ نادار تو ہمیشہ سے انسانیت کی پیشانی پہ ایک داغ رہے ہیں۔ بھلے آدمی کوئی چیز ایجاد کرنا جانتے ہی نہیں اگر جانتے ہیں تو صرف اپنی فاقہ مستی کے عالم میں غیر سائنٹیفک طریقے سے کثیر تعداد میں "ننگ سائنس" بچے پیدا کرنا ——

خیر شکر ہے کہ دانایانِ عالم ان پردھانوں نے اب آدمیت کی اس مسخ جماعت کو بھی سنبھال لیا ہے بلکہ اسکو حکومت دینے کی حماقت کا تہیہ بھی کر لیا ہے۔ خدا خوش رکھے کیسے اچھے ہیں ہمارے مربی!

آخر کوئی بات تھی کہ ان عظیم المرتبت پردھانوں کے ہوتے ہوئے کیلیں باقی رہ جاتیں۔ وہ مٹیں اور ایسی مٹیں کہ گھاس پھوس کو چھید کر سر ابھارنے کے قابل نہ رہیں۔ اب ان بوریوں کے نیچے پڑی ہوں تو پڑی رہیں۔ آپ زنگ چاٹ کر گل سڑ جائیں گی۔ اس وقت تو ان کے خاتمہ پر ایک جشن عام منانا چاہئے۔ خوب خوشیاں منانی چاہئیں۔

چنانچہ خدا کا شکر ہے کہ ہمنے سب سے پہلے مسجدوں اور مندروں میں جشن کا پروگرام پورا کیا کیونکہ یہی دو ایسے مقامات ہیں جہاں سے کیلیں زیادہ ابھرتی ہیں۔ نہیں بلکہ بنتی ہیں۔ عوام مساجد اور مندروں میں کھنچ آئے خدا کی تو روز ہی پوجا یہاں ہوتی رہتی ہے آج محسن پردھانوں کا حکم بلند ہونا ضروری تھا۔ لہٰذا انسانیت کے ان محسنین کے ذکر خیر سے چند ہی منٹ میں تمام عبادت گاہوں کو ٹاؤن ہال کی رونق دی گئی اور وہاں وہ کر دیا جو وقت کا عین اقتضا تھا۔

ایک قابل سپاس گزار صاحب نے کیلوں کے ملیا میٹ ہونے پر عقیدت میں ڈوبی ہوئی بڑی جاندار تقریر کی۔ تہنیت کی نظمیں پڑھی گئیں اور پھر زوردار تقریریں ہوئیں۔ کیلوں کے خاتمین کے ان بہترین ترجمان نے تقریر ختم کی تو فتح و کامرانی سے ان کا چہرہ گلنار ہو گیا اور ان کے اس وقت کے اظہار اطمینان سے لاکھوں انسانوں نے یہ اندازہ لگایا کہ ان صاحب کے کبھی کوئی کیل نہیں چبھی تھی اور اگر کبھی چبھی تو دیوانی تاریکی کو بھول کر اس وقت ایسا ہی محسوس کر رہا تھا کہ وہ بھی ہمیشہ کیلوں سے محفوظ رہا ہے۔

اختتام تقریر کے بعد ایک بیوقوف سا انسان اٹھ کر مقرر صاحب کے پاس ڈرتا ڈرتا گیا اور ان سے بولا۔

"صاحب یہ تو سب کچھ ہو گیا۔ پر معافی چاہتا ہوں مجھے آپ نے یہ نہیں بتایا کہ یہ کنٹرول آخر کب ختم ہوگا؟"

"کنٹرول!" مقرر صاحب نے ابرو پر بل ڈال کر کہا۔ "ابھی یہ تو بہت ہی فائدہ کی چیز ہے۔" انھوں نے پھر فرمایا۔

"اچھا!" بیچارے بیوقوف انسان نے اپنے سوال پر نادم ہو کر کہا۔ مقرر صاحب نے کنٹرول کے خیر و برکات کے بارے میں جو فرمایا تھا وہ اسکو ماننا پڑا۔ حالانکہ اس کا اور اس جیسے لاکھوں انسانوں کا تجربہ یہ تھا کہ والدین سے زیادہ شفیق حکومت اور خوش وقت تاجروں نے کنٹرول کو وہ نہیں بننے دیا جو وہ بننا چاہتا تھا۔

اس بیچارے بیوقوف نے اور اسکے ساتھ والے لاکھوں آدمیوں نے کنٹرول سے بڑی شدید تکالیف اٹھائی تھیں یہ بھی ایک بڑی موٹی کہانی تھی لیکن اس وقت مقرر صاحب کے فرمانے سے وہ اپنے تجربات مصائب کے باوجود مان گیا کہ کنٹرول نعمت ہے۔ کہیں ختم ہو گئی ہیں اور جو اس وقت اظہار مسرت نہیں کرتا وہ کفران نعمت کر رہا ہے۔

اوہ اسے کون دیکھتا ہے ———— یہ ہمیشہ لڑنے والی معیشتیں اور دائمی ٹکرانے والی انسان کی جماعتی غرضیں، وہ قومی مفاد کی آندھیاں اور "سب کچھ میرے لئے" کی رگڑیں یہ نہ کبھی رکی ہیں نہ رکیں گی۔ ہوتے جائیں ٹکریں، چلی جائیں رگڑیں ———— مگر دیکھنا کیلوں پر گھاس پھوس بچھی ہوئی ہے۔ ہر چند بیزرتہ ہے اس کی۔ لیکن یہ ٹکروں اور رگڑوں کے شرارے اس کے نیچے گھاس پھوس اور اس کے نیچے پھر وہی کمبخت کیلیں۔

اپاہج

قیسی رامپوری کا مشہور ناول جو عشق و محبت کی بیکراں وسعتوں کو اپنے میں لئے ہوئے ہے قیمت ۲ عہ

نگارستان اکیڈیمی اردو بازار دہلی

آہنگ نو

آثر جلیلی چشتی

تا کجا شکوۂ نیرنگیٔ دوراں کرتا
تا کجا، آخر نہ کہاں تک ... بیگ بیاں کرتا

تا کجا طعنۂ بے مائیگی دل سہتا
تا کجا آرزوئے گنج فراواں کرتا

باہمہ پختگیٔ عزم فلک رس کب تک
انتظار کرم و لطف عزیزاں کرتا

تا کجے محو غم عمر گریزاں رہتا
تا کجے جستجوئے چشمۂ حیواں کرتا

تا کجا بستۂ تحقیر و مذلت رہتا
تا کجا مدحت اورنگ سلیماں کرتا

کب تک آسودۂ بے کیفیٔ ساحل رہتا
کب تک اندیشۂ جباریٔ طوفاں کرتا

ہاں کہاں تک نگہ مہر کی کرتا حسرت
ہاں کہاں تک طلب منت و احساں کرتا

قوت خفتہ کو پیغام عمل دوں تو سہی
رنگ نیرنگیٔ ایام بدل دوں تو سہی

www.taemeernews.com

احساسِ ندامت

(جناب عباس ایڈیٹر آواز کی نذر)

ایم اسلم

ایک روز عباس اور میں جیب دیا پر سے واپس آئے تو میں آتے ہی صوفے پر لیٹ گیا اور عباس ریڈیو کھول بیٹھا۔ اس وقت ہندوستان کی مشہور مغنیہ انوری بائی آگرے والی مائیکروفون پر گا رہی تھی۔ "دل کی ہم نے بات کیوں مانی۔ ہائے محبت ہائے جوانی"

عباس کہنے لگا۔

"کچھ اسی قسم کی ملتی جلتی ایک غزل شاد نے بھی لکھی ہے۔ ؎

"اف ری جوانی ہائے زمانے"!

"میرے یار!" میں نے کہا۔ ذرا چپکے بیٹھے رہو پہلے گانا سنو پھر تنقید بھی کر لینا۔" لیکن عباس ہنس کر بولا

"کوئی افسانہ سوجھ رہا ہے کیا؟ موضوع تو ایسا ہی ہے"

اور نوکر نے آکر کہا۔

"چائے تیار ہے جناب!"

عباس کرسی سے اٹھا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

"آواز تو کھانے والے کمرے میں بھی سنائی دے گی۔ آئیے!"

"تمہاری تو وہی بات ہے عباس!" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ادھر چلے آگئے رونا آنکھوں کا زبان!" ہم دونوں کھانے والے کمرے میں جا بیٹھے۔

"انوری بائی کا گانا بہت پسند ہے آپ کو" عباس نے توس پر مکھن لگاتے ہوئے پوچھا "گاتی تو واقعی بہت اچھا ہے۔ لیکن بیمار رہتی ہے غریب"

"واقعی؟" میں نے پوچھا "یقین ہے تمہیں؟"

"آپ کا کیا خیال ہے؟" عباس نے پوچھا۔

"میرا خیال تو یہ ہے کہ بڑے کور ذوق ہو تم" میں نے چائے پیالی میں ڈالتے ہوئے کہا۔ اور عباس مسکرا کر بولا۔

"جہاں ایک بھلے مانس کو صبح صبح تین ساڑھے تین میل کا چکر لگانا پڑ جائے اس سے کوئی ذوق کی بات کرنا بھی کم ذوقی سے کم نہیں۔"

"یہ تو تم نے بالکل ٹھیک کہا" میں نے پنیر کا ٹکڑا کاٹتے ہوئے کہا "بیل کو اگر کام نہ ہو تو اسے کھانے کے سوا اور کچھ نہیں سوجھتا"

عباس نے میری طرف دیکھا اور حسب عادت ہنس دیا۔

میرا عزیز دوست عباس تو مزے سے چائے پی رہا تھا اور میرا دھیان گانے والی کی طرف تھا۔ پھر انوری بائی آگرے والی جیسی باکمال مغنیہ!

آپ جانئے! میرے دل کچھ ایسا حساس واقع ہوا ہے کہ کوئی اچھا گانے والا ہو تو اس کی آواز کا میرے دل و دماغ پر ایک خاص اثر پڑتا ہے۔ اور یہ اثر بہت دیر تک رہتا ہے۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" عباس نے دانتوں سے گوشت کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"یہی!" میں نے جواب دیا "کہ بدذاقوں کی تخلیق سے دنیا کے کون سے کام سنور رہے ہیں" عباس پھر ایک بار صرف مسکرا دیا۔

"کچھ جواب تو دو" میں نے کہا۔

"آپ یہ بتلائیے" عباس نے مسکرا کر پوچھا "کہ دل کی بات ماننے کے بعد پریشانی اور ندامت کیوں ہوتی ہے۔ اس مصرع سے بھی اس بات کا اظہار ہو رہا تھا۔ ؎

"دل کی ہم نے بات کیوں مانی۔ ہائے محبت ہائے جوانی"

اور اس وقت آپ کے چہرے سے بھی مجھے کچھ ایسا ہی نظر آ رہا ہے"

"بھئی واہ!" میں نے ہنس کر کہا "بہت دور کی کوڑی لائے تم۔ آج سے الہام ہونے کا اعلان کر دو عباس!"

"پھر کیا ہوگا؟" عباس نے پوچھا

"پانچوں گھی میں" میں نے جواب دیا۔

عباس نے ہنس کر کہا۔

"اور سر کڑھائی میں"

میں نے کہا۔

www.taemeernews.com

"عباس! دنیا بے وقوفوں سے خالی نہیں۔ اگر پہلے ہی مہینے تنخواہ سے زیادہ روپے نہ ملیں تو جو کچھ پیمانہ بھر دوں گا"

عباس پھر ہنسنے لگا۔ میں نے پوچھا۔

"دیکھو! سچ کہنا کبھی تمہیں بھی دل کی بات ماننے پر افسوس ہوا۔؟"

"مجھے صرف اتنا افسوس ہے" عباس نے ہاتھ سے ... کرتے ہوئے کہا "کہ مجھے دل کی بات ماننے کا کبھی موقع ہی نہیں ملا"

چائے ختم کرنے کے بعد ہم پھر ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ میں کرسی پر عباس صوفے پر۔ اس وقت کوئی لالہ جی تان سین کی دم میں ریکارڈ فون پر کھڑے نمدا باندھ رہے تھے اور عجب بے ڈھنگی آواز سے کوئی بھجن ارشاد فرما رہے تھے وہ کہنا کر گا رہے تھے میرے خیال میں گانے کی توہین ہے۔

"دیکھ لیجئے! عباس مسکرا کر بولا "بینڈ کی کوز کام ہو رہا ہے"

میں نے اٹھ کر ریڈیو بند کر دیا اور کہا۔

ان ریڈیو والوں سے خدا ہی سمجھے۔ انور جیسی مغنیہ کے بعد اس قسم کا گانا سنوانا ہر گانے والے کی توہین ہے۔ بے مزا کر دیا کم بختوں نے"

اور عباس نے مسکرا کر کہا۔

خدا کرے کہ اس بدمزگی میں آپ وہ دل کی بات ماننے کا واقعہ بھول جائیں کہیں"

"ارے بابا" میں نے کہا "میرا تو کوئی واقعہ نہیں۔ بات یہ ہے کہ مغنیہ نے اپنی دلاویز طرز ادا سے اور شاعر نے مضمون باندھ کر ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا کہ مجھے اس وقت کبھی کی ایک بات یاد آ گئی"

"خدا کی قسم!" عباس نے کہا "یہی بات میرے دل میں تھی"

"رہنے دو میرے یار!" میں نے کہا "تمہارے دل کی باتیں مجھ سے چھپی نہیں۔ ہاں اگر تم چاہو تو یہ واقعہ میں تمہیں سنا سکتا ہوں"

"زہے قسمت!" عباس نے کہا "سنائیے پھر"

"عباس!" میں نے کہا "یہ تو تم نے بھی سنا ہوگا کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ اب اس اندھی محبت کا ہی ایک واقعہ سنیے۔ دو ایک سال ہوئے میں تبدیل آب و ہوا کے لئے ایک پہاڑی مقام پر گیا ہوا تھا۔ کہیں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں کہیں فلک پیما پہاڑ۔ کہیں سبزہ تھا کہیں بے برگ و گیاہ چٹانیں تھیں۔ کہیں کوئی ندی شباب کی مستیوں کے ساتھ اچھلتی کودتی جنگلوں اور کہساروں سے دل لگی کرتی گذرتی تھی۔ کہیں کوئی چشمہ زندگی کی منزلیں طے کرتا نظر آتا تھا کہیں خود رو پھولوں کی بیلیں دامن دل کو تمام ہوا میں لیتی تھیں۔ اور ان اداس ویرانوں میں یہ نازک اور خوبصورت پھول اپنی قدر و قیمت سے اس طرح بے خبر معلوم ہوتے تھے جیسے وہ بدنصیب حسینہ جو کسی مفلس کے گھر میں پروان چڑھ کر کسی مفلس کی آغوش میں زندگی کے دن گذار رہی ہو۔

انہی جنگلوں اور پہاڑوں میں دہقانوں کے دو دو چار چار گھر بھی کہیں کہیں نظر آ جاتے۔ اور گھروں کے قرب و جوار میں چھوٹی چھوٹی ہری بھری لہلہاتی ہوئی کیاریاں تھیں جن پر ان کی زندگی کا انحصار تھا۔ لیکن تم یہ سن کر تعجب کرو گے کہ ہر گھر میں خوشحالی اور قناعت کی سہانی جھلک بھی نظر آتی تھی۔ اب رہا یہاں کا موسم تو گرمی ہو یا سردی موسم ہمیشہ خوشگوار رہتا ہے۔ اور یہ علاقہ ایک بہت صحت افزا مقام سمجھا جاتا ہے۔ وہ لوگ جنہیں خاموشی اور تنہائی پسند ہو ان کے لئے یہ جگہ بہت موزوں ہے۔ اور میں بھی اسی وجہ سے بہت دنوں سے یہاں مقیم تھا۔ یہاں میرا وقت عموماً شکار اور گھومنا گھامی میں بسر ہوتا۔

"یعنی!" عباس ہنس کر بولا "وہی پرانا مرض"

"جی ہاں!" میں نے جواب دیا "وہی پرانا مرض۔ تو خیر! اس علاقے میں اور بھی کئی آدمی کوئی میری طرح اکیلا۔ کوئی بال بچوں کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ زمینداروں نے اپنے گھروں کے آس پاس چھوٹے چھوٹے بنگلہ نما مکان بنائے ہوئے تھے۔ یہ مکان بہت صاف ستھرے اور ہوادار تھے۔ اور واجبی کرایہ پر مل جاتے تھے۔ کھانے پینے کا سب سامان تازہ بتازہ مل جاتا تھا۔ چونکہ زمینداروں کی یہ بستیاں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھیں اس لئے باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو آپس میں ملنے جلنے کا بہت کم موقع ملتا۔

میرا مکان اتنا بڑا تھا کہ دو کنبے اس میں آسانی سے رہ سکتے

www.taemeernews.com

تھے۔ میرے استعمال میں صرف دو کمرے تھے باقی مکان خالی پڑا تھا۔ برآمدے سے منظرِ دشت و جبل بہت اچھا نظر آتا تھا۔ خاص کر شام کے وقت جب کائنات پر ایک اداسی سی چھا جاتی تھی۔ میرے پاس بیٹری سے چلنے والا ایک ریڈیو سیٹ بھی تھا۔ جو ان سادہ لوح دیہاتیوں کے لئے ایک بہت بڑا عجوبہ تھا۔ آواز کے متعلق ان لوگوں کے نظریے سن کر بعض اوقات مجھے بے ساختہ ہنسی آجاتی۔ یہ لوگ فلمی ریکارڈ بہت شوق سے سنتے۔

ایک روز اس بستی کا چودھری رام سروپ جو ایک معزز اور بڑا شریف راجپوت تھا اور لوگ اسے یہاں رام سروپ کہتے تھے مجھ سے کہنے لگا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو نصف مکان میں کسی اور کو دیدوں آپ تو استعمال کرتے نہیں"۔

"ہاں! ہاں!" میں نے جواب دیا۔ "دیدو۔ نصف سے زیادہ تو خالی ہی پڑا ہے"۔

"آپ کو تکلیف تو نہ ہوگی" اس نے پھر پوچھا۔

"ہرگز نہیں" میں نے کہا۔ "کون مانگتا ہے"۔

"دو عورتیں ہیں اور ایک مرد ہے جو غالباً نوکر ہے" رام سروپ نے جواب دیا۔

"آج ہی آئے ہیں کیا؟" میں نے پوچھا۔

"آئے تو بہت دن ہوگئے" رام سروپ نے جواب دیا۔ "لیکن جہاں قیام ہے وہ جگہ انہیں پسند نہیں"۔

تو خیر دوسرے روز دوپہر کے بعد یہ نیا قافلہ بھی اسی منزل پر آ اترا جہاں میں ڈیرا ڈالے بیٹھا تھا۔ جیسے کہ یہاں رام سروپ نے کہا تھا تین ہی آدمی تھے۔ دو عورتیں اور ایک مرد۔ عورتوں میں سے ایک تو کوئی بائیس چوبیس سال کی نوجوان عورت تھی۔ دبلی پتلی سی خوشنما رنگ نرگسی آنکھیں۔ کانوں میں سونے کے حلقہ دار بندے ہاتھوں میں سونے کی باریک باریک چوڑیاں۔ نیلے رنگ کی ساٹن کا چوڑیدار پاجامہ۔ اور اسی رنگ کی پھولدار قمیص۔ سر پے پوری دوپٹہ پاؤں میں سلیم شاہی جوتا۔ نگاہوں میں جادو۔ ہونٹوں پر تبسم اور نرگسی آنکھوں میں سرمہ کی ہلکی سی تحریر۔

میری کرم خوردہ۔ بحر حوادث کے تھپیڑے کھائے ہوئے گفتگو میں تمکنت بھی اور چاپلوسی بھی۔ مرد یہی چالیس پچاس برس کا۔ رونی پکانے والا جیسے والوں کا غلام۔ کچھ اسباب بھی ساتھ تھا اور طور طریق سے ٹھاٹھ بھی ظاہر ہوتا۔ یہ نئے پڑوسی ہر نقطۂ نگاہ سے میرے لئے نئے ہی تھے۔

مشکل یہ آپڑی کہ میں خاموشی اور تنہائی پسند۔ اور میرے نئے پڑوسیوں کو خاموشی اور تنہائی سے جیسے نفرت۔ جب دیکھو بستی کی سب عورتیں اور بچے ان کے پاس بیٹھے ہیں اور سب کے منہ لاؤڈ سپیکر بنے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کو یہاں آئے۔۔۔ ایک روز ہو چکا تھا۔ لیکن ہمیں ایک دوسرے کا "شرف نیاز" حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اور جو سچ پوچھو تو میری آرزو بھی یہی تھی کہ اس کی نوبت ہی نہ آئے اور "من ہر بیگرم تو دیگری" والی ہی بات رہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ اس قسم کی آرزوئیں مشکل سے ہی پوری ہوتی ہیں۔ ایک روز صبح سے بارش ہو رہی تھی میں برآمدے میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا میری جوان پڑوسن اپنے کمرے سے نکل کر میری طرف آئی۔ اور بولی:

"اگر اجازت ہو تو میں بھی ذرا اخبار دیکھ لوں"۔

"ہاں! ہاں!" میں نے اخبار اس کی طرف بڑھا کر کہا۔ "یہ لیجئے!"

"نہیں!" اس نے دوسری کرسی پر سے ایک اخبار جو کئی دن کا تھا اٹھاتے ہوئے کہا۔ "آپ دیکھ لیجئے پہلے میں ابھی یہ دیکھوں گی"۔

"لیکن یہ تو بہت دنوں کا ہے" میں نے کہا۔

"یہاں یہ بھی غنیمت ہے" اس نے دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا اور اخبار دیکھنے لگی۔ نوکر چائے لے آیا۔ اور یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ میں چائے ذرا اہتمام سے پیا کرتا ہوں۔ اور اس جگہ بھی میں نے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ چائے کے ساتھ کھانے کو بھی دو ایک چیزیں اچھی مل جایا کریں۔ چنانچہ آج بھی فرنچ ٹوسٹ۔ پنیر اور تلے ہوئے انڈے تھے۔ میں نے دو پیالیوں میں چائے بنائی اور ایک پیالی اپنی جوان پڑوسن کی طرف بڑھا کر کہا۔

"لیجئے! چائے پیجئے!"

"آداب عرض!" اس نے پیالی میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ پیالی پکڑنے کے انداز میں بھی نزاکت تھی۔

"یہ جنگ کبھی ختم بھی ہو گی؟" اس نے چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "جینا اجیرن ہو رہا ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔ "ہم لوگ تو آرام سے بیٹھے ہیں۔ مصیبت تو ان کے لئے ہیں جن کے گھر برباد ہو رہے ہیں۔"

"آرام سے کیا خاک بیٹھے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "کوئی چیز تو ملتی نہیں۔"

"مل تو سب کچھ رہا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "ہاں! یہ کہئے کہ دام بہت چڑھ گئے ہیں۔ آپ کچھ کھائیے بھی تو۔ یہ انڈے ملاحظ فرمائیے۔"

میری جوان پڑوسن مسکرا کر بولی۔

"آپ مرد بچے ہیں۔ آپ کی ضروریات چونکہ پوری ہو رہی ہیں اس لئے آپ کو تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔" اس نے خالی پلیٹ میں ایک انڈا رکھ لیا اور کہنے لگی۔

"لیکن مصیبت تو ہمارے لئے ہے نہ پوڈر۔ نہ لپ اسٹک نہ اورج۔ نہ پومیڈ۔ نہ شمپو۔ نہ سنٹ۔ نہ کیوٹکس۔ نہ کنگھی۔ جوتے بھی دیسی اور کپڑا بھی دیسی۔ اگر اسی کا نام آرام ہے تو ایسے آرام کو سات سلام! مجھے تو ان دہقانوں پر رشک آتا ہے اس پُر آشوب زمانے میں بھی کیا بے فکری سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مجھے ان لوگوں کی عورتوں سے بات چیت کرنے کا اکثر موقع ملتا ہے لیکن جہاں تک میں دیکھتی ہوں انہیں لڑائی کی نہ کوئی چنتا ہے نہ پریشانی۔"

"گویا!" میں نے پوچھا۔ "آپ کو ان لوگوں کی معاشرت بہت پسند ہے!"

"قابلِ رشک کہئے!" پڑوسن نے جواب دیا۔

"اور اس کے اختیار کرنے میں کونسی چیز مانع ہے آپ کو؟" میں نے پوچھا۔

اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

"اگر آپ سے بھی کوئی یہی سوال کرے تو آپ کیا جواب دیں گے؟" میں نے کہا

"میں سال کے بارہ مہینوں میں سے کم و بیش چار مہینے ان علاقوں میں رہتا ہوں۔"

"آپ ہر سال اسی جگہ آتے ہیں؟" اس نے پوچھا

"نہیں!" میں نے جواب دیا۔ "اس جگہ تو میں کوئی دو سال بعد آیا ہوں۔ اور یہاں آئے بھی مجھے کوئی تین مہینے ہونے کو ہیں۔ لیکن جانے کو جی نہیں چاہتا۔ محض مجبوراً چلا جاتا ہوں۔"

"بال بچوں کی کشش کھینچ لے جاتی ہو گی؟" اس نے پوچھا

"مجھے اس قسم کی کشش کا ابھی تجربہ نہیں ہوا۔" میں نے جواب دیا۔

"شادی نہیں کی ابھی تک؟" پڑوسن نے تعجب سے پوچھا۔

"شادی کچھ ایسی ضروری چیز نہیں!" میں نے ہنس کر کہا۔ شادی کئے بغیر بھی وقت کٹ سکتا ہے۔

"پھر وہی آپ کی بات کہ اگر بیوی آ گئی تو پھر پوڈر۔ اور روج اور لپ اسٹک اور شیمپو۔ اور کیوٹکس اور سنٹ کہاں سے آئے گا اور شاید اسے بھی دیسی جوتا اور دیسی کپڑا ناپسند ہو۔ معاف فرمائیے! آرام سے بیٹھے بٹھائے یہ مفت کا دردِ سر کون مول لے گا۔"

"بس!" وہ ایک دلکش ادا سے سر کو جنبش دے کر بولی "اسی لئے آپ نے ابھی تک شادی نہیں کی یا میں یہ سمجھوں کہ آپ کو عورت سے نفرت ہے۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"مجھے عورت سے تو نفرت ہرگز نہیں۔ لیکن جس بات سے میں ڈرتا ہوں وہ عورت کے نت نئے روز کے تقاضے ہیں۔"

"کیسے تقاضے؟" میری جوان پڑوسن نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہر چیز کا تقاضا۔" میں نے جواب دیا۔ "یہ لاؤ وہ لاؤ۔ یہ نہیں وہ نہیں۔"

"بس!" اس نے پھر اسی دلکش انداز سے سر ہلا کر۔

کچھ دیر اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں پھر وہ اٹھ کر چلی گئی اور اس طرح یہ پہلی ملاقات ختم ہوئی۔

پھر دوسری۔ تیسری اور چوتھی اور ان ملاقاتوں میں اسے

میرے متعلق یہ معلوم ہو گیا کہ میں پنجاب کا رہنے والا ہوں اور اپنے متعلق اس نے یہ بتایا کہ وہ یوپی کی رہنے والی ہے اور تبدیلِ آب و ہوا کے لئے آئی ہے۔ اوران ملاقاتوں میں بھی عورت ہی زیرِ بحث رہی۔ نہ کبھی اس نے مجھ سے میرا نام پتہ پوچھا اور نہ مجھے اس سے یہ معلوم کرنے کی کوئی خاص ضرورت محسوس ہوئی۔ ہاں! اس کی باتوں سے جو بعض وقت وہ بڑی بے باکی سے کہہ دیتی مجھے یہ یقین ہو چلا تھا کہ میری جوان اور طرحدار پڑوسن کو زمانے کا کچھ تجربہ بھی ہے اور وہ زندگی کے سفر میں کسی سے دھوکا یا تکلیف بھی اٹھا چکی ہے۔ اور ایک آزادانہ زندگی بسر کرنے کی خوگر ہے۔

پہلی چار ملاقاتیں تو مکان پر ہوئیں لیکن اس کے بعد وہ کسی وقت میرے ساتھ شکار میں بھی شامل ہو جاتی۔ لیکن جب وہ ساتھ ہوتی تو میں کہیں دور نہ جا سکتا۔"

"لیکن!" عباس نے پوچھا۔ "وہ دوسری عورت بھی تو ساتھ ہوتی ہوگی۔"

"نہیں!" میں نے جواب دیا۔ "اسے صرف گھر کے دھندے سے کام تھا۔ وہ میری پڑوسن کے کسی کام میں دخل نہیں دیتی تھی۔"

"یہ پڑوسن میری پڑوسن۔ جوان پڑوسن اور خوبصورت پڑوسن کی ترکیب بھی آپ نے خوب نکالی ہے۔" عباس نے ہنس کر کہا۔ "بہت پر تکلف رومان معلوم ہوتا ہے۔"

"جناب! میں رومان نہیں بیان کر رہا۔" میں نے کہا۔ "بلکہ ایک واقعہ تم سے کہہ رہا ہوں۔ تو خیر! تو ایک روز جو ہم سیر کو نکلے۔ تو میں نے باتوں باتوں میں کہا کہ یوں تو ہم کوئی دو ہفتے سے ایک دوسرے کے پڑوسی بھی ہیں اور سیر کو بھی مل کر جاتے ہیں۔ لیکن مجھے کم از کم آپ کا نام تو معلوم ہونا چاہیئے۔"

اس نے چلتے چلتے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

"اور اگر میں نہ بتانا چاہوں تو آپ ناراض تو نہ ہونگے؟"

"ہرگز نہیں!" میں نے جواب دیا۔ "مجھے کسی کا راز معلوم کرنے کی کبھی خواہش نہیں ہوئی۔"

"تو پھر میں بھی معافی چاہتی ہوں۔" اس نے آنکھیں جھکا کر کہا۔ "آپ بس یہی سمجھا کریں کہ آپ گھر سے سیر کو نکلے تھے میں اتفاق سے راستے میں مل گئی۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں اور الگ ہو گئے۔ فرمایئے منظور ہے؟"

"واللہ!" عباس بولا۔ "بڑی شاعرانہ بات کہہ گئی! آپ نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے کہا!" مجھے منظور ہے۔

"شکریہ!" پڑوسن نے مسکرا کر کہا۔ "میں کئی دنوں سے آپ کا گہرا مطالعہ کر رہی تھی۔"

اور میں نے ہنس کر پوچھا۔

"پھر میری سرشتِ حیات کی کتاب پسند آئی آپ کو؟"

"بہت پسند آئی!" میری پڑوسن نے بھی مسکرا کر کہا۔ "ہاں! یہ تعجب ضرور ہے کہ آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟"

"تو آپ کا خیال ہے کہ مجھے شادی ضرور کر لینی چاہیئے؟" میں نے پوچھا۔

"شادی تو مرد اور عورت کے ملاپ کا نام ہے؟" اس نے بڑی بے باکی سے کہا۔

"اس کا تو یہ مطلب ہوا؟" میں نے کہا۔ "کہ آپ کو ازدواجی پابندیاں پسند نہیں!" میری جوان پڑوسن نے میری طرف دیکھا اور بولی۔

"میرے خیال میں وہ عورت سب سے زیادہ گنہگار ہے جسے ایک کا ہو کر رہنا پسند نہ ہو۔"

پڑوسن کا یہ جواب اور بھی زیادہ پیچدار تھا۔

ہم اس وقت ایک کھلے میدان میں تھے۔ کہیں سبزہ تھا کہیں جھاڑیاں تھیں۔ میرے کندھے پر بندوق تھی اور میری جوان پڑوسن کے نازک ہاتھ میں سوسنی رنگ کے پھولوں کی ایک نازک سی شاخ تھی اور ندی میری خوبصورت پڑوسن کی کی زلفوں کی طرح بل کھاتی ہوئی میدان میں سے گذرتی تھی اور انہی جھاڑیوں میں سے کہیں ایک چکور کے بولنے کی آواز آ رہی تھی میں جو چلتے چلتے رکا تو پڑوسن نے پوچھا۔

"آپ چکور ماریں گے؟"

"کوشش کروں گا۔" میں نے بندوق سنبھالتے ہوئے کہا۔

www.taemeernews.com

"مت ماریئے اسے۔ شائد جوڑا ہی ہو" پڑوسن نے کہا
میں ندی کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور میری پڑوسن
ہری ہری گھاس پر لیٹ گئی۔ اس کے الفاظ کہ میرے خیال میں وہ
عورت سب سے زیادہ گنہگار ہے جسے ایک کا ہو کر رہنا پسند نہ ہو۔
مجھے کھٹک سے رہے تھے اور غالباً میری چتون سے یہ بات تاڑ گئی
تھی ہنس کر بولی۔
معاف فرمائیے! میں آپ سے کچھ زیادہ بے تکلف ہو رہی
ہوں۔ آپ ناراض تو نہیں"
میں نے علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھا

گیا گم تازہ پروازوں نے اپنا آشیاں لیکن
مناظر دلکشا دکھلا گئی ساحر کی چالاکی

"اور رے ڈوبا بھی تو یہی شوق!" اس نے ایک آہ بھر کر کہا۔
اور میں نے کہا۔
"لیکن جسے دلکشا مناظر دیکھنے کا شوق ہو اسے غم اور فکر کیوں ہو؟"
"ٹھیک ہے!" اس نے سر ہلا کر کہا "کئے کی سزا ایسی ہی کرتی ہے"
اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے قریب جو ایک ستار
رکھا ہے وہ صرف مضراب کی چوٹ کا منتظر ہے۔ جہاں چوٹ لگی
وہیں داستانیں نغمے بن کر فضا میں گونجنے لگیں گی۔ اور میں اس وقت
یہ موقع کھونا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ میری خوبصورت پڑوسن میرے
لئے کبھی تو ایک راز بن جاتی تھی اور کبھی ایک کھلی ہوئی کتاب جس
کے ہر ورق پر ایک داستان غم لکھی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا۔
"آپ کے خیال میں عورت کی سب سے بڑی خواہش
کیا ہوتی ہے؟"
"عزت اور آبرو سے زندگی بسر کرے" اس نے جواب دیا
"اور اس کے لئے وہ اکثر بڑی سے بڑی قربانی بھی کرتی ہے۔ لیکن
عموماً یہ آرزو پوری نہیں ہوتی"
"یعنی!" میں نے پوچھا "مرد بے وفا ہوتا ہے"
"بیشک!" اس نے جواب دیا۔
"سب مرد کیا؟" میں نے پوچھا
"یہ میں نہیں کہہ سکتی" اس نے جواب دیا "لیکن وہ عورت
جو سماج کے نقطۂ نگاہ سے گنہگار اور ذلیل متصور ہوتی ہے وہ اگر
کبھی اس قسم کی خواہش یا آرزو کرے اور گناہ سے بچنے کے لئے
کسی کا سہارا ڈھونڈتی ہے اور اعتبار کرتی ہے تو ننانوے فیصدی
اسے نامرادی سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور اس کے دل پر ایسا
چرکا لگتا ہے کہ پھر اس خیال سے بھی اس کی روح کانپتی ہے"
"لیکن غلط انتخاب کی تو وہ خود ذمہ دار ہوگی" میں نے کہا
"واقعات ہی ایسے ہوتے ہیں کہ وہ صحیح انتخاب نہیں کر سکتی"
اس نے جواب دیا۔
"لیکن گنہگار عورت سے آپ کا کیا مطلب ہے" میں
نے پوچھا۔
"رباب نشاط" اس نے جواب دیا۔
"اوہو" میں نے کہا "معلوم ہوتا ہے آپ کو اس فرقہ سے
بہت ہمدردی ہے۔ لیکن ان عورتوں کو مردوں کی کیا کمی جہاں
شمع جلی چاروں کھونٹ سے پروانے جمع ہو گئے"
"ٹھیک ہے" میری پڑوسن بولی "لیکن شمع پر قربان ہونے
کا مذاق سو میں سے ایک کو بھی تو نہیں ہوتا"
"ممکن ہے یہ درست ہو" میں نے کہا "لیکن اس کی ایک
وجہ بھی تو ہو سکتی ہے"
"کیا؟" اس نے پوچھا۔
"ہو سکتا ہے" میں نے کہا "کہ شمع خود بھی لذت سوز و گداز
سے ناآشنا ہو"
"جی نہیں!" پڑوسن بولی "شمع اگر لذت سوز و گداز سے
محروم ہوتی تو صبح ہونے تک خاکستر پروانہ دیکھ دیکھ کر کلیجہ کیوں جلایا
کرتی"
"کیا کہنے ہیں اس استدلال کے" میں نے کہا "مرد عورت
کو بے وفا کہتا ہے اور عورت مرد کو مطلب پرست کا خطاب دیتی
ہے۔ اس کا فیصلہ کرنا تو بہت مشکل ہے"
"واقعات کی موجودگی میں کچھ مشکل نہیں" پڑوسن نے
جواب دیا۔
"غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے" میں نے کہا!
"غلط فہمی کا احتمال اس وقت ہوتا ہے جب بات مبہم
ہو" پڑوسن بولی "ایک ایسا ہی واقعہ مجھے بھی معلوم ہے سنیے گا؟"

www.taemeernews.com

"ضرور!" میں نے جواب دیا۔

پڑوسن اٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی۔

"یہ ایک ایسی عورت کا واقعہ ہے جو آپ اور سماج کی نگاہوں میں گردن زدنی متصور ہوتی ہے۔ لیکن آپ مجھ سے یہ مت پوچھئے کہ مجھے یہ سب باتیں معلوم کیسے ہوئیں۔ یا وہ کون تھی اور اس کا نام کیا تھا۔"

"لیکن!" میں نے کہا۔ "نام کے بغیر کیا لطف آئے گا۔"

"اچھا!" پڑوسن بولی۔ "آپ اسے سوسن ہی کہہ لیجئے۔ سوسن کی عمر بائیس چوبیس کے لگ بھگ تھی اور اگر صرف گوری چٹی رنگت کا نام حسن نہیں تو سوسن ہر نقطۂ نظر سے حسین تھی اور اتنا اچھا گاتی تھی کہ بیٹھے اپنے گانا سن کے آگے پانی بھرتے تھے۔ لیکن مطلب پرستوں سے اسے سخت نفرت تھی۔ قدرت نے اسے فن عطا کیا تھا اور فن کے ساتھ اس کی آواز میں سوز اور درد تھا۔ ایام زندگی بڑے مصیبت سے گذر رہے تھے۔ سوسن اگرچہ ایک پیشہ ور گھرانے میں پیدا ہوئی اور ایک مسموم فضا میں پل کر جوان ہوئی لیکن اسے اس پیشے کے نام سے بھی گھن آتی تھی۔ میں یہ نہیں کہتی کہ وہ بالکل پاکدامن تھی۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ اس کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ کسی ایک کی ہو کر رہے۔ اور اسے ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جو اسے پاپ کی نگری سے نکال لے جائے۔ اور اس کے لئے وہ بڑی سے بڑی قربانی کرنے کو بھی تیار تھی۔ اس کے ساتھ مل کر گھر بسا کر رہنے کی آرزو رکھنے والے تو ایک دو نہیں بلکہ بیسیوں تھے لیکن یہ سب ایسے پروانے تھے جو شمع کے فروزاں ہونے تک موجود رہتے ہیں۔ ادھر اندھیرا ہوا اور ادھر وہ روپوش ہو گئے۔ لیکن اس فرقے کی عورتوں میں ایک لعنت بھی ہے یعنی جب کسی پر نظر پڑتی ہے تو ننانویں فیصدی ان کا انتخاب غلط ہوتا ہے۔ اور سوسن کی نگاہ بھی غلط آدمی پر پڑی۔ گھر پر ایک نوجوان آدمی کام کرتا تھا آپ اسے گلاب سمجھئے۔ تھا تو چند روپے کا ملازم ہی لیکن اس میں ایک ایسی بات تھی جو کسی دوسروں میں کم پائی جاتی ہے وہ کچھ خود دار بھی تھا اور اسے کچھ احساس کمتری بھی تھا۔ ان باتوں سے سوسن کو یہ خیال ہونے لگا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ گلاب کسی اچھے گھرانے سے ہو اور امتداد زمانہ نے اسے اس کے دروازے پر لا ڈالا ہو۔ وہ کچھ خاموشی پسند بھی تھا۔ حالانکہ پیشہ وروں کے گھروں میں کام کرنے والے سو عیاروں کے ایک عیار اور بڑے لسان اور باطونی ہوتے ہیں۔ ادھر سوسن کی طبیعت بھی کچھ ایسی تھی کہ جہاں گانے بجانے سے فرصت ہوئی گھر کے دھندے میں جا لگی۔ گلاب کام کرتا ہوا تو اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ آپ جانئے! ان لوگوں کی دنیا رات کو آباد ہوتی ہے۔ نو دس بجے رات سے لے کر صبح دو تین بجے تک جاگنا پڑتا ہے۔ سوسن ایک تو پہلے ہی کچھ دبلی پتلی سی تھی دوسرے مسلسل شب بیداریوں سے اس کی صحت بگڑ گئی اور وہ آئے دن بیمار رہنے لگی۔ گھر میں اگر کوئی اس کا سچا ہمدرد تھا تو بظاہر یہی گلاب تھا۔ وہ کبھی کبھی اس سے کہا کرتا کہ سوسن! تم ایک نشست میں مہینے بھر کے لئے کما لیتی ہو۔ پھر روز روز اتنی جان کیوں مارتی ہو۔ اس طرح کے روز جی لوگی۔ سوسن ہنسکر خاموش ہو رہتی۔ لیکن گلاب کے یہ الفاظ "اس طرح کے روز جی لوگی" تنہائیوں میں اس کے کانوں میں گونجتے۔ اور امید کی ایک ہلکی سی کرن بھی اس کے نہاں خانۂ دل میں کبھی چمکنے لگتی۔

ایک روز سوسن کی طبیعت کچھ خراب تھی وہ پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی اور گلاب کمرہ صاف کر رہا تھا۔ اور حسب عادت یا حسب دستور کچھ ہمدردی کی باتیں بھی کئے جا رہا تھا۔

"گلاب!" سوسن بولی۔ "کہتے تو تم بھی سچ ہو۔ لیکن تم میری مجبوری نہیں دیکھتے۔"

"مجبوری کیسی؟" گلاب نے پوچھا۔

"مجبوری نہیں تو اور کیا؟" سوسن نے پوچھا۔ "کیا کروں؟ تم ہی بتاؤ کچھ؟"

گلاب بولا۔

"یہی تو تمہاری بے عقلی ہے۔ کیا اتنے آنے جانے والوں میں سے تمہیں بھروسہ کا ایک آدمی بھی نظر نہیں آتا؟"

"نہیں!" سوسن نے جواب دیا۔ "یہ سب گندم نما جو فروش ہیں۔ دیکھتے تو تم بھی ہو جن دنوں طبیعت خراب ہوتی ہے کوئی بھولے سے بھی پھیرا نہیں ڈالتا۔"

"ہاں!" گلاب نے جواب دیا۔ "یہ تم نے کھری کہی۔ میٹھا

ہوتا ہے تو مکھیاں آتی ہیں۔

"میں بھی تو یہی کہتی ہوں" سوسن بولی "کہیں وہ بات نہ ہو کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ بھروسے کا آدمی مل جائے تو میں تو آج اس کام پر لعنت بھیجوں"

"سب کہنے کی باتیں ہیں" گلاب بولا "ذرا صحت کا خیال رکھا کرو۔ جین ہی جین ہے"

"اگر کوئی ہاتھ پکڑنے والا ہو تو میں تو ایک منٹ بھی یہاں رکنا حرام سمجھوں" سوسن نے کہا۔

"روکھی پھیکی پر قناعت کر سکو گی؟" گلاب نے پوچھا۔

"ابھی تو کچھ کہہ نہیں سکتی" سوسن نے جواب دیا "ہاں کبھی موقع ملا تو بتا دوں گی" "تم تو کبھی کبھی نماز بھی پڑھ لیتے ہو۔ دعا کیا کرو میرے لئے بھی"

"میری دعاؤں میں اثر ہوتا تو کب سے تمہاری مراد پوری ہو چکی ہوتی" گلاب نے جواب دیا۔

"تو جناب!" میری جوان پڑوسن کہنے لگی "اب جب دونوں کو موقع ملتا اسی قسم کی باتیں ہوا کرتیں۔ اور گلاب نے باتوں باتوں میں سوسن کا دل کچھ اس طرح موہ لیا کہ اب اسی کے خیال سے اس کی خوابوں کی دنیا آباد رہتی۔ لیکن گلاب اب ایک اور چال چلا۔ وہ بلا وجہ ہی سوسن سے الگ الگ رہنے لگا۔ وہ بلاتی بھی تو ٹال مٹول کر جاتا۔ ایک روز وہ باورچی خانے میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ سوسن بھی اس کے پاس آ بیٹھی اور بولی۔

"کیا بات ہے جو تم یوں منہ پھلائے رہتے ہو۔ یا میں یہ سمجھوں کہ محبت کا بھوت سر سے اتر گیا ہے"

"جیتے جی تو اترتا نہیں" گلاب نے جواب دیا "لیکن اب میرا یہاں رکنا ٹھیک نہیں"

"کیوں؟" سوسن نے پوچھا "کیا ہوا؟"

"تمہاری مہربانیاں رنگ لا رہی ہیں" گلاب نے جواب دیا۔

"میں پہیلیاں نہیں بوجھ سکتی" سوسن نے ذرا ترش روئی سے کہا "کہنا ہے تو صاف صاف کہو"

"صاف صاف یہ ہے کہ تمہارے گھر والوں کو مجھ پر اعتبار نہیں رہا" گلاب نے جواب دیا "میں آج نہیں تو کل چلا جاؤں گا"

"کہاں جاؤ گے؟" سوسن نے پوچھا۔

"جہاں سینگ سمائیں" گلاب نے جواب دیا۔

"تو مجھے بھی ساتھ لے چلو" سوسن بولی "کیا صلاح ہے؟"

"اور زیادہ نہیں تو چار سال جیل میں چکی بھی پیسوں" گلاب نے ذرا مسکرا کر کہا۔

"چکی کیوں پیسو" سوسن نے کہا "میں اپنی مرضی سے جا رہی ہوں اور نابالغ بھی نہیں"

"سب ٹھیک ہے" گلاب بولا "پر یہ سودا بہت مہنگا ہی میرے لئے۔ تمہارے گھر والے تو مرتے دم تک میرا پیچھا نہ چھوڑیں کبھی"

"بس!" سوسن نے طنزاً کہا "اسی محبت کا دم بھرتے تھے"

گلاب نے ایک لمبا سانس لیا اور کہا۔

"یہ تو میرے خدا ہی کو معلوم ہے"

"کیا؟" سوسن نے پوچھا

"اپنے دل سے پوچھو" گلاب نے جواب دیا۔

"دل سے تو پوچھ لیا" سوسن نے کہا "دل تو کہتا ہے جہاں گلاب ہوگا وہاں سوسن بھی ہوگی"

"لیکن ایک شرط پر" گلاب نے کہا "تم مجھے اپنے قلم سے لکھ دو کہ تم اپنی مرضی سے میرے ساتھ جا رہی ہو"

"ادھر لاؤ کاغذ کا پیکٹ" سوسن بولی "ابھی لکھ دیتی ہوں"

گلاب نے کاغذ اور قلم دیا اور سوسن نے لکھ دیا کہ اسے چونکہ اس پیشے سے نفرت ہے اس لئے وہ اپنی مرضی سے گھر چھوڑ رہی ہے۔

"یہ لو" سوسن نے کاغذ گلاب کی طرف سرکاتے ہوئے کہا "ہو گئی نا اب تو تسلی؟"

"نہیں" گلاب نے جواب دیا "یوں تو کبھی کبھی تسلی ہوا کرتی ہے"

"پھر کیسے؟" سوسن نے پوچھا۔

"یہ بھی لکھو کہ اگر تم مجھے چھوڑ دو گی تو پانچ ہزار روپے بطور تاوان دو گی" گلاب نے کہا۔

"سوسن غصے سے بولی
"گویا تم مجھ سے سودا کر رہے ہو"
"چلو رہنے دو!" گلاب اٹھتے ہوئے بولا" دیکھ لی تمہاری محبت"

"او ہو!" سوسن مسکرا کر بولی" میری محبت کا امتحان لے رہے ہو گویا۔ تو لاؤ لکھ دیتی ہوں"

سوسن نے یہ شرط بھی لکھ دی۔ اور کاغذ گلاب کی طرف بڑھا کر کہا
"یہ تم بھی لکھ دو کہ اگر تم مجھے چھوڑو گے تو تمہیں بھی پانچ ہزار روپے ہرجانہ دینا ہوگا"

"بڑی خوشی سے لکھواؤ" گلاب نے کاغذ جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"چلو!" سوسن مسکرا کر بولی" کیا لکھوانا ہے تم سے"

"تو جناب!" میری پڑوسن بولی" دو ایک روز بعد سوسن کچھ نقدی گھر سے لے کر گلاب کے ساتھ چلی گئی۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا۔ اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن نتیجہ وہی ہوا جو ان حالات میں اکثر ہوا کرتا ہے۔ یعنی سوسن کو پھر گھر واپس آنا پڑا۔ اور غالباً یہی ایک عقل کا کام اس نے کیا۔ لیکن گلاب کب پیچھا چھوڑتا تھا۔ سوسن کی قلمی دستاویز اس کے پاس تھی۔ اس نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی دھمکی دی۔

ادھر سوسن کے گھر والے بھی اکڑ گئے۔ لیکن سوسن نے گھر والوں کو سمجھا بجھا کر کچھ روپے گلاب کو دلوا ہی دیئے اور دستاویز اس سے لے لی"

"خوب رومان ہے" میں نے کہا" جان بچی لاکھوں پائے"
"مرد جو ہوئے آپ" میری پڑوسن نے ذرا طنزاً مسکرا کر کہا" گویا جو قصور تھا سوسن غریب ہی کا تھا"
"یہ میں نے کب کہا" میں نے جواب دیا" لیکن میں سوسن کے جذبے کی قدر ضرور کرتا ہوں"
"اور گلاب کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے" پڑوسن نے پوچھا
"اسے بھی سودا کچھ ایسا بُرا نہ پڑا" میں نے ہنس کر کہا۔
"میرے بس میں ہوتا تو گولی مار دیتی اسے" میری جوان پڑوسن نے غصے سے کہا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اتنا کم ظرف نکلا کہ اسی بازار میں جہاں سوسن رہتی تھی ایک ایسی عورت کے ہاں آنا جانا شروع کر دیا جس سے سوسن کو چشمک تھی"

"واقعی!" میں نے کہا" یہ تو اس پاجی نے بہت بری حرکت کی۔ کچھ نہ کچھ سزا تو اسے ضرور ملنی چاہیئے تھی"
"خیر!" میری پڑوسن ایک آہ بھر کر" یہ تو کسی کے بس کی بات نہیں۔ لیکن قسمت دیکھئے کہ دل آیا بھی تو کس کم ظرف پر آیا"
یہ قصہ سنا کر میری جوان پڑوسن خاموش ہو گئی۔ لیکن اس کی نرگسی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ اس وقت کالی گھٹا سر پر تلی کھڑی تھی۔ اور بادل گرج رہا تھا۔
"چلئے!" میں نے اٹھتے ہوئے کہا" بارش آئے گی"
"چلئے!" میری پڑوسن اٹھتے ہوئے بولی۔ ہم دونوں واپس لوٹے۔ تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ اکی دکی بوندیں پڑنے لگیں۔ اور شاید میری جوان پڑوسن کا دل بھی اس وقت رو رہا تھا"
"لو!" میں نے کہا" یہ ہے واقعہ"
"واللہ!" عباس بولا" بڑا دلکش رومان ہے۔ لیکن مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آپ کی پڑوسن اپنی ہی کہہ رہی تھی"
"واللہ اعلم!" میں نے کہا۔ اور عباس ہولے ہولے یہی
دل کی ہم سے بات کیوں مانی۔ ہائے محبت ہائے جوانی
اشکوں نے کہہ دی ساری کہانی۔ ہائے محبت ہائے جوانی

سہاگن!

ایم اسلم کے نئے افسانوں کا مجموعہ

جس کا ایڈیشن قریب الختم ہے۔ قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ

نگارستان ایجنسی اردو بازار جامع مسجد دہلی

www.taemeernews.com

شالامار

شہید یار جنگ

ہمیں مطلوب سیرِ باغ نہیں
کون کہتا ہے شالامار ہے تو
تیری ہر جا پہ داستانیں ہیں
غم سے اب غیر حال ہے تیرا
تیرے پھولوں کا رنگ باسی ہے
صاف رنگِ خزاں بہار میں ہے
باعثِ ننگِ کاشمیر ہیں پھول
یاد آتے ہیں پہلے نقشا سے
لب فوارہ پہ سخن جاری
یوں کبھی تھے ترے گلاب کے پھول
رنگ اب وہ نہیں آب نہیں
سبز ہیں یا کہ زرد ہیں پتے
آتشِ غم میں جلتے ہیں پتے
غم کی تصویر ہیں شکستہ ہیں
چار سو جو گلوں کے تھالے ہیں
غم ہر اک سے فزوں غبار کا ہے
کب تک آخر مصیبتیں جھیلیں
کون پرساں ہے غم کے ماروں کا
ہل رہا ہے ہوا سے یوں گلِ زرد
اب کہاں گلعذار پھولوں پہ
بجھ گیا عہدِ مغلیہ کا چراغ
گلِ صد برگ کا ہر ایک ورق
کیا پھری دوب ہے کناروں پہ
بلبلوں کے لباس ہیں کالے
پیٹتی کس زور سے ہوائیں ہیں
ہیر دگرد دیکھ کر قرینے سے
مٹتے ہیں جو نشانی ہیں
کون کہتا ہے شالامار ہے تو

دل میں جا باقی بہر داغ نہیں
عہدِ ماضی کی یادگار ہے تو
جتنے منہ اتنی ہی زبانیں ہیں
سبزہ بھی پائمال ہے تیرا
تیرے سبزہ پہ بھی اداسی ہے
شور نوحے کا آبشار میں ہے
لٹ گیا سارا، فقیر ہیں پھول
رو رہے ہیں تمام فوارے
سربلندی ہیں ہو نگوں ساری
جیسے سینہ پہ ہوں شباب کے پھول
اک کتابِ الم گلاب نہیں
صاف تصویرِ درد ہیں پتے
کفِ افسوس ملتے ہیں پتے
جتنی کلیاں ہیں دل گرفتہ ہیں
باغباں کے جگر کے چھالے ہیں
یہ تو پرورد ہی بہار کا ہے
گلے مل مل کے روتی ہیں بیلیں
دل دھڑکتا ہے آبشاروں کا
دل میں جیسے کسی کے ہوتا ہو درد
پڑ گئی اوس تیرے پھولوں پہ
لالہ کے دل میں آج تاب ہر داغ
بے ثباتی کا دے رہا ہے سبق
چادریں سبز ہیں مزاروں پہ
قمریوں کے اداس ہیں نالے
انا للہ کی صدائیں ہیں
آہ نکلی زمیں کے سینے سے
آگ روشن ہے آج پانی میں
دعوۂ اسلام کا مزار ہے تو

وہ تزک ہے نہ انتظام ہوا اب
سب چلے آ رہے ہیں دُکھ انھیں
حالِ گلشن ہے اب تو آئینہ
ہیں دو رویہ صفیں سفیدے کی
کیا گھنی چھاؤں ہے چنار کی
دلِ مجبور کو مسلتی ہیں
کوئی آخر کہاں تک چھانٹے
ایک حسرت ہی آج پھیلی ہے
نخل ہر ایک بیقرار سا ہے
ذکر سبزہ ہے اب تو افسانہ
سُکھنے اک جا بھی یہ نہیں پایا
کیا اثر ہو چلا ہے آہوں میں
چھائی تاریکی ہے سفیدوں پہ
چشمِ نرگس کی اُف رے حیرانی
دولتِ دید کھو چکی نرگس
کس کے ماتم کا ہائے ساماں ہے
غمِ فرقت سے زار و محزوں ہے
کیسا عبرت فزا یہ منظر ہے
ہائے کیا عہد تھا جہانگیری
ہائے تفریح گاہِ شاہ جہاں
اے جہانگیر کی تفریح گاہ
مُنہ چڑاتے ہیں تباہی پہ
نقش ہیں جو یہاں زمینوں پہ
اب جہانگیر ہے نہ نور جہان
مجھکو عاقل کہو کہ دیوانہ
ذکر رہ جائیگا فسانوں میں
نظم یہ مرثیہ نہ ہو جائے
آئے تھے رنج سہہ کے جاتے ہیں

خاص جو تھا وہ باغ عام ہوا اب
کوئی دربان نہیں جو ٹوکے انھیں
پھٹ گیا غم سے کوہ کا سینہ
یا قطاریں ستم رسیدوں کی
یہی بستی ہے غم کے ماروں کی
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں
ہیں گلوں میں ہزار ہا کانٹے
چاندنی بھی تو میلی میلی ہے
پتہ پتہ میں اضطرار سا ہے
تھا جو اپنا بھی ہے وہ بیگانہ
لوٹتا ہے زمین پر سایا
چھا گیا اب دھواں نگاہوں میں
پانی اب پھر گیا امیدوں پہ
ہو گیا خشک آنکھوں کا پانی
اپنی آنکھوں کو رو چکی نرگس
زلفِ سنبل کی جو پریشاں ہے
پیکرِ عشق بید مجنوں ہے
اب جہانگیر ہے نہ اکبر ہے
اب وہ کشمیر ہے نہ کشمیری
اب وہ تفریح کرنیوالا کہاں
پھر گئی تجھ سے آسماں کی نگاہ
چند بیٹھے ہیں قصرِ شاہی پہ
خاک اڑتی ہے شہ نشینوں پہ
سچ ہے یہ کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَان
باغ میری نظر میں ویرانہ
میں بھی ہوں تیرے نوحہ خوانوں میں
باغ ماتم سرا نہ ہو جائے
پھر نہ آئیں گے کہہ کے جاتے ہیں

میری بھول

خواجہ محمد شفیع دہلوی

سورج رات کی سرمئی چادر سے اس طرح برآمد ہو رہا تھا جیسے کوئی شعلہ رو چہرہ پر سے زلفیں ہٹاتی ہوئی اٹھے۔ میں بھی انگڑائی لیتی بیڈ روم سے باہر آئی ـــــ باغ میں سرو اسی طرح سر اٹھائے کھڑے تھے جیسے کوئی دراز قامت محبوبہ کسی منظور نظر کو دیوار پر سے جھانکے ـــ یا کوئی آزاد طبع سماجی پابندیوں سے ابھر کر نکل جاتا ہے ـــــ گلاب کی پنکھڑیوں پر قطرۂ شبنم اس طرح پڑے تھے جیسے لطیف تکان کے بعد پسینہ عارضِ روشن پر موتی سا ملک آئے ـــــ قمری کچھ ایسی ہوک سے کوک رہی تھی جیسے حوا بچھڑنے کے بعد آدم کو پکارے ـــــ بھونرا پھولوں پر مستانہ وار اسی طرح منڈلا رہا تھا جیسے وہ قطرۂ شبنم کی جانب جھوم جھوم کر آئے یا قلبِ معصوم پر گناہ اول چھائے ـــــ لالہ کا داغ فضا کو ایسا مسکر بنا رہا تھا جیسے شراب ارغواں میں افیون کی آمیزش۔

فوارہ میں پانی جذبات کی طرح ابل رہا تھا ـــــ حوض کی لہریں دیکھ کر دل موجوں پر آتا تھا۔ فوارے ... پانی ... چھوٹے چھوٹے بھنور پیدا کر رہے تھے ... عاشق خیرہ سر کی پہلو ... میں گرداب پیدا کرے۔

رات کو میں نے ایک نئی عشق و محبت کے مناظر نے دل میں ایسی طغیانی پیدا کر دی تھی کہ وہ نہ صرف سینہ کے کنارے توڑنے پر آمادہ نظر آتی تھی بلکہ تمام خیموں کو ... طوفان ... ـــــ ... سے آکر میں ایک ناول پڑھنے لگی وہ بھی عشق و حسن کی ... سے لبریز تھا۔ غرض کہ میرے دل و دماغ پر بھی کیف محبت طاری تھا اور فضا بھی انہی جذبات سے معمور۔

... والی کوٹھی میں ہمارے ... رہتے تھے آج ان کے باغ میں ایک نئی صورت نظر آئی ـــــ ایک نوجوان ... سرو قامت گل گشت چمن میں مصروف تھا۔ ہم دونوں کی آنکھیں ... ـــــ میں پرانے زمانے کی لڑکی نہ تھی جو غیر مرد کو دیکھ کر ... پردہ کی نہایت اور بے معنی شرم سے مغربی ماحول ... میں بے محابا ... ٹھکانا نہ ...

دہر جائے مرکب تواں تاختن
کہ جا ہا سپر باید انداختن

کنجشک فرومایہ باز کے سامنے نہیں نکلتی۔ خرگوش لومڑی سے چھپ جاتا ہے۔ ہرن شکاری سے رم کرتا ہے۔ جانور اپنی حفاظت کے لئے جھاڑیوں اور درختوں کے پردے اختیار کرتا ہے ـــــ لیکن انسان زعم باطل کے تحت بے جا جرأت دکھاتا ہے زک اٹھاتا ہے۔

عورت مرد کی ہم مقابل نہیں ہو سکتی۔ صنف نازک قوی کی کشش بے پناہ سے بچ نہیں سکتی۔ لیکن خود فریب جرأت رندانہ دکھاتی ہے۔ شیر سے آنکھ لڑاتی ہے۔ گزند پاتی اور شکار ہو جاتی ہے۔

بزرگوں نے اس کے لئے شرم و حیا کے دامن بنائے ہیں۔ پردہ کے قلعے۔ گھر در کے حرم۔ لیکن یہ حوا کی بیٹی ہر ممنوعہ کی حریص انہیں توڑ باہر نکل آئی نتیجہ معلوم۔

ہوس نمائی نے غنچہ رہی قبا چاک کر دی۔ رس بھونرے نے چوسا۔ رنگ سورج نے اڑا۔ بو ہوا نے اڑائی ـــــ دانہ زمین کے طبق شوق کر کے تماشے برگ و بار میں ابھرا۔ زاغ و زغن نے اس پر گھونسلے بنائے۔ باد حوادث نے جھنجوڑ جھنجوڑ ڈالا۔ دست ہوس نے گل پھول توڑ لئے۔ نسیم نے بہکا دیا۔ زمانے نے ختم کر دیا۔ تاہم فطرت اپنا کام کر رہی ہے اور کرتی رہے گی۔ قانونِ قدرت یہی ہے۔ رواں گشتہ ... کرتا ہے ... گیا تھا۔

پروانہ بجھی ہوئی شمع کو چھوڑ دیتا ہے ـــــ بلبل پژمردہ گل سے کنارہ کش ہو جاتا ہے ـــــ شہد کی مکھی رس چوسنے کے بعد اس پھول کی طرف رجوع نہیں کرتی ـــــ میرا بھی یہی حشر ہوا۔

لیکن چکور چاند کو گھورے جاتی ہے ـــــ گرگٹ سورج پر نظریں جمائے بیٹھا رہتا ہے ـــــ دیوانی ـــــ ان دونوں کی اپنے محبوب تک رسائی نہیں۔ عشق قائم ہے۔ اگر دسترس ہو جائے تو یہی منہ موڑ لیں۔

... انڈے کو چڑیا بھی گھونسلے سے پھینک دیتی ہے۔ میرا بھی کوئی ...

... دہ شدہ انڈے کو کیسے ... سماج کے ... وکیلوں نے آرزوؤں کے بازار میں لا ڈالا ـــــ اب میں ...

ایک سوال

احمد ندیم قاسمی

بہتر خزاؤں اور بہاروں نے مجھے پال پوس کر اس قابل بنایا ہے کہ اب طویل زندگی کی بجائے مرگِ ناگہاں کی دعا مانگوں ورنہ اس سے پہلے مجھے جینے اور صرف جینے کی تمنا تھی، میں اس لئے نہیں جینا چاہتا تھا کہ ادھر ادھر سے دولت کے انبار سمیٹ کر عالیشان محل تعمیر کراؤں، اور قریہ قریہ کی نازنینوں کو جمع کر کے ان شبستانوں میں جذباتی گہما گہمی پیدا کروں۔ جینے کی تمنا کا صرف ایک مقصد تھا۔ جو اب تک اس لئے پورا نہ ہو سکا کہ میں ایماندار ہوں سچا ہوں، خدا کی رحمت پر یقین رکھتا ہوں اور بزدل ہوں میں سوچتا ہوں۔ اور اکثر اس سوچ کے اثر سے مجھے اپنا سارا ماضی گلا سڑا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اگر میں دلیر ہوتا اور میرا مقصد ناپاک ہوتا تو شاید قدرت مجھے آزمائش میں نہ ڈالتی، اور میرا وہ مقصد پورا ہو جاتا جو میرے صرف ایک تجربے ——— صرف ایک یاد سے وابستہ ہے ——— اور صرف ایک سوال پر مبنی ہے۔

بڑھاپا تجربوں اور یادوں کا انبار ہوتا ہے۔ لیکن میرے پاس صرف ایک تجربہ ہے ——— صرف ایک یاد ——— یہ یاد میری زندگی کے اس دور سے تعلق رکھتی ہے۔ جب میرے ذہن میں ستاروں، بادلوں، پربتوں، جھرنوں، کھیتوں اور پھولوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ جب میرے قہقہوں میں سورج کی شعاعوں کی حرارت تھی، اور میری مسکراہٹوں میں چاند کی کرنوں کی پاکیزگی اور پھر اسی دور میں میرے قہقہے بجھ گئے اور مسکراہٹیں مٹ گئیں ——— ستاروں سے لے کر پھولوں تک ہر چیز وہی تھی لیکن رنگ اور اس کا احساس مر گیا۔ دنیا پرانی ہو گئی۔ اور آج تک پرانی ہی رہی

میں بیس برس کا نوجوان تھا۔ اس عمر میں ہر انسان اپنے آپ کو خوبصورت تصور کرتا ہے۔ لیکن میں سچ مچ بڑا بانکا سجیلا گبرو تھا۔ گلی سے گزرتا تھا، تو گلی پھیلنے لگتی تھی۔ کھیتوں میں جاتا تھا۔ تو کھیت لہلہا اٹھتے تھے۔ پربتوں پر چڑھ جاتا تھا۔ تو پربت اپنی چوٹیاں کو سورج کی طرف اٹھا لیتے ——— میں ہوتے نیچے جو ہال پر جاتا۔ تو سب لوگ صرف مجھے دیکھتے۔ صرف میری باتیں کرتے

سردیوں میں صرف میری خاطر الاؤ کے مینار کو اور بلند کر دیا جاتا کہ جو رہا ہوں پر گرمیوں میں ٹھنڈے چشموں کے تازہ پانی سے میری تواضع ہوتی۔ میں جب اپنے کھیتوں میں ہل چلانے جاتا۔ تو گول ڈھیریوں پر بیٹھی ہوئی چرواہیاں نیچے اتر آتیں۔ تو میرے کھیت کے آس پاس اگی ہوئی بیریوں پر پتھر پھینکنے سے پہلے مجھ سے صرف اس لئے اجازت چاہتیں۔ کہ وہ میری مخاطب بن سکیں رنگ رنگ کی لڑکیوں نے مجھ سے باتیں کیں، لیکن میرے احساس کا قلعہ مضبوط تھا۔ اور میں نے اس قلعہ کے شیش محل میں گاؤں کی اس لڑکی کو بٹھا رکھا تھا، جس کا نام روشناں تھا، اور اگرچہ وہ غریب تھی، مگر اس کے حسن میں بلا کا جادو تھا، بعض لوگ کہتے تھے کہ روشناں کے قبضے میں جنات ہیں، مگر ان جنات کا مجھے اچھی طرح علم تھا ——— یہ تھے اس کی آنکھیں۔ اس کے بال، اس کے ہونٹ ——— اس کا سڈول اور چھریرا جسم، اور پھر وہ چال ——— جیسے ہوا کے بازوؤں پر اڑتی ہوئی بدلی ——— تیز مگر بے آواز!

میں اپنی جنت میں مست تھا، زندگی میرے لئے ایک رسیلا خواب تھی، گاؤں والوں میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ روشناں نے اپنے آپ کو میرے حوالے کر رکھا ہے اور میں روشناں کے بس میں ہوں، روشناں کے بارے میں تو یہاں تک کہہ دیا گیا تھا کہ ایسی لڑکی جو ناک پر مکھی تک نہ بیٹھنے دے۔ جس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں چنگاریاں تیرتی رہتی ہوں، کبھی محبت نہیں کر سکتی محبت بہت شدید قسم کی نرم مزاجی اور سادگی چاہتی ہے۔ اور روشناں تو مکی کا بھٹا ہے۔ تپش پہونچی نہیں، اور چٹاک پٹاک ہوئی نہیں۔ ادھر میرے متعلق بھی یہی خیال ظاہر کیا جاتا تھا کہ ایسا سعادتمند نوجوان جس نے باپ کی وفات کے بعد خود ہی ہل چلانا شروع کر دیا اور اچھے خاصے تجربہ کار دہقانوں کی طرح کھیتوں کھلیانوں میں شامل ہونے لگا۔ محبت ایسی دور از کار باتوں میں کیا خاک دلچسپی لے گا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ راتوں کی سرسراتی ہوئی خاموشیوں

www.taemeernews.com

میں ہم دونوں چٹانوں پر بیٹھے لوگوں کی خیال آرائیوں پر ہنستے اور جب چاند بہت پرے جھیل کے طشت پر اپنا ایک چھلکا پھینک دیتا۔ اور ہمیں ساری جھیل کے آر پار ایک نقرئی سڑک نظر آنے لگتی تو روشناں کہتی "اگر تم میں اتنی ہمت ہو تو مجھے اپنے کاندھوں پر بٹھا کر چاندنی کی اس صاف ستھری سڑک پر لے جاؤ مجھے یقین ہے کہ ہم سیدھے چاند کی نگری میں پہنچ جائیں گے۔"

"وہاں کیا کریں گے ہم؟" میں پوچھتا۔

اور وہ جواب دیتی "وہاں ہم ادھر اُدھر سے ستارے چن کر جھیل میں پھینکیں گے۔"

میں کہتا "اور اگر جھیل کو آگ لگ جائے؟"

وہ پوچھتی "کیا ستارے آگ کے بنے ہوئے ہیں؟"

میں جواب دیتا "اس دنیا میں ہر چمکنے والی چیز آگ کی بنی ہوئی ہے، یہ آسمان کے ستارے، یہ چاندی کے سکے، یہ روشناں کی آنکھیں۔"

وہ آنکھوں پر بازو رکھ کر ہنسنے لگتی۔ اور پھر انہیں پونچھ کر کہتی "سچ سچ کیا میری آنکھوں میں بھی آگ ہے؟ اور اگر ان میں آگ ہے تو وہ پانی کہاں سے آیا تھا جو تمہیں پانے سے پہلے میں نے اپنے گھروندے کے کونوں میں چھپ چھپ کر آنسوؤں کی صورت میں بہایا تھا، بتاؤ نا۔ کیا سچ مچ تمہیں میری آنکھوں میں بھی آگ ہی نظر آتی ہے؟"

ہم اسی قسم کی بے شمار باتیں کرتے، اور جب صبح کا ستارا پرانے دوست کی طرح ہماری طرف محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگتا۔ تو وہ چلی جاتی، دن کو جب ہم گلی کے کسی موڑ پر مل جاتے تو یوں گذر جاتے، جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں، زندگی ایک ہی خوشگوار ڈگر پر چلتی رہی، مجھے نہ ٹھنڈی آہوں کی ضرورت پڑی۔ نہ دردناک گیتوں کی۔ یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے ساری دنیا خوش ہے، ہر چیز مطمئن ہے، اور اگر کوئی ستارا ٹوٹتا ہے، تو صرف اس لئے کہ اس کے لئے نظام شمسی میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔

انہی دنوں علاقے کے دوسرے دیہات کے علاوہ ہمارے گاؤں کو بھی تحصیل کے ساتھ پکی سڑک کے ذریعے ملانے کی افواہ گرم ہوئی اور ایک روز ہمارے گاؤں میں بھی ایک صاحب وارد ہوا۔ انگریزی لباس میں اس کا سیاہ بے ڈھنگا جسم جکڑا ہوا تھا۔ کرسی پر بیٹھتا تھا۔ اور سگرٹ کا دھواں ہمیشہ آسمان کی طرف چھوڑتا تھا۔ وہ ایک ٹھیکیدار کا منشی تھا۔ اور اسے سڑک کی تعمیر کے لئے بہت سے مزدوروں کی ضرورت تھی کھیتوں میں ہل چلائے جا چکے تھے۔ سارا دن بیکار بیٹھے رہنے سے میں نے مزدوری کو بہتر سمجھا۔ اور گاؤں کے بہت سے نوجوانوں کے ساتھ اپنے گاؤں سے چند میل دور کام شروع کر دیا۔ دن بھر وہاں کھدائی اور کنکروں کی کٹائی کا کام کرتا۔ اور شام ہوتے ہی واپس گاؤں آجاتا۔ روشناں کو انگریزی لباس والے کالے صاحب کی باتیں سناتا۔ کس طرح اسے جب پتھر سے ٹھوکر لگتی ہے، اسے گالی دیتا ہے، کیسے وہ دوپہر کا کھانا انگلیوں کی بجائے چھری کانٹے سے کھاتا ہے۔ اس حالت میں کہ چھری کند ہونے کے باعث بہت دیر کے بعد کاٹتی ہے۔ اور کانٹا بہت دیر تک تلے رہنے کے باعث جھکنے اٹھنے اور پھر لرزنے لگتا ہے۔ اور پلیٹ میلی ہو جاتی ہے۔ کس طرح وہ ہمیں محنت سے کام کرنے کا حکم دے کر درخت کے نیچے پڑی ہوئی آرام کرسی پر لیٹ جاتا ہے۔ اور نیند میں انگریزی بولتا ہے۔ روشناں ہنستی اور کہتی "اپنے بڑوں کی عزت کرنی چاہیئے۔ جانتے ہو یہ صاحب تمہیں چھٹے کے بعد کیا دے گا؟ چاندی کے چند سکے اور جانتے ہو ان چمکنے والوں سکوں میں کیا ہوتا ہے؟" "روشناں کی آنکھیں" میں کہتا۔

مگر روشناں مجھے اکثر یہی طعنہ دیتی تھی، میں نے بھی کئی بار ارادہ کیا۔ کہ جب کھانے کو سب کچھ میسر ہے۔ تو محنت مزدوری سے کیا فائدہ۔ لیکن سڑک مکمل ہونے کو تھی۔ سارا گاؤں مزدوری کرتا تھا۔ اور دن بھر گاؤں میں بیکار بیٹھے رہنا میرے لئے کٹھن تھا۔ آخر سڑک مکمل ہوئی۔ اس روز ہم بے شمار مزدوروں نے کالے صاحب کے اردگرد پہاڑی ناچ کیا۔ غبار اُڑا تو صاحب بہادر انگریزی میں ہمیں گالیاں دینے لگا۔ اور پھر پیلے دانت نکال کر یوں ہنسا۔ جیسے وہ اپنی اس بھونڈی عزت افزائی پر پادل ناخواستہ تسلی کا اظہار کر رہا ہے۔ سڑک کے ساتھ ہی میدانی شہروں سے موٹروں اور لاریوں کا ایک سیلاب امڈ آیا۔ اور چند دنوں کے بعد

www.taemeernews.com

گھر گھر میں چرچے ہونے لگے۔ کہ ہر لاری اپنے ساتھ ایک بیماری اور ہر موٹر اپنے ساتھ ایک بدمعاش لاتی ہے۔ خوش قسمتی سے ہمارا گاؤں سڑک کے آخری سرے پر تھا۔

اس لئے موٹریں اور لاریاں دوسرے دیہات میں دندناتی رہیں۔ شہروں کے موٹر ڈرائیور شہری زندگی کی تمام بدمزگیاں ساتھ اٹھا لائے۔ رئیسوں کی موٹریں کئی ناپاکیوں کو اپنی چمکتی ہوئی سیٹوں پر لادلائیں، اغوا ہونے لگے۔ ایک دو مرتبہ خون خرابہ بھی ہوا۔ مگر پھر سکون چھا گیا۔ لاریوں کی اگلی سیٹیں عورتوں کے لئے وقف کر دی گئیں تاکہ لاری ڈرائیوروں کا وقت اچھا کٹ جائے، پنگھٹوں کے قریب سے گذرتی ہوئی موٹروں نے سریلے ہارن بجائے، ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ جب ایک روز میں قصبے میں کسی کام کو گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کہ وہاں کی عورتیں اب آبی دوپٹے اوڑھتی ہیں تنگ قمیصیں پہنتی ہیں اور اکڑ اکڑ کر چلتی ہیں۔ میں نے مردوں کے انداز میں بھی تبدیلی محسوس کی۔ وہ بھی اب گلیوں میں قطار بنا کر بیٹھتے۔ گالیاں دیتے۔ فلمی گیت گاتے۔ اور جب پنہاریوں کی ٹولی ان کے درمیان سے گذرتی تو طرروں کو سیدھا کر دیتے ان کے حسن کی علانیہ تعریف کرتے اور ریشمی کپڑوں کے عجیب وغریب نام لے کر اپنی محبت کا اظہار کرتے اور ساتھ ہی مصنوعی چھینکیں اور بناوٹی انگڑائیاں!

قصبے سے واپس آکر جب میں نے اس ہولناک تبدیلی کا ذکر کیا۔ تو کئی دہقانوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا، لیکن سڑک بن چکی تھی۔ اور سڑکیں محض اس لئے بنائی جاتی ہیں۔ کہ ان پر لاریاں اور موٹریں چلیں۔ ورنہ پیدل چلنے والوں کے لئے تو اب بھی پگڈنڈیاں موجود ہیں۔ وہ پگڈنڈیاں جنہیں انسانی قدموں نے بنایا اور سنوارا ہے۔ جو کالے پربتوں پر سنہری ناگنوں کی طرح لپکتی ہوئی آسمان کی نیلاہٹوں میں گھلتی نظر آتی ہیں۔

میں نے روشناں سے بھی سڑک کی کارستانیوں کا ذکر کیا۔ اور پھر اسے جھیل کی سطح پر اس نقرئی سڑک کی یاد بھی دلائی۔ جو سیدھی چاند کی نگری میں جاتی تھی۔ وہ کسی سوچ میں پڑ گئی اور پھر بولی یہ آخر سڑک کی یاری میں تمہارا بھی ہاتھ ہے نا۔"

اب میں کسی سوچ میں پڑ گیا، جی چاہا، بھاگ کر جاؤں اور کدال اٹھا کر سڑک کو کاٹنا شروع کر دوں۔ اس کے سلیٹی چہرے پر خراشیں ڈال دوں اس پر جا بجا میں گڑھے کھدا دوں۔ تاکہ میرے گاؤں میں کوئی موٹر نہ آسکے۔ اور موٹر کے ساتھ وہ خباثت بھی نہ آسکے۔ جسے لوگ نیا زمانہ کہتے ہیں۔

لیکن جس رات کو میرے دل میں یہ دیوانوں کا سا خیال آیا۔ اسی رات کی صبح کو ہمارے گاؤں میں ایک موٹر آئی، اور پھر ایک لاری، موٹر سے ایک گول مٹول رئیس نکلا۔ اور لاری سے پتلے پتلے کتے، اور کتوں کے بعد بہت سے انسان جو اپنے لئے آٹا اور کتوں کے لئے گھی اٹھا کر گاؤں کی قریب ترین پہاڑی کی چوٹی کی طرف بڑھے، ذیلدار رئیس کے استقبال کے لئے آیا، موٹر اور لاری کو دیکھنے سارا گاؤں امڈ پڑا، مجھے اس روز یوں محسوس ہوا۔ جیسے میرے گاؤں کے کلیجے میں شیطان نے اپنے استخوانی پنجے گاڑ دیئے ہیں۔ اور چند معصوم لوگوں کی اس ننھی سی بستی سے وہ سب کچھ نوچ لینے والا ہے۔ جس میں حسن ہے سادگی ہے، اطمینان ہے!

لیکن اس رئیس نے تو دنوں میں گاؤں بھر کو اپنا گرویدہ کر لیا۔ ننھے بچوں میں ہر روز نئی چھاپ کے پیسے تقسیم کرتا نوجوانوں کو اپنے ہمراہ شکار پر لے جاتا۔ اور شکار کا بہت بڑا حصہ اپنے کتوں اور ان کے لئے وقف کر دیتا، بڑے بوڑھے رات کو اس پہاڑی کی چوٹی پر رئیس کے خیمے میں اکٹھے ہوتے، تو رئیس انہیں قسم قسم کے دلیسوں کی باتیں سناتا۔ ہر ایک کو ادب سے بلاتا نرمی سے جواب دیتا۔ جی بھر کر تواضع کرتا، اور ایک دن تو اس نے چند بچوں کو موٹر میں بٹھا کر چند میل کی سیر بھی کرائی۔

روشناں مجھ سے کہا کرتی، "تم کیوں نہیں جاتے اس کے ہاں۔ سنا ہے ایسے لوگوں کے پاس بیٹھنے سے انسان بڑے کام کی باتیں سیکھتا ہے"۔ گاؤں والوں نے بھی کہا تم تو موٹروں لاریوں کے بڑے گندے قصے سناتے تھے ہمیں، اور اب ہمارا تو خیال ہے کہ اگر یہ رئیس ایک مہینہ اور اس گاؤں میں رہا۔ تو رنگ دے گا سب گھرانوں کو۔ کیا خیال ہے تمہارا؟

میں نے تو اپنا خیال ظاہر نہ کیا۔ لیکن گاؤں والوں کو اس کا

جواب دوسرے ہی روز مل گیا۔ اور وہ یوں کہ رئیس نے ایک گھرانے کو سچ مچ رنگ دیا۔ رات کو جب بڑے بوڑھوں کی محفل رئیس اور اس کی بارہ پشتوں کو دعائیں دیتی اٹھتی تو رئیس سب کو پہاڑی کے دامن تک چھوڑنے آیا۔ اور جب صبح کو لوگوں نے پہاڑی کی چوٹی کی طرف دیکھا، تو خیمے غائب تھے۔ موٹر اور لاری اور رئیس اور کتے اور کتوں کے رکھوالے ــــ سب جا چکے تھے اور ان کے ساتھ ایک سفید پوش بوڑھے زمیندار کی بیٹی آلی بھی جس کے متعلق مشہور تھا کہ اسے آنکھیں اٹھا کر دیکھنے کا ڈھب آتا ہی نہیں۔ شرم کی پتلی ہے، کسی خوش نصیب کے حصے میں آئے گی۔

خوش نصیبی کسی کے باپ کا اجارہ تو ہے نہیں۔ رئیس آلی کو اڑا لے گیا۔ سفید پوش بوڑھے نے ذیلدار سے شکایت کی۔ تو ذیلدار مسکرا دیا۔ اور بولا "کیا تماشا شروع کرتے ہو چچا۔ عدالتوں میں دھکے کھاتے پھرو گے۔ دیس دلیس میں بدنامی ہوگی، رہنے دو لڑکی دینے کا مال ہے، اسے نہ دی، اسے دیدی۔ آج نہ دی، کل دے دی اور اگر آلی تم سے پوچھے بغیر گئی ہے، تو بھی کیا حرج ہے، قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہو تم ــــ"

میں وہیں بیٹھا بوڑھے سفید پوش کے چہرے کو دیکھ رہا تھا اچانک اس کی جھریاں کانپنے لگیں۔ دریچے بھووں کی طرف آ گئے۔ لاٹھی کو فرش پر پٹخ کر کانپتی ہوئی آواز میں بلبلا اٹھا ــ "مسکراتے ہو تم۔ تم ہنستے ہو میری حالت پر، اور اگر آلی کی جگہ تمہاری بیٹی ہوتی تو ــــ" لیکن ذیلدار کے تھپڑ نے بوڑھے کو فقرہ پورا نہ کرنے دیا۔

اس روز سے میرے ذہن پر سے جیسے کسی نے جھلی سی اتار پھینکی میں نے اچانک محسوس کیا، کہ نہ روشناں میں اتنی کشش ہے اور نہ اس گاؤں کی کسی دوسری لڑکی میں۔ جیسے آلی میں میری محبوبہ تھی۔ وہ آلی جسے میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا، ہر پھر کر میرے خیالات آلی کے گرد جمع ہو جاتے ــــ آلی ــــ وہ مظلوم باپ کی مظلوم بیٹی ــــ کون جانتا ہے اسے رئیس زبردستی لے اڑا ہو ــــ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ اٹھوا لی گئی ہو۔ ان گول مول پہاڑوں کی رہنے والی ــــ اس تپتے ہوئے جھلسے ہوئے میدانوں میں ایک ریاکار رئیس کے قفس کا شکار! ــــ ہوتے ہوئے آلی کا تصور میرے دل میں گھر کرتا گیا۔ میری زمینیں ہل کے لئے ترس گئیں۔ میری روشناں اندھیری راتوں کی ڈراؤنی تنہائیوں میں کہ جب چٹانوں پر بیٹھی میری راہ دیکھتی رہی۔ جھیل پر نقرئی سڑکیں بنیں، جھرنوں میں تاروں کی پھلجھڑیاں چھوٹیں، صبح کا ستارا پرانے دوست کی طرح کھلکھلا کر ہنسا، لیکن میں سوچتا رہا۔ اس آلی کے متعلق جس کے باپ نے اپنے گھر سے باہر نہ نکلنے کی قسم کھا لی تھی۔ اس رئیس کے متعلق جس نے خدا کی صدا سے خدا جانے کس دیس جا کے ڈیرے جمائے تھے۔ میں سوچتا رہا۔ کبھی تو یہ رئیس پھر بھی ادھر کا رخ کرے گا۔ کبھی تو اس علاقے کی کھاڑیوں میں بھاگتے ہوئے ہرن اور اس گاؤں کی گلیوں میں لپکتی ہوئی ہرنیاں اسے یہاں بلائیں گی۔ اور میں اپنے تیز چھرے کی مدد سے اس سے آلی کا، آلی کے باپ کا، سارے گاؤں کا، ساری دنیا کے مظلوم انسانوں کا انتقام لونگا۔ اور جب یوں ہوگا۔ تو دنیا دیکھے گی کہ رئیس کا سر پہاڑی کی چوٹی سے لڑھک کر اس کی موٹر کے پہیوں میں پڑا ہے۔ اور آلی کو اس کے باپ نے اپنے سینے سے لگا کر رکھا ہے۔ سلیٹی سڑک کو علاقے کے تمام غیرتمند نوجوان کاٹ اور اکھاڑ رہے ہیں۔ اور موٹروں اور لاریوں کا قافلہ شہروں کی طرف دھکیل دیا گیا ہے ــــ میرے اس نعرے کے ساتھ کہ ــــ ہم بلندیوں کے رہنے والے ہیں اور ہم قیامت تک اسی طرح بلند رہیں گے۔ ہم نیلے پہاڑوں کے رکھوالے، ہم سرسبز گھاٹیوں کے پہرہ دار، ہم چاندی ایسی جھیلوں کے پاسبان!

اسی طرح ایک برس گزر گیا۔ روشناں چند مرتبہ مجھ سے ملی۔ لیکن میں نے بیماری کا بہانہ کر کے اسے ٹال دیا۔ میرے دل میں اس کی محبت اس شدت سے موجود تھی۔ لیکن اس پر ایک برس کی مختلف سوچوں کا انبار لگ چکا تھا۔ اور یہ انبار تب ہٹا جب ساون آیا۔

ساون کے آتے ہی شہروں سے نکیلی موٹروں کی قطاریں بلندیوں کی طرف بڑھیں، اور میری رگوں میں جیسے تازہ خون دوڑ گیا۔ گاؤں والوں نے بھی میرے مزاج کے اچانک پلٹنے کو محسوس کیا۔ اور وہ میری ایک برس کی خیالی بیماری کو کوستے رہے۔ اور

پھر ایک دن دوپہر کے وقت مجھے ایک بچے کی زبانی معلوم ہوا۔ کہ ہمارے گاؤں میں ایک موٹر آئی ہے۔

"اور لاری؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ ایک لاری بھی" وہ بولا۔

"اور کتے؟" میں نے پوچھا

"ہاں کتے بھی" وہ بولا۔ اور تالیاں بجاتا پہاڑی کی طرف دوڑ گیا ۔۔۔

پہاڑی کے دامن میں جاکر مجھے معلوم ہوا۔ کہ یہ کوئی بزرگ قسم کے رئیس ہیں۔ بہت بڑے ٹھیکہ دار ہیں۔ داڑھی رکھتے ہیں اور حقہ نہیں پیتے۔ کتوں کو کبھی ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ہمیشہ چٹائی پر بیٹھتے ہیں۔ ہفتے میں سو روپے غریبوں میں تقسیم کرتے ہیں! اور نماز پڑھتے وقت روتے ہیں!۔

میں نے کچھ دن انتظار کیا۔ مگر بہت جلد اس نئے رئیس کی ڈاڑھی اور تسبیح اور پھر اس رئیس کے منشی نے گاؤں والوں کو اپنا مداح بنا لیا۔ یہ منشی وہی انگریزی لباس والا کالا صاحب تھا جس نے اب کرسی پر بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ اور رئیس سے چھپ کر سگرٹ پیتا تھا، اور ہر شخص سے یوں کھل کر باتیں کرتا تھا جیسے سب گاؤں والے اس کے چچیرے بھائی ہیں،

مگر ایک روز جب ساون کے بادل پوری شان سے برس رہے تھے۔ اور گلیاں ندی کی طرح بہ رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ ہر رئیس دوسرے رئیس کا بھائی ہے۔ اور یہ رشتہ چاندی کے سکے مکمل کرتے ہیں۔ چاندی کے ان چمکتے ہوئے سکوں کی سڑک دنیا کے تمام رئیسوں کو ایک دوسرے سے ملائے ہوئے ہے۔ یہ رئیس اس رئیس کا نمایندہ ہے۔ اور میری سوچ بچار قطعاً بے کار ہے یہ رئیس میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔ اور پھر یہ خبر گاؤں گاؤں قریہ قریہ، شہر شہر میں پھیل جائے گی۔ اور آپ کو معلوم ہوگا، کہ اس کے گاؤں کے نوجوان بے غیرت نہیں۔ ابھی تک ان میں خودداری اور انتقام کا وہ جذبہ موجود ہے۔ جو نیلے پربتوں پر بسنے والوں کے لئے ہمیشہ سے سرمایۂ ناز رہا۔

میں چہرے کو کمبل میں چھپا کر موسلادھار بارش میں گھس گیا۔ اور جب پہاڑی کے دامن میں پہنچا۔ تو کنکروں، جھاڑیوں اور گھاس کے درمیان رینگتا، ہولے ہولے اوپر چڑھنے لگا۔ نہایت آہستہ سے خیمے تک گیا۔ بڑی احتیاط سے پردہ اٹھایا۔ تو خیمے کے پرلے کونے کے ساتھ ایک مختصر خیمے میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ پاؤں کے انگوٹھوں کے بل چلتا۔ اس پست سے دروازہ کے قریب گیا، اور ۔۔

اور میرے پاس صرف یہی تجربہ اور صرف یہی یادداشت ہے۔ سامنے پلنگ پر روشناں بیٹھی تھی ـــــ روشناں جس کی محبت میں، میں نے راتوں کی راتیں ویران کر ڈالیں، اور اپنی زندگی کی ہر سانس کو اس کے نام معنون کرتا رہا۔ وہ پلنگ پر رئیس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے مسکرا رہی تھی اور لیمپ جل رہا تھا۔ اور خیمے ہل رہے تھے۔ اور بادل گرج رہے تھے اچانک، میں نے یوں محسوس کیا۔ کہ جیسے کسی ان دیکھے ہاتھ نے میرے ہاتھ سے خنجر اچھین لیا۔ میرے چہرے پر لعنتیں لکھ ڈالیں ہیں مجھے ساری دنیا کے سامنے ننگا کر دیا ہے۔ جیسے خود میرے دوسرے وجود نے مجھ پر تھوک ڈالا ہے۔ اور میں پیچھے ہٹ رہا ہوں۔ میں پہاڑی کی ڈھلوان پر لڑھک رہا ہوں سلیٹی سڑک نے مجھے اچھال کر کیچڑ بھری نالی میں پھینک دیا ہے۔ میں بھاگا جا رہا ہوں، اس گاؤں سے، ان پہاڑوں سے، اس زمین سے، جیسے میں زمین کے آخری کنارے پر جاکر دم لوں گا۔ اور وہاں سے پکاروں گا ـــــ وہاں سے پکاروں گا ـــــ؟

لیکن جب سورج نکلا، تو میں اپنے گھر میں کھاٹ پر پڑا تھا اور جب میں نے پہاڑی کی طرف دیکھا تو خیمے غائب تھے۔ موٹر اور لاری رئیس اور کتے اور کتوں کے رکھوالے، سب جا چکے تھے، اور ان کے ساتھ ایک بزدل نوجوان کی محبوبہ روشناں بھی، جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتی، اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں چنگاریاں تیرتی رہتی ہیں۔ وہ کبھی محبت نہیں کر سکتی!

معاً مجھے اپنی بزدلی کا احساس ہوا۔ لیکن یہ سلیٹی سڑکیں بہت دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اور موٹریں بہت تیز ہوتی ہیں مجھے رئیس سے کوئی ضد نہیں، جو آپ کو لے اُڑا۔ مجھے ان رئیسوں سے کوئی دشمنی نہیں، جنہوں نے ہنگھٹوں کے قریب گزرتے ہوئے سریلے ہارن بجائے اور لاریوں پر شہروں کی عفونتیں لاد لائے مجھے غرض ہے، تو صرف اس رئیس سے، جو روشناں ایسی لڑکی کو ہمراہ لے گیا ـــــ اب تک میں صرف اس لئے جیتا رہا ہوں، کہ مجھے رئیس

نہیں تو کم از کم روشناں ہی مل جائے ۔ جو جھیل پہ جھکی ہوئی نقرئی سڑک کے اس پار چاندی کی نگری میں جانا چاہتی تھی ۔ میں اس سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آسمان کے ستاروں، چاندی کے سکوں، اور عورت کی آنکھوں میں ایک ہی قسم کی آگ ہے؟ اور کیا موٹروں کی چمکتی ہوئی سیٹوں اور محلوں کے گدگدے صوفوں میں، میں بھی وہی لطافت اور گداز ہے، جو صاف چٹانوں اور سفید کنکروں اور لہراتی ہوئی گھاس کے بستر میں ہے؟

مجھے صرف یہی سوال پوچھنا تھا، روشناں سے، اس خلاپت رئیس سے ـــــ تمام انسانوں سے ـــــ اور ان تمام انسانوں کے خدا سے ـــــ اور اب جبکہ بہتر خزاؤں اور بہاروں نے مجھے پال پوس کر اس قابل بنایا ہے کہ طویل زندگی کی بجائے مرگ ناگہانی کی دعا مانگوں ۔ میں یہ سوال اور اس سوال کا جواب آنے والی نسلوں کے حوالے کرتا ہوں ۔

ترکِ دوستی

درویش میرٹھی

کہاں تک میں بھلا خونِ جگر پیتا رہوں ساقی
پلا دے آج تو مجھ کو شرابِ لالہ گوں ساقی

سنانے تجھ کو آیا ہوں میں رودادِ الم اپنی
یہاں اب اور میرا کون ہے جس سے کہوں ساقی

مجھے اس ہوش ہی نے تو پشیمان رکھا ہے آفت میں
مری توبہ اگر میں ہوش کا اب نام لوں ساقی

نہ جانے ہے جنوں کی ابتدا یا انتہا غم کی
مرا جی چاہتا ہے اپنی حالت پر ہنسوں ساقی

فریب اتنے جہانِ رنگ و بُو میں کھائے ہیں میں نے
ہنسے غنچہ تو میرا خشک ہو جاتا ہے خوں ساقی

کہاں کے دوست، کیسے دوست، کس کے دوست، سب دیکھو کا
وفا کے خون سے ہے ان کا چہرہ لالہ گوں ساقی

ہے اس مطلب کی دنیا میں نہ یہ اپنا نہ وہ اپنا
یہاں تو ایک سے ہیں سب ہی کس کا نام لوں ساقی

سمجھتا ہوں مگر پھر بھی میں دھوکا کھائے جاتا ہوں
ہے لفظِ دوستی میں کیا کوئی صرفِ فسوں ساقی

میں ان ہشیار دیوانوں کو کل تک دوست کہتا تھا
کوئی پوچھے جو مجھ سے آج تو میں کیا کہوں ساقی

نہیں ہے مجھ کو شکوہ دوستوں کی بے وفائی کا
میں اس گمراہ کُن منزل سے کوسوں دور ہوں ساقی

میں سب کچھ بھول جانے کے لئے تیار ہوں لیکن
خلش سی ہے جو اک سینے میں اس کو کیا کروں ساقی

یہ دل میں چبھتی ہوئی باتیں نکل سکتی نہیں دل سے
کوئی کانٹے نہیں جن کو پکڑ کر کھینچ لوں ساقی

ہے رسمِ دوستی بھی غم ہے ترکِ دوستی بھی غم
تو ترکِ دوستی کو ترکِ الفت کیوں کہوں ساقی

یہ غم ہے جاں گُسل تو کیا ضروری ہے کہ مر جاؤں
مجھے جینے کا حق ہے کیوں نہ میں آخر جیوں ساقی

الم ہے اُس طرف اور زندگی کی روح پر ضربیں!
خودی ہے اس طرف اور زندگانی کا جنوں ساقی

یہ بادہ غم رُبا بھی ہے یہ بادہ روح پرور بھی:
پلائے جا پلائے جا میں جب تک بھی پیوں ساقی!

www.taemeernews.com

عشق

خدیجہ مستور

وہ مکان کے اندر داخل ہی ہونیوالا تھا کہ گانے کی آواز نے اس کے قدم تھام لئے ہے۔

"عشق میں یونہی بے سکوں کٹتی ہیں" جند گانیاں"

اندر سے کسی عورت کے ہولے ہولے گانے کی آواز آنے لگی۔

"یہ بات ہے ——— وہ سوچنے لگا ——— جبھی تو ہوسٹل کے بجائے یہاں الگ تھلگ مکان لے کر رہا گیا ہے طالب علمی کا زمانہ اور یہ حرکتیں اس کا دل چاہا کہ وہ دڑانہ اندر گھستا چلا جائے اور پھر دیکھے کہ کیا ہو رہا ہے ———"

لیکن گانے والی عورت کے خیال نے اسے زنجیر کھٹکھٹانے پر مجبور کر دیا۔ گانے کی آواز بند ہو گئی ——— اندر جوتیوں کی سٹ بٹ ہونے لگی اور چند ہی منٹ بعد دروازے کھل گئے اس کے سامنے ایک تیئیس چوبیس سالہ بھاری بھرکم کولھوں والی سانولی سی عورت کھڑی تھی۔ ہاتھوں میں آٹا بھرا ہوا اور میلی سی ساری پہنے ہوئے۔ اس نے سمجھ لیا کہ ملازمہ ہے۔

"جمیل صاحب ہیں"؟ اس نے سوال کیا۔

"جی ہاں سو رہے ہیں" عورت نے لجا کر جواب دیا اور اس کی سیاہ آنکھیں پھولے ہوئے پپوٹوں میں چھپ گئیں

"چلو میں جگا لوں گا" اس نے کہا اور عورت دروازے کے پاس سے ہٹ گئی تو وہ اندر داخل ہو گیا۔

"وہ سو رہے ہیں" عورت نے سامنے کے چھوٹے سے کمرے کی طرف انگلی سے اشارہ کر دیا اور خود باورچی خانہ میں چلی گئی۔ اس نے ایک سرسری نظر سے گھر کا جائزہ لیا اور پھر جمیل کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ صاف ستھرے بستر پر بے خبر سویا ہوا تھا۔ اسے اس طرح سویا ہوا دیکھ کر اس کا دل چاہا کہ اس کی فاختہ اڑا دی جائے، بچپن میں دونوں کس قدر دشمن تھے ایک دوسرے کی نیند کے ——— جہاں سوتا پایا اور فاختہ اڑا دی لیکن اس وقت اسے فاختہ اڑانے کا سامان کہاں سے ملتا ——— وہ اس کے تلوے میں گدگدی کرنے لگا۔

"ہوں! ہوں"! جمیل نے کروٹ لی اور پھر بے خبر ہو گیا۔ اس نے پھر زور سے گدگدی کی۔

"اری سونے بھی دے" جمیل آنکھیں بند کئے کسمسا کر بڑبڑایا۔

"ہوں!" وہ مسکرایا اور اچٹتی سی نظر سے سامنے باورچیخانہ میں بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھا جو جلدی جلدی روٹیاں پکا رہی تھی اور ترچھی ترچھی نظروں سے کمرے کے اندر بھی دیکھتی جا رہی تھی۔

"ابے! کم بخت عورت کے ہی خواب دیکھا کرتا ہے" اب کی اس نے اسے زور سے جھنجوڑ ڈالا اور جمیل کچھ بڑبڑایا سا اٹھ بیٹھا چند منٹ تک وہ حیرت سے اسے دیکھتا رہا اور پھر ایک دم اس سے لپٹ گیا۔

"کتنے دن بعد آیا ہے تو! اف اوہ! پورے دو سال بعد"

"ہاں! چھٹی ہی نہ ملی۔ کیا کرتا۔ اور وہ کون ہے" بھابھی؟ اس نے باورچی خانے کی طرف اشارہ کیا۔

"بھاگ ——— جمیل نے اس کے بازو پر گھونسہ مارتے ہوئے کہا ——— نوکرانی ہے ———"

پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ بڑی بدمعاش ہے اور بقول اس کے مجھ سے "عشق" کرتی ہے اور نہ جانے کتنوں سے کر چکی ہے۔ جمیل نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

"ہے تو یار نمکین سی۔ تجھے نمک تو نہ منگانا پڑتا ہوگا"؟

"ہاں ——— آں ——— ابے چھوڑ ان باتوں کو ——— چل ہاتھ منہ دھولے پھر کھانا کھایا جائے۔ تو بھی بھوکا ہوگا ——— ایک بج رہا ہے۔ آج یہ دیر سے آئی تھی کھانا پکانے"

وہ دونوں کمرے سے کچھ دور بنے ہوئے چھوٹے سے غسل خانے میں چلے گئے اور جب واپس آئے تو گرم گرم روٹیاں اور قورمہ سے بھری ہوئی پلیٹ میز پر رکھی ہوئی تھی وہ دونوں کرسیاں کھینچ کر کھانے بیٹھ گئے۔

"اچھا پکاتی ہے کھانا" اس نے کہا۔

www.taemeernews.com

"ہاں اسی لئے تو اسے رکھے ہوئے ہوں" ورنہ کب کا نکال چکا ہوتا سالی۔ سب میں کہتی پھرتی ہے کہ میں اس سے "عسق" کرتا ہوں اور وہ مجھ سے، لوگوں کو ——— جمیل نے باورچی خانہ کی طرف گردن گھمائی۔

"اے ارے بہو، پانی تو لادو یا سینہ پہ گھونسے مار مار کر نوالے اتاروں" وہ شرارت سے مسکرایا۔

"جی لائی" بہو گلاس صاف کرنے لگی

"بہو خاصا میٹھا لفظ ہے۔ کیا اس کی شادی ہو چکی ہے؟"

"ارے نہیں، میں تو یونہی اسے بہو کہنے لگا ہوں"

"اچھا! لیکن یار سچ بتا کہ آخر یہ "عسق" چل کیسے پڑا عورت تو خاصی چکنی چکتی معلوم ہوتی ہے"

بھئی بات کچھ نہیں، اس بار جب تم آئے ہو تو تم یہ جانتے ہی تھے کہ میں پڑوس سے کس قدر نالاں تھا نہ پڑھنے اور نہ پڑھنے دیتے میں نے بھی سب چھوڑ چھاڑ یہ مکان لے لیا اور ہوٹل میں کھانے کا انتظام کر لیا۔ لیکن وہاں کے کھانے سے جلد ہی طبیعت خراب ہو گئی تو میرے ایک دوست نے اس عورت کو رکھوا دیا۔ پہلے یہ ان ہی کے ہاں کام کرتی تھی اور ——— جمیل چپ ہو گیا۔ بہو پانی لئے آ رہی تھی۔

"رکھ دو یہاں میز پر، تم ایسی ظالم ہو کہ میرے دوست کو آدھا کھانا بغیر پانی کے کھلا دیا" جمیل نے ہنس کر کہا اور بہو اس پر ایک نظر ڈالتی ہوئی جانے کے لئے مڑ گئی، اس نے دیکھا کہ چلنے میں بہو کے کولھے بری طرح تھرک رہے ہیں۔

"ہاں تو کیا کہہ رہے تھے" اس نے پوچھا

"ہاں میں کہہ رہا تھا کہ ——— جمیل نے پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا اور پھر پانی پینے کے بعد کہنے لگا ——— یہ وہیں ملازم تھی، کہیں ایک دن میرے دوست نے دل بہلانے کے لئے اسے چھیڑ دیا کہ مجھے تو تم سے عشق ہے، شادی کر دوں گا تو بس تمہارے ساتھ ورنہ کچھ کھا کے سو رہوں گا ——— جس دن سے اس نے ملازمت اور عشق دونوں کے سخت تر الفاظ انجام دینا شروع کر دیئے۔ پھر میرے دوست کی شادی ہونے لگی تو وہ ڈرا کہ کہیں یہ میری بیوی سے کچھ نہ بک دے ——— اپنی ماں سے یہ کہکر نکلوا دیا کہ بہت بدمعاش ہے یہ عورت شریفوں کے گھر میں رہنے کے قابل نہیں، میں نے اسے بازاروں میں غنڈوں سے ننگا مذاق کرتے ہوئے دیکھا تھا ——— تب انہوں نے نکال باہر کیا اور بے چارے کی جان بچی ——— اب یہ مجھ سے "عشق" ہو رہا ہے۔ جمیل اتنے زور سے ہنسا کہ اس کے منہ کا چبا ہوا نوالہ دکھائی دینے لگا۔

"خود سے کرنے لگی تھی یا تم نے شروع کیا تھا" اس نے پوچھا۔

"ارے یار مجھے اس کا حال تو معلوم ہی تھا دل بہلانے کو اسے چھیڑ دیا، بس اس دن سے میری جان کو آ گئی، ہر سٹے پوچھا کرتی ہے "سادی" کب کرو گے، جیسے ہمیں بیوی نصیب ہی نہ ہو گی۔

"ہو گی کیوں نہیں چاند جیسی"

"بہو برتن لے جاؤ آ کر" جمیل نے آواز دی اور ہاتھ دھونے لگے۔ وہ آئی کچھ بہکے بہکے قدم ڈالتی اور خالی برتن اٹھا کر چلی گئی۔ اور وہ دونوں ایک ہی بستر پر دراز ہو گئے۔

"تمہیں کچھ چیزیں دکھاؤں" جمیل لیٹے سے ایک دم اٹھ بیٹھا اور کپڑوں کی الماری کھول کر ایک دفتی کا ڈبہ لئے پھر بستر آ بیٹھا۔ وہ سوچ رہا تھا خدا جانے اس میں ایسی کون سی خاص چیز ہو گی، کہ جمیل نے ڈبہ کھول کر چھ سات بڑے عجیب عجیب رنگوں کے مفلر، دس بارہ ریشمیں گہرے گہرے سرخ اور زرد رنگوں کے رومال اور چھ سات گنوار و انگوٹھیاں بستر پر ڈال دیں

"یہ بہو نے مجھے تحفے دیئے ہیں" سمجھے دوست ——— وہ ہنسا۔ کم بخت اپنی تنخواہ یوں ہی برباد کرتی ہے۔ بھلا میرے کس کام کے یہ۔ ایک بھی تو ڈھنگ کی چیز نہیں، ہزار دفعہ ڈانٹا کہ یہ مت کیا کر لیکن وہ زبردستی میرے سر منڈھ دیتی ہے اب جب اسے نکالنے لگوں گا تو سب کی قیمت دیدوں گا"

"یہ سب رجھانے کے طریقے ہیں واقعی عورت ہے بڑی چالاک" اس نے حیرت سے باورچی خانے کی طرف نظریں دوڑائیں۔

"بڑی چالاک"، جمیل سب چیزیں ڈبہ میں بند کر کے

الماری میں رکھ آیا اور اس کے پاس لیٹ گیا۔ وہ سفر کی تکان سے بہت تھکا ہوا تھا اور پھر کھانا کھانے کے بعد سے کچھ ایسی سستی اور نیند کا غلبہ ہوا کہ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

"سو رہو تم تھکے ہوئے ہو" جمیل نے کہا۔

"اور تم" اس نے سوئی ہوئی آواز میں پوچھا

"تم جب تک سوؤ گے میں کچھ ضروری کتابیں اور کاپیاں خرید لاؤں گا"

"اس کڑاکے کی دھوپ میں"؟

"ارے یار ذرا دیر کی بات ہے" وہ اٹھ کر کپڑے تبدیل کرنے لگا۔

"اور بھو"؟ اس نے آنکھیں بند کئے ہوئے پوچھا۔

"جب دل چاہے گا کھانا لے کر چلی جائے گی" وہ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد باہر چلا گیا اور وہ ایک دم بے خبر سو گیا۔

ابھی اسے سوئے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ زمین پر کسی برتن کے گرنے کی تیز آواز نے اسے سوتے سے چونکا دیا۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا کہ بھو نل کے پاس بیٹھی برتن مانجھ رہی ہے۔ اس نے کروٹ لے کر پھر آنکھیں بند کرلیں۔ ع

عسق میں یونہی بے سکوں کٹتی ہیں جندگانیاں

ہلکی ہلکی نیند میں اسے سنا کوئی گا رہا ہے۔ دور سے بہت دور سے — اس نے کروٹ لی۔ غنودگی میں اسے گانا بڑا ہی بھلا لگ رہا تھا۔ برتنوں کی پھر تیز کھڑ بڑ ہوئی اور اس کی نیند قطعی اچاٹ ہوگئی بھو آہستہ آہستہ گائے جا رہی تھی۔ ع

عسق میں یونہی بے سکوں کٹتی ہیں جندگانیاں

اس نے سوچا گاتی تو اچھا ہے لیکن "ش اور ز" نہ ادا ہونے سے کتنا برا لگتا ہے اور پیاس محسوس کرتے ہوئے اس نے بھو کو آواز دی

"ایک گلاس پانی لاؤ بھو"

"لائی میاں"

وہ پلنگ سے پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ بھو اپنے بھاری بھاری کولھے مٹکاتی ذرا لجاتی کمرے میں آئی اور پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا پھر نظریں جھکا کر دیوار سے ٹک کر کھڑی ہوگئی اس نے اسے غور سے دیکھا بھولے بھولے سانولے سے چہرہ پر دبے دبے وقار کی جھلک۔ آنکھوں میں عجیب سی چمک اور بے کل سا جسم۔ وہ شربت کے گھونٹوں کی طرح آہستہ آہستہ پانی پیکر سوچنے لگا کہ اسے کچھ چھیڑا جائے تو وقت مزے سے کٹ جائے گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا گاتی ہو" اور پھر مسکرا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالدیں۔ وہ اٹھلائی، کچھ سمٹی اور جھکی جھکی نظروں سے زمین تکنے لگی۔

"بیٹھ جاؤ" اس نے کہا اور وہ پھسکڑا مار کر فرش پر بیٹھ گئی

"تم گئی نہیں اپنے گھر"

"جی اب کام کر چکی ہوں تو جاؤں گی" وہ اپنی ساری کا پلّو انگلی میں لپیٹنے لگی اور وہ سوچنے لگا کہ اب کیا بات کی جائے جو اسی کی زبانی اس کے معاشقے سنے جائیں۔

"اچھی طرح رہتی ہو یہاں نا؟" اس نے پوچھا

ہاں — آں۔ بھو نے ایک نکلتی ہوئی آہ کو دابا۔

"بابو جی تو تم کو بہت چاہتے ہیں" اس نے کہا۔

"آپ سے کہتے تھے کیا؟" مارے حیرت کے بھو کی آنکھیں اُبل پڑیں اور پھر لمحہ بھر ہی بعد چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

"ہاں کہتے تھے کہ میں جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں بھو کو"

"آپ تو بناتے ہیں میاں" وہ اٹھلائی اور پھر ایک دم رنجیدہ ہو گئی۔

"نہیں اب نہیں چاہتے" پہلے بہت چاہتے تھے —— اس نے ایک آہ بھری اور پھر آہستہ آہستہ کہنے لگی —— اب آپ سے کیا چھپانا پہلے تو رات کو دو دو بجے تک مجھے اپنے پاس روکا کرتے تھے۔ کاش [illegible] کر وہ باورچیخانہ میں بیٹھا کرتے تھے جب تک میں کھانا پکاتی اس وقت تک ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہتے پر اب —— اب تو سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے ذرا ذرا سے قصور پر ڈانٹتے ہیں —— ہائے! کیا دن تھے وہ بھی جب انھیں مجھ سے "عسق" تھا اس نے رنجیدہ ہو کر سر جھکا لیا اور اسے ہنسی آتے آتے رک گئی۔

"عسق" ہوتا ہی بڑا ظالم ہے" اس نے کہا اور آئی ہوئی ہنسی کو روکنے کے لئے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔

"بڑا جالم ـــــ وہ آہ بھرتے بھرتے رہ گئی ـــــ ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ اس کے پیچھے دو دو وقت کھانا نہیں کھایا۔ اپنے پیسے کو پیسہ نہیں سمجھا ـــــ جو کچھ کمایا سب "عشق" کی راہ میں لٹا دیا۔ اپنی جات والوں میں جس سے سادی لگی تھی اس سے انکار کر دیا۔ سب کے برے ہوئے، بدنامی الگ ہوئی" اس نے زور سے ٹھنڈی سانس بھری ـــــ اب وہ بہت رنجیدہ ہو رہی تھی اور وہ اپنی آتی ہوئی ہنسی کو روک کر سوچ رہا تھا یہ کسی دن عشق کی راہ میں بے خود کو نہ لٹا بیٹھیں۔ قربانی بھی تو ہیں بڑی بے باکی سے "عشق" ـــــ

"کون ذات ہو" اس نے پوچھا

"دھوبی"

"تم نے برا کیا جو شادی نہ کی"

"کیسے کرتی اس زمانے میں ایک بابو جی کے یہاں نوکری کرتی تھی انہیں مجھ سے "عشق" ہو گیا کہنے لگے میں تم سے سادی کروں گا۔ میں نے اپنے لوگوں میں انکار کر دیا"

"تو اب کر لو اپنی ذات میں"

"اب نہیں کروں گی" اس کے بعد سے تو وہ لوگ مجھے اچھے نہیں لگتے "میلے کچیلے" نہ پڑھے نہ لکھے اور پھر بھلا وہ لوگ کیا جانیں آپ لوگوں جیسا "عشق" کرنا"

"ہاں سچ ہے" وہ مسکرایا اور سوچنے لگا کس قدر بے باک، اور بد معاش عورت ہے جو عشق و محبت پر ایک مرد سے باتیں کرنے پر ذرا نہیں جھجکتی۔

"اب تک تم نے کتنے لوگوں سے محبت کی ہوگی؟ اس نے سوال کیا اور کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"میں نے کیوں کی ـــــ وہ کچھ چڑ کر کہنے لگی ـــــ لوگوں نے کی مجھ سے محبت۔ میں تو یہ کچھ جانتی بھی نہ تھی پہلے پھر جہاں نوکری کی وہیں کے میاں مجھ پر جان دینے لگے مگر نباہا کسی نے نا ہم تو کہتے ہیں کوئی جندگی کا ساتھ دے تب کی بات اور اسی کارن میں نے اپنے کو برباد و خوار کر رکھا ہے" وہ زیادہ رنجیدہ ہو گئی۔

"مگر یہ بابو جی تو تم کو بہت چاہتے ہیں" اس نے اس کو خوش کرنے کے لئے کہہ دیا۔

"سچ"؟ اس کا چہرہ سوالیہ نشان بن کر رہ گیا۔

"واقعی" وہ سر جھکا کر۔ نہ جانے کیا سوچنے لگی اور وہ غور سے اس کے چہرہ کو دیکھنے لگا ـــــ کچھ بے چینی کچھ مسرت اور ہلکی سی مایوسی کے ملے جلے جذبات اس کے چہرہ سے نمایاں تھے وہ سوچتے سوچتے ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھو"

"نہیں میاں اب جرا گھر جانا ہے۔ دیکھوں دادا کیا کر رہا ہے۔ اندھا ہے۔ بے چارہ جانے بھوکا پیاسا نہ پڑا ہو" ویسے بھی میں ایسی بے ہوش رہی ہوں ان بابو جی کے پیچھے کہ دو دو وقت اسے کھانا بھی نہیں دیا جا کے۔ ابھی آتی ہوں جرا کے" یہ کہہ کر وہ کولھے پھینکتی ہوئی کمرے سے نکل گئی اور باہر کا دروازہ بھیڑ کر چلی گئی۔

وہ پھر لیٹ گیا اور بھو کے متعلق نہ جانے کیا کیا سوچنے لگا اتنے میں جمیل دو لڑکوں کے ساتھ آ گیا اور وہ پھر اٹھ بیٹھا

"یہ میرے بچپن کے دوست مسٹر اقتدا، اور اقتدا یہ میرے کلاس فیلو نواب اور منیر۔ جمیل نے تعارف کرا دیا۔ اور تینوں نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملائے۔

"اب تک بھو نہیں آئی؟ ذرا چائے بناتی" جمیل نے سب کو بٹھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا بھو نہیں ہے" جبھی تو میں دیکھوں گھر کچھ سونا سونا ہو رہا ہے" منیر بولا! اور سب کھلکھلا کر ہنس پڑے، اتنے میں بھو آ گئی۔

"بھو تم اب چائے بناؤ" جمیل نے باورچی خانہ کی طرف دیکھ کر چیختے ہوئے کہا۔ بھو آگ جلا رہی تھی اور ترچھی ترچھی نظریں کمرے کے اندر بھی ڈالتی جاتی۔

"تمہاری بھو بہت مسر مسر کام کرتی ہے" نواب نے باورچی خانے کی طرف نظریں دوڑائیں۔

"بھو جو ہے ابھی بے چاری" منیر مسکرایا۔

"اور پھر عشق کا زمانہ اس لئے بھی سست ہے بیچاری" اقتدا ہنسا۔

"ہوں"! جمیل اطمینان سے کرسی پر دراز ہو گیا۔

"اگر مجھے ایسی نوکرانی مل جائے تو ——" نواب نے اپنی چوہے جیسی ناک کے نتھنے پھڑ پھڑائے۔

"اور میں تو بس ——" منیر منہ میں آیا ہوا پانی غٹ سے نگل گیا اور سب پر جیسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا اور پھر جیسے بہو چائے کی کشتی اٹھائے کمرے کے اندر آنے لگی سب سنجیدہ ہو گئے۔ جمیل نے کرسیاں کھینچ کر منیر کے گرد ڈال دیں۔ اقتدا پیالیوں میں چائے بنانے لگا۔

"بیٹھ جاؤ بہو" منیر نے کہا۔ اور وہ خاموشی سے ایک طرف فرش پر بیٹھ گئی اقتدا نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ صاف ستھری ساری اور بنے سنورے بالوں کی وجہ سے وہ کچھ اچھی لگ رہی تھی وہ سوچنے لگا —— دادا کو کھانا کھلانے کا تو محض بہانا تھا یہ گئی تھی صرف بننے ٹھننے اور ——

"بہو ہم لوگوں نے سوچا ہے کہ جمیل کا امتحان ہونے کے بعد چپکے سے تمہاری شادی کر دی جائے —— نواب انتہائی سنجیدگی سے کہنے لگا —— اور چپکے سے اس لئے کرنا چاہتا ہوں کہ ان کے والدین کو خبر ہو ورنہ وہ ہرگز تمہاری شادی نہ ہونے دیں گے۔"

بہو نے مارے حیرت کے آنکھیں پھاڑ کر نواب کو دیکھا اور سر جھکا لیا اقتدا اور منیر اپنی ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں سرخ ہو رہے تھے۔

"تم بھی تو آخر کچھ سوچنے لگیں؟" نواب نے پھر کہا۔

"کچھ بھی نہیں، ہم تو کہتے ہیں جو آپ لوگوں کی "مرجی" ہو وہ کریں۔ میں تو آپ ہی سب کا سہارا لئے ہوں، ساس سسر کو تو خیر میں پاؤں پڑ کر اور خدمت کر کے "راجی" کر لوں گی۔" بہو نے سعادتمندی سے سر جھکا دیا۔

جمیل اپنے دیدوں کو قلا بازیاں کھلا رہا تھا آج منیر چائے کے گھونٹوں میں ہنسی پی جانے کی کوشش کر رہا تھا اور اقتدا بہو کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو یہ منہ اور مسور کی دال؟

"نہیں تم فکر نہ کرو، وہ سب خود ہی چند دنوں میں من جائیں گے آخر تو جمیل بھی تم کو چاہتا ہے اگر شادی نہ ہوئی تو خودکشی نہ کرے گا بے چارہ" منیر نے مسکرا کر کہا اور بہو جمیل کو کن انکھیوں سے دیکھ کر سچ مچ کی بہو بنی لجاتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔

"اے لو! بجا کے وہ تو گئیں" جمیل نے ناک پر انگلی رکھی اور سب زور سے ہنس پڑے چائے پینے کے بعد منیر کھڑا ہو گیا

"اچھا اب سب لوگ گھومنے چلیں گے" منیر نے کہا۔

وہ سب بھی کھڑے ہو گئے اور پھر [illegible] سے آئینہ میں اپنی اپنی ٹائیوں کی گرہیں درست کرتے ہوئے کمرے سے نکل آئے۔

"کیا پکے گا شام کے لئے" [illegible] نے جمیل سے پوچھا۔

"بالکل بیویوں کی طرح بات کرتی ہے تم سے" نواب نے انگریزی میں کہا۔

"ہاں" جمیل ہنسنے لگا۔

"جو دل چاہے پکا لینا" جمیل نے بہو کی طرف غور سے دیکھا اور وہ اس قدر لجائی کہ دوہری ہو گئی۔ چہرے پر خون چھلکنے لگا ——

"بہت خوش ہے آج، ایک عرصہ کے بعد جو میں نے سیدھے منہ بات کی ہے نا" جمیل نے بھی انگریزی میں کہا اور پھر سب باہر نکل گئے۔

رات کے دس بجے اقتدا اور جمیل واپس ہوئے صحن میں دونوں کے لئے صاف ستھرے بستر لگے ہوئے تھے۔ بہو باورچی خانے میں دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھے بیٹھے سو رہی تھی جوتوں کی چرمر سے ایک دم جاگ اٹھی اور پھر جلدی جلدی کھانا نکالنے لگی اقتدا کو اس کی یہ ادا کچھ پسند آگئی کپڑے تبدیل کرنے کے بعد دونوں کھانا کھانے بیٹھ گئے اور بہو قریب ہی زمین پر بیٹھ کر نکھرے ہوئے چاند کو گھورنے لگی اقتدا کا دل چاہا کہ اس کو کچھ چھیڑا جائے لیکن بہت دیر تک گھومنے سے اس کی طبیعت کچھ مکدر سی ہو رہی تھی اور پھر جمیل بھی ذرا بیزار سا نظر آ رہا تھا۔ وہ جب تک کھانا کھاتے رہے بہو ٹکور ٹکور کر چاند تکتی رہی کھانے کے بعد وہ دونوں اپنے اپنے بستروں پر دراز ہو گئے بہو نے برتن باورچی خانہ میں رکھ دیئے اور پھر بیٹھ کر چاند دیکھنے لگی۔

"آج عشق زوروں پر ہے" آخر اقتدا سے نہ رہا گیا اور اس نے انگریزی میں کہہ دیا۔

"آوارہ ہے" جمیل نے بڑی ہی بیزاری سے کہا۔

"بہو اب تم کھانا کھا کر جاؤ" جمیل نے کچھ کرخت لہجہ

www.taemeernews.com

کہا۔ بہو جواب دیئے بغیر باہر جانے لگی۔

"اور کھانا نہیں لیا تم نے؟" جمیل نے پوچھا۔ بہو مڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"آج بھوک نہیں بابوجی۔"

"عشق" سے پیٹ بھرے گی آج ——— اقتدا بہت ہی آہستہ سے بولا ——— اور پھر زور سے کہنے لگا نہیں کھانا لے لو۔ آخر تمہارا داد: بھی تو بھوکا ہوگا۔"

"بہت اچھا۔"

بہو نے اپنا کھانا نکالا اور آہستہ آہستہ دروازہ کی طرف بڑھنے لگی۔

"صبح تڑکے ہی آ جانا" اقتدا صبح کی گاڑی سے جائیں گے" جمیل نے کہا اور وہ جواب دیئے بغیر دروازہ سے باہر ہو گئی تو جمیل نے اٹھ کر دروازے بند کر لئے۔

صبح بہت جلد اٹھنا تھا اس لئے وہ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگے۔!

صبح تڑکے اس کے قریب تیز کھسر پھسر ہونے سے اس کی آنکھ کھل گئی لیکن یہ دیکھتے ہی اس نے اپنی آنکھیں پھر سے بند کر لیں کہ بہو جمیل کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر رہی تھی۔

"کل آپ کے دوست کہتے تھے کہ آپ تو مجھے اپنی جان سے زیادہ "عزیز" رکھتے ہیں ——— وہ سرگوشی کے لہجہ میں کہنے لگی ——— ورنہ میں تو یہی سمجھتی تھی کہ اب آپ کو مجھ سے نفرت ہو گئی ہے چپکے چپکے روک رہی جاتی۔"

"اچھا! اب دیکھو ہٹ جاؤ یہاں سے ورنہ اقتدا جاگ پڑے گا۔ پھر کر لینا اپنی باتیں۔"

"اچھا۔" وہ اس کے پاس سے اٹھ گئی

تچ! تچ! ——— اقتدا نے کنکھیوں سے دیکھا کہ بہو جمیل کے پیروں پر جھکی اس کے پاؤں چوم رہی ہے۔

"میرے آقا! میرے سرتاج! ——— میں عمر بھر آپ کی خدمت کروں گی مجھے اپنا بنا لیجئے۔" وہ جیسے خواب میں بڑبڑائی جمیل نے کسمسا کر آہستہ سے اپنے پاؤں سمیٹ لئے۔ صبح کا تارا دم توڑ رہا تھا اور سڑک پر تانگوں کے پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ شروع ہو گئی تھی۔ بہو باورچی خانہ میں چلی گئی۔ اقتدا کو بہو کے یوں پاؤں چومنے پر رحم آ رہا تھا۔ لیکن جب اس نے یہ سوچا کہ یہ کس قدر بدمعاش ہے اور نہ جانے کتنوں کے یونہی پاؤں چوم چکی ہوگی تو اس کے دل میں نفرت کے جذبات امڈنے لگے۔

جمیل نے اسے سویا ہوا سمجھ کر جھنجوڑ ڈالا اور وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ پڑا وہ جلدی جلدی ضروریات سے فارغ ہوئے منہ ہاتھ دھویا اور جب کپڑے تبدیل کر چکے تو بہو نے چائے کا سامان میز پر سجا دیا۔ چائے کے بعد جمیل نے اقتدا کا پھیلا ہوا سامان اس کے سوٹ کیس میں بھر دیا اور پھر دونوں باہر کے دروازے کی طرف بڑھے۔ بہو باورچی خانے کی دیوار سے لگی کھڑی تھی۔

"سلام اور ہاں بہو اپنی شادی میں ہمیں ضرور بلانا" اس نے باہر نکلتے ہوئے کہا اور جمیل زور سے ہنس پڑا ———!

ڈھائی تین سال بعد اقتدا جمیل اور اس کی بیوی کہیں ٹی پارٹی میں مدعو تھے اس لئے وہ اس وقت تنہا پڑا تھا جمیل کی جوان ملازمہ نصیبن اپنے کام میں مشغول تھی۔ اس کی بہو سے ملتی جلتی ادائیں دیکھ کر اقتدا کو بہو یاد آنے لگی۔

جمیل نے ایک خط میں لکھا تھا کہ اس نے بہو کو ملازمت سے الگ کر دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود جب دیکھو وہ اپنا گھر سمجھ کر اس کے پاس آ دھمکتی ہے۔ پھر جمیل نے بہو کے متعلق کچھ نہ لکھا اور نہ اس نے ہی کچھ پوچھا۔ لیکن اب جب سے آیا تھا اس نے کئی بار چاہا کہ بہو کے متعلق کچھ پوچھے آیا اسے جمیل کی بیوی کالج میں ملازم ہونے کا علم ہے کہ نہیں، اب بھی وہ اس سے ملتی ہے کہ نہیں؟ اس کے عشق کا کیا عالم ہے؟ لیکن وہ ایک بات بھی نہ پوچھ سکا۔ نئی نویلی بیوی کالج کے ٹائم کے علاوہ سائے کی طرح جمیل کے ساتھ رہتی۔

دیر تک اکیلے پڑے رہنے سے اس کا دل گھبرانے لگا تو کپڑے تبدیل کر کے پیدل ہی گھومنے نکل گیا۔ اور واپسی میں غیر ارادی طور پر ایک گلی میں ہو لیا جہاں نالیوں میں بہتے ہوئے گندے پانی کی بو کے بھبکے اٹھ رہے تھے، جگہ جگہ پر کوڑے کے بچھے بڑے ڈھیروں پر ہزاروں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں ... [illegible]

کالے کلوٹے ننگ دھڑنگ بچے آپس میں کھیل رہے تھے اور میلے کچیلے انسان چھوٹی چھوٹی دکانوں پر بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ اس نے جیب سے سینٹ میں بسا ہوا رومال نکال کر ناک پر رکھ لیا۔ اور تیزی سے گلی طے کرنے لگا ——

"تنک تنک تانیں تائیں" —— "عشق" میں یونہی بے سکوں کٹتی ہیں "جندگانیاں" گلی کی موڑ پر وہ ایک دم ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا۔ چھوٹی سی دو دری دوکان میں بہو بیٹھی روئی دھنک دھنک کر گارہی تھی۔

"بہو" وہ بے ساختہ پکار اٹھا۔ بہو نے اس کی طرف گردن موڑی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے اس طرح دیکھنے لگی جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا ہو کہ یہ اقتدا ہو سکتا ہے ادھر وہ بھی اسے کچھ متعجب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کتنا فرق تھا اب سے ڈھائی تین سال پہلے کی بہو اور اس بہو میں، لٹا ہوا چہرہ، میلی آنکھیں اور دھنسے ہوئے پپوٹے۔

آپ! میاں کب آئے؟

"کل —— اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور کہو بہو کیا حال چال ہیں۔ اور کیا نوکری کرنا چھوڑ دی؟"

ہاں میاں! اب کلیجے میں بوتا نہیں رہا نوکری کرنے کا"

وہ سر جھکا کر نہ جانے کیا سوچنے لگی معلوم ہوتا ہے آج کل بُری طرح کسی کے "عشق" میں گرفتار ہو کیوں؟ اس نے مذاق سے پوچھا ——

"عشق" —— بہو جیسے تلملا سی گئی لٹے ہوئے چہرے پر ایک رنگ آیا اور غائب ہوگیا۔

"آپ کے جانے کے بعد —— وہ آہستہ آہستہ کہنے لگی —— بابو جی نے نکال دیا۔ اس کے بعد منیر اور نواب میاں نے اپنے یہاں نوکر رکھا۔ چار چار دن "عشق" کیا اور پھر نکال دیا' اور بھی بہت سی جگہوں پر کام کیا تو انھوں نے بھی ——

وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہوگئی اور ایک لمحہ بعد کہنے لگی۔

"جندگی کا ساتھ کسی نے بھی نہ دیا۔ بڑے بڑے دکھ جھیلے' برادری سے بھی نکالی گئی پھر اپنی مرجی کے خلاف یہ کام کرنے لگی"

وہ بے حد سنجیدہ ہوکر روئی کے بنے دھنے ڈھیر کی طرف دیکھنے لگی ——

"عمر بھر اس کی غلامی کرتی جو میری جندگی کا ساتھ دیتا" وہ جیسے خواب میں بڑبڑائی۔

"بہو آخر تم نے اپنے لوگوں میں شادی کیوں نہ کرلی"

اسے بہو کی حالت سے کچھ رنج سا ہو رہا تھا۔

"نہیں میاں —— وہ ایک غمناک سی ہنسی ہنس پڑی —— یہ اپنے لوگ تو مجھے جرا بھی اچھے نہیں لگتے۔ میلے کچیلے نہ پڑھے نہ لکھے۔ اور پھر وہ لوگ کیا جانیں آپ لوگوں جیسا "عشق" کرنا۔ بغیر "شادی" کے بھی جندگی کٹ جائے گی"

اس کے ہونٹوں سے کئی دبی دبی آہیں نکل گئیں اور وہ زمین تکنے لگی۔ اس کے پپوٹوں پر نہ پوری ہونے والی تمناؤں کی کتنی ہی شکنیں پڑ گئی تھیں اب سے ۳ سال قبل اس کے یہی پپوٹے کتنے چکنے اور خوبصورت تھے۔ اقتدا کا دل اس سے ہمدردی کرنے کے لئے تڑپ اٹھا (وہ کچھ کہنے ہی) والا تھا کہ ۱۰ آدمی انگریزی لباس پہنے انگریزی میں باتیں کرتے گلی سے گذرے بہو انہیں اشتیاق سے دیکھنے لگی اور اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوگئی۔

"اب اس گلی میں جیکی پڑی رہتی ہوں کہیں آنے جانے کو دل نہیں چاہتا۔ کیونکہ آپ جیسے لوگوں کو دیکھ پاتی ہوں تو بیتا ہوا جمانہ یاد آجاتا ہے۔ اس گلی سے، آپ جیسے لوگ بہت کم گذرتے ہیں اور جس دن ادھر سے کوئی جاتا ہے تو سارا دن" ——

اس کی آنکھوں میں ساون مچل گیا "عشق' بڑا ہی 'جالم' ہوتا ہے۔ وہ سب اب تک یاد آتے ہیں" اس نے روتے ہوئے کہا اور اقتدا کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کا دل بہو کے آنسوؤں میں ڈوبا جارہا ہے۔ وہ اسے تسلی دینا چاہ رہا تھا۔ لیکن اس کی زبان نے ساتھ نہ دیا۔ وہ تلملا اٹھا۔ اسے نفرت ہونے لگی۔ اپنے سے جمیل سے' نواب سے' منیر سے۔ وہ ایک عجیب سے جذبے کے تحت آگے بڑھ گیا۔

میاں! میاں! بہو کی آواز نے اس کا تعاقب کیا۔ لیکن وہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ سردی کے باوجود اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہے تھے۔ ۲-

۲- تنک تنک —— تائیں تائیں —— "عشق" میں یوں ہی بے سکوں —— تنک تنک —— تائیں تائیں۔ عشق ہیں ——

قبر اور گلاب کا پھول

جعفر علیخاں اثر لکھنوی

قبرِ [illegible]فسردہ میں پوچھا گل سے
صبحدم ہوتی ہے کیا بارشِ شبنم اتنک

پر پرواز بھی ہیں حسرتِ پرواز بھی ہے؟
آئینہ خانے میں خود آئینہ پرداز بھی ہے؟

اے کہ تو پھول محبت کا ہے اتنا تو بتا
انکا انجام ہے کیا روحیں جو ہوتی ہیں اسیر

قبر کے گوشۂ تاریک کی گمنامی میں
کیا کمی ہوتی نہیں شورشِ ناکامی میں

قبر سے گل نے کہا سن لے اگر سننا ہے
"جسم ہے تیرے لئے روح نہیں تیرے لئے"

اشکِ شبنم سے کھنچا کرتی ہے خوشبو ایسی
شہد میں عنبرِ سارا کو ملائیں جیسے

جو لطافت میں نہیں رکھتی کہیں مثل اپنا
پھول اس طرح کا گلزار میں دیکھا نہ سنا

قید سے تن کی رہا ہو کے یوہیں روحیں بھی
جاتی ہیں سوئے فلک ہو کے تغیر سے دوچار

تیز تر طائرِ شبنم سے پرافشانی میں
مختلف نکہتیں جس طرح ملیں اور پھیلیں

خود فرشتوں کو جنہیں دیکھ کے رشک آ جائے
نازکیتائی اُدھر پیار سے تکتا جائے

"جسم ہے تیرے لئے روح نہیں تیرے لئے"
قبر سے گل نے باندازِ دل آرا یہ کہا

(وکٹر ہیوگو)

نصف بہتر

شائستہ اختر بانو سہروردی

"شیلا تمہارا دھیان کہاں ہے کیا سوچ رہی ہو؟" شیلا ہنسکر چونک سی پڑی کچھ نہیں استانی جی کہکر شیکسپیر کے تصور میں سیزر کے کیریکٹر پر استانی کا سبق غور سے سننے لگی۔ لیکن گرچہ وہ بظاہر متوجہ تھی لیکن دل کہیں اور تھا۔ استانی ایک نہایت قابل ٹیچر تھی۔ طالب علم کی طبیعت سے اس کو پوری پوری واقفیت تھی۔ شیلا کا یوں بددلی سے پڑھنا غیر معمولی بات تھی اس لئے اس نے سبق کو مختصر کرکے ختم کردیا۔ اور کہا بتاؤ شیلا تم آج کل ایسی کھوئی کھوئی کیوں رہتی ہو۔ شیلا نے نظریں نیچی کرلیں اور اس کے رخسار سرخ ہوگئے۔ استانی سمجھ گئی کہ شادی بیاہ کا ذکر ہو رہا ہوگا۔ اچھا میں سمجھ گئی۔ شیلا یہ بتاؤ کب اور کس سے۔ میرے بی اے کے امتحان کے بعد۔ ای اے سی مسٹر نریندر کمار سے۔ شیلا نے جھجکتے ہوئے کہا۔

کون مسٹر نریندر کمار۔ استانی نے چونک کر پوچھا وہی تو نہیں جو تمہارے بڑے بھائی کے ساتھ اکثر آتے ہیں۔

جی وہی شیلا نے جواب دیا۔ استانی یہ سن کر خاموش ہوگئی اس کے چہرے سے ظاہر تھا کسی گہرے سوچ میں ہے کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔ کیوں شیلا وہ تمہیں پسند ہیں۔ شیلا پھر شرما گئی اور جواب نہ دیا۔ شیلا تمہیں مجھ سے شرمانے کی ضرورت نہیں بتاؤ سچ تمہیں نریندر کمار پسند ہیں۔

ام۔ ہیں۔ جی ہاں۔ شیلا نے کہا۔ وہ بی اے آنرز ہیں۔ جی نہیں یعنی آنرز تو نہیں ایسے ہی بی۔ اے ہیں۔ اور کرتے کیا ہیں۔ جی کسی فرم میں نوکر ہیں۔ بیرسٹر ہیں پھر بیرسٹری چھوڑ دی اور کسی تجارتی فرم میں نوکری کرلی ہے۔

بیرسٹری کیوں نہیں کی۔ پتہ نہیں شیلا نے کہا

پر شیلا تم تو بڑی چلبلی ہو وہ تو خاموش طبیعت کے معلوم ہوتے ہیں۔ جی ہاں بالکل خاموش طبیعت کے، بھائی جان وغیرہ انہیں اس قدر چھیڑتے ہیں ستاتے ہیں کسی بحث میں ہمیشہ بچارے کو قائل کر دیتے ہیں اور ان سے کچھ کہے نہیں بنتا مجھے اتنا افسوس معلوم ہوتا ہے۔ ایسی طبیعت کا آدمی بے چارا کتنی تکلیفیں اٹھاتا ہوگا۔ اسے کتنا رنج ہوتا ہوگا۔ جب میں 'میری' 'ہماری' کہہ کر شیلا پھر شرما گئی۔

ہاں کہو جب تمہاری شادی ہوجائے گی تو کیا کروگی۔ جی میں سب کو ان کی طرف سے جو [illegible] دوں گی۔ ایسا قائل کروں گی کہ وہ بھی یاد کریں گے۔ کیوں استانی جی آپ ہمیشہ کہتی ہیں میں دو آدمیوں کے برابر باتیں کرتی ہوں پھر اب تو ٹھیک رہے گا مجھ کو دو آدمیوں کے طرف سے باتیں کرنی پڑیں گی۔ شریر شیلا کی آنکھیں شرارت سے چمکنے لگیں۔

استانی نے مسکرا کر کہا ہاں ٹھیک ہے۔ خدا تمہیں خوش رکھے یہ کہہ کر وہ جلدی سے اٹھ گئی اور وقت سے پہلے سبق ختم کردیا۔

دوسرے دن وہ سویرے آئی۔ جاڑوں کی دوپہر کو شیلا کی والدہ صحن میں تخت پر بیٹھی پڑھتی یا چھالیہ کترتی ہوتی تھیں۔ استانی ان کے تخت کے آگے جاکر کھڑی ہوگئی انہوں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ اخاہ استانی جی آئیے بیٹھئے اور تخت پر سرک کر جگہ دی۔ تین ساڑھے تین سال سے وہ شیلا کو پڑھاتی تھی لیکن اس عرصہ میں سردارنی صاحبہ کی مسلسل کوشش کے باوجود ان لوگوں سے بہت ہی الگ تھلگ رہتی تھی۔ نہایت خاموش افسردہ طبیعت کی آدمی تھی۔ سردارنی جی جو زندہ دل خوش باش عورت تھیں۔ چاہتی تھیں کہ استانی ان سے گھل مل کر باتیں کرنے لگیں اور کوئی زیادہ آنے جانے والا اس گاؤں میں نہیں تھا کہ ان کا دل بہلتا بعض دفعہ ان کا دل چاہتا تھا کہ شیلا کے لئے کوئی اور استانی رکھیں لیکن یہ پڑھانے کے لحاظ سے اتنی اچھی تھی اور شیلا اس کو باوجود اس کے خشک مزاج کے اس قدر چاہنے لگی تھی کہ انہوں نے اس کو بدلا نہیں تھا۔ اس لئے استانی کو خود سے آکر بیٹھتے دیکھ کر انہیں تعجب ہوا لیکن انہوں نے تعجب میں وقت ضائع کرنے کے بدلے باتیں شروع کردیں۔ کہو ٹیچر جی تمہاری لڑکی کیسی ہے بڑا لڑکا جو لاہور میں پڑھ رہا ہے۔ اس کی چھٹیاں کب ہوں گی چھوٹے

بچوں کو کیسے پڑھاتی ہو۔ اور پھر گھر کا کام بھی اور روزانہ شیلا کو ڈھائی گھنٹے پڑھانا۔ واقعی تم بڑی کمال کی آدمی ہو۔

استانی ان کے سوالات کا جواب دینے کے بعد فوراً ہی پوچھا سنتی ہوں شیلا کی نسبت ٹھہر گئی۔ ہاں مجھے جی میں تم سے کہنے ہی والی تھی میں تو چاہتی تھی اب کے کرسمس میں ہی شادی ہو جاتی لیکن سردار صاحب لڑکی کے پڑھنے کا شوق دیکھ کر کہتے ہیں کہ بی اے کر لے تو ———

یہ زیندر کمار بابو تو ایسے ہی معمولی پڑھے لکھے ہیں نا۔

اے جی نہیں۔ مجھے جی بی۔ اے ہیں بیرسٹر ہیں۔ بیرسٹری تم جانو آج کل کسی کی چلتی نہیں اس لئے نوکر ہو گئے ہیں۔ چار سو تنخواہ ملتی ہے۔ اس زمانے کے لئے غنیمت ہے اس پر سردار صاحب کے ذریعے امید ہے اور ترقی ہو گی۔

استانی چند منٹ خاموش رہی پھر اس نے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا۔

سردارنی صاحب مجھ کو شیلا کو پڑھاتے ہوئے تقریباً ساڑھے تین سال ہوئے۔ مجھ کو اس لڑکی سے بیحد محبت ہو گئی ہے اور آپ سب کی مہربانی کا بھی میرے دل میں بہت گہرا اثر ہے میں نے اب تک آپ لوگوں کی بات کا جواب جس طرح دینا چاہئے نہیں دیا کیونکہ مجھ کو زندگی کا ایسا تلخ تجربہ ہوا ہے کہ میں اب تعلقات میں رنگینی اور زندگی پیدا کرنے سے ڈرنے لگی ہوں۔ لیکن باوجود اس کے شیلا سے مجھ کو اتنی محبت ہو گئی ہے کہ آج برسوں کے بعد میں پھر جذبات کو اپنی زندگی میں دخل دینے دے رہی ہوں۔

سردارنی صاحبہ میں انیس سال کی تھی جب میری شادی ہوئی میں نے اسی سال پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرز کے ساتھ پاس کیا تھا۔ جس آدمی سے میں نے شادی کی وہ اسی کالج جس میں کہ پڑھتی تھی کا ایک اسٹوڈنٹ تھا۔ جب میں بی۔ اے میں تھی وہ بی۔ ٹی کر رہا تھا۔ نہایت خاموش کم سخن لڑکا تھا دوسرے لڑکے اس کا مذاق اڑایا کرتے اس کو تنگ کرتے لیکن وہ ان کا جواب دینے یا ان سے بدلہ لینے کی کوشش نہ کرتا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا وہ جواب دینا بھی لیکن اس میں وہ خود اعتمادی اور ہمت نہ تھی جو کہ دوسروں کے دل میں عزت پیدا کرتی ہے اس کے جواب سے وہ خود ہی اتنا خفیف ہو جاتا

میں کالج میں بیحد ہر دلعزیز تھی۔ ڈبیٹنگ کلب میں میری خاص شہرت تھی میرے مضمون پروفیسرز تمام کالج کو سنایا کرتے تھے۔ میرا دل محبت کے جذبے اور میرا دماغ خیالات سے بھرا تھا۔ مجھ کو شودھیر پر بڑا رحم آتا تھا۔ بے چارہ کس قدر اچھی طبیعت کا آدمی ہے اور یہ لڑکے کیسے درندے ہیں اسے تنگ کرتے ہیں۔ متضاد طبیعتیں ایک دوسرے کی طرف کھینچتی ہیں بہر حال میں شودھیر کی طرف بہت مائل ہونے لگی ادھر شودھیر بھی مجھ سے والہانہ محبت کرنی شروع کی، کالج میں سب کو میرے رویہ پر بڑا تعجب ہو رہا تھا۔ میں اس زمانے میں خوبصورت تھی۔ بذلہ سنج، حاضر جواب، زندہ دل سارا کالج میرا گیت گاتا تھا اس زمانے میں لڑکیاں کالج میں بہت کم ہوتی تھیں اس لئے اور بھی بھاری قدر تھی۔ سب کو تعجب تھا کہ میں نے کالج بھر کے سب سے 'ڈل' آدمی کو کیوں منتخب کیا۔ میں نے اس لئے منتخب کیا تھا کہ مجھ کو اس پر بیحد رحم آتا تھا میں نے یہ سوچا تھا کہ وہ میری عزت اور قدر اور زیادہ کرے گا۔ اس کے دل میں میری محبت ان لوگوں سے زیادہ ہو گی جو کے خود بھی زندہ دل بذلہ سنج حاضر جواب ہیں اور میری محبت دوسروں کی سرد مہری کی تلافی کر دے گا بلکہ شاید اس میں خود اعتمادی پیدا ہو جائے گی۔ میں نے تفصیلاً یہ ساری باتیں سوچی نہیں تھیں لیکن میرے دل میں ضرور یہ خیالات ہوں گے۔

بہر حال ہماری شادی ہو گئی۔ اسے ایک اسکول میں ڈیڑھ سو کی نوکری مل گئی تھی اور میرے پاس ہوتے ہی میرے کالج نے دو سو پر لیکچرار مقرر کر لیا تھا۔ ہماری شادی ستمبر میں ہوئی تھی اس وقت کالج کی چھٹیاں تھیں۔ اکتوبر میں جب کالج کھلا ہے تو شودھیر نے میرا نوکری پر واپس جانا پسند نہیں کیا۔ حالانکہ شادی سے پہلے اس نے میرے نوکری پر کوئی اعتراض نہ تھا لیکن شادی کے بعد اس کے حساس جذبات کو اس بات سے ٹھیس لگی تھی کہ کسی نے مذاقاً مجھے اس کا نصف بہتر کہہ دیا تھا جس پر دوسرے دوست نے کہا تھا ہاں ہر لحاظ سے نصف بہتر

www.taemeernews.com

میاں کو تو پونے دو سو ملتے ہیں لیکن بیوی کو پورے دو۔ یہ مذاقیہ جملہ اس کے دل میں اتر گیا اور اس نے میری نوکری اس بنا پر چھڑوا دی۔

مجھے اس سے بیحد محبت تھی میں نے خوشی سے اس کا کہنا مان لیا مجھے افسوس تو ہوا لیکن زیادہ نہیں میں ہمہ تن گھر کے کام میں منہمک ہو گئی۔ جیسا کہ کالج کی لڑکیوں کا دستور ہوتا ہے مجھے بھی کھانا پکانا خانہ داری کی باتوں کا مطلق علم نہ تھا۔ میں نے ان کو بڑے انہماک سے سیکھنا شروع کیا۔ میری طبیعت ہمیشہ ہر چیز میں اول رہنے کی تھی میں نے سوچا کہ خانہ داری میں کیوں پیچھے رہوں۔ چند مہینے خوشی کے اس طرح نکل گئے۔ کچھ دنوں کے بعد میرا بڑا لڑکا پیدا ہوا اور میں اس کی پرورش میں مشغول ہو گئی میں خانہ داری کی طرح۔ بچوں کی پرورش کے طریقے سے بھی ناواقف تھی لیکن میں نے جب سے مجھے یہ معلوم ہوا کے میرے یہاں بچہ ہونے والا ہے کتابیں پڑھنی شروع کی تھیں اور جگدیش کے پیدا ہونے کے قبل ہی پہلے اصولوں سے واقف ہو گئی تھی۔ دن نکلتے گئے جگدیش دو برس کا ہو گیا اب۔ میرے پاس بہت وقت تھا۔ گھر کا کام کاج میں منٹوں میں کر لیتی تھی۔ بچہ بھی ایسی اچھی طبیعت کا تھا کہ گھنٹوں اکیلے کھیلتا رہتا۔ میرا دل بیکاری سے گھبرانے لگا۔ میں نے ایم۔ اے کی کتابیں منگا کر پڑھنی شروع کیں شودھیر نے سنا تو اس کی بھی مخالفت کی۔ تم پڑھتی رہو گی تو جگدیش کی طرف غفلت ہونا لازمی ہے میں نے کہا میں جگدیش کے سونے کے اوقات میں پڑھتی ہوں۔ بہر حال میں نے سال بھر بعد ایم۔ اے کا امتحان دیا اور یونیورسٹی میں اول آئی۔ میں نے امتحان بالکل پرائیویٹ طور پر دیا تھا۔ مجھ کو خود اپنی کامیابی پر تعجب ہوا۔ میرے پرانے پروفیسر اور ساتھ کے سٹوڈنٹس پھر میرا پتہ لگنے سے بہت خوش ہوئے مبارکباد اور تہنیت کے خط اور تار کا سلسلہ بندھ گیا۔ اخباروں میں بڑی تعریف چھپی۔ لیکن شودھیر نے کسی خاص خوشی کا اظہار نہیں کیا اور صرف یہ کہا کہ یہ فضول وقت اور پیسہ کی بربادی ہے۔ حالانکہ سوائے یونیورسٹی کی فیس کے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوا تھا مجھ کو یونیورسٹی میں اول آنے کی وجہ سے ولایت جا کر تین سال تعلیم پانے کا سکالرشپ ملا۔ میری باچھیں کھل گئیں جب میں نے ایم۔ اے دیا تھا اس وقت میرے وہم و گمان میں نہ تھا کہ مجھے سکالرشپ ملے گا میرا تو خیال تھا کہ شاید پاس بھی مشکل سے ہوں لیکن سکالرشپ کو پا کر دل چاہنے لگا کہ اس کا فائدہ اٹھاؤں۔ شودھیر نے سختی سے میرے انگلستان جانے کی مخالفت کی گرچہ اس نے بہ ظاہر جگدیش کو وجہ بنایا لیکن حقیقت میں وہ میری شہرت اور کامیابی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اب چار سال بعد یہ احساس ہو رہا تھا کہ میرا شوہر مجھ سے حسد کرتا ہے۔ اس نے رفتہ رفتہ ان لوگوں کا آنا جانا کم کرتے کرتے بالکل ہی بند کر دیا تھا جو مجھے جانتے تھے۔ جن سے علمی گفتگو۔ جو کہ خود بذلہ سنج اور حاضر جواب اور دوسروں سے حاضر جوابی کے قدردان تھے کیونکہ ایسے لوگوں میں وہ خود کو کمتر محسوس کرتا تھا۔ میرے ملنے والے اب نہایت ہی کند ذہن کلرک اور اسکول ماسٹر اور ان کی بیویاں تھیں۔ وہ میرے مطالعہ پر بھی ناک بھوں چڑھاتا تھا آخر شادی کے بعد تم کیوں پڑھتی جاتی ہو اس کا کہنا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میرا دماغ کسی طرح بالکل ماؤف ہو جائے معلوم نہیں اس نے ایم۔ اے مجھے کیوں کرنے دیا۔ شاید اس امید پر کہ میں فیل ہو جاؤں۔ اگر میں فیل ہو جاتی تو ان کے مجروح احساس خودداری کو بڑا سکون ہوتا۔ کاش کہ میں فیل ہو جاتی۔

سرداری نے دیکھا کہ استانی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس کے لب کانپ رہے تھے اس کا زرد چہرہ احساس جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔

سرداری صاحب معاف کیجئے میں آپ کی سمع خراشی کر رہی ہوں لیکن شیلا کے لئے میں سب کچھ کہہ رہی ہوں۔

ہاں تو شودھیر نے میرا اسکالرشپ واپس کروا دیا میں نے کہا کہ انگلستان میں جگدیش کے عمر کے بچے کے لئے نہایت اعلیٰ ہوسٹلز ہیں اسے وہاں رکھ کر پڑھ سکتی ہوں اور وہاں یونیورسٹی کے پڑھائی کا زمانہ صرف سال میں پانچ مہینہ باقی وقت میں جگدیش کے پاس ہی گذاروں گی بلکہ ہر سال گرمیوں کی چھٹی میں ہندوستان آجاؤں گی کیونکہ تمام غریب اسٹوڈنٹس یہی کرتے ہیں۔ ولایت میں یہاں کے بہ نسبت بہ زیادہ سستا ہوتا ہے اور چونکہ میں ایم۔ اے ہوں بجائے ۳ کے بدلے صرف دو سال میں ہی ڈگری لے سکتی

ہوں۔ لیکن شودھیر نے ایک نہ سنی اور میرا اسکالرشپ ایک تیسرے درجہ کی پاس ایم۔ اے کو دے دیا گیا۔ اور میں ہاتھ ملتی رہ گئی۔

اب میری زندگی کا بہت پریشان زمانہ شروع ہوا علمی مشاغل کی طرف دیکھنے کو وقت نہ رہا اور بہت جلد جلد چار بچے اور ہوئے حالانکہ اس قابل نہ تھی کہ اتنے بچوں کے کفالت کو کافی ہوتی لیکن شودھیر کو مجھے بے دست و پا و حراساں اور پریشان رکھنا مقصود تھا تاکہ میرا دل اور دماغ چور اور شکست ہو جائے اور واقعی وہ چار چھ سال میرے ایسے بُرے گذرے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ پونے دو سو روپے ماہوار کی آمدنی اور ۵ بچوں کی پرورش اور لاہور شہر کا رہنا لیکن وہ کسی صورت میں بھی میرے نوکری کرنے [illegible] خارج کر آمدنی بڑھانے پر رضامند نہ تھا کیونکہ اس [illegible] قائم رہتی تھی۔ اب میرا دل شودھیر کی طرف سے مکدر ہو چلا تھا لیکن وہ محبت جو کہ مجھے اسی سے تھی۔ اب بھی باقی تھی۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ اب بھی مجھ سے محبت کرتا تھا لیکن اس کی محبت سے زیادہ زبردست اس کے حصہ کا جذبہ اس کا احساس کمتری تھا۔ اس کو خوف تھا کہ اگر اس نے مجھے ترقی کرنے دی تو میں اسے چھوڑ دوں گی حالانکہ اگر وہ مجھے کامیاب ہونے دیتا میرے دماغ کو ماؤف اور مجھے ہر طرح سے بے دست پا کرنے کی کوشش نہ کرتا تو میری محبت کا درخت کبھی خشک نہ ہوتا۔ ادھر میں ہزار چاہتی تھی کہ میں علمی دلچسپی سے بالکل ہی کنارہ کش ہو جاؤں لیکن میری طبیعت اسے منظور نہ کرتی تھی ہم دونو اپنی اپنی فطرت سے مجبور تھے۔

علم کی چاٹ۔ شہرت کی تمنا دماغی سرگرمی کی خواہش تو نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ گرچہ ان چھ سال میں تو میں تقریباً بالکل ہی ان باتوں سے بیگانہ رہی۔ لیکن جب میرے چھوٹے لڑکے کی عمر تین سال کی ہو گئی اس وقت ہندوستان میں ایک سیاسی ہیجان اور سرگرمی کا دور دورہ تھا۔ جاہل اور پردہ نشیں عورتیں تک اس میں حصہ لے رہی تھیں۔ میرے کالج کی تمام لڑکیاں بڑی سرگرمی سے اس میں حصہ [illegible] رہی تھیں ان میں سے ایک سے میری اتفاقیہ ملاقات ہو گئی اور اس نے مجھ کو بہت شرمندہ کیا کہ ایسے وقت میں میں اپنے ملک اور قوم کے لئے کچھ نہیں کر رہی ہوں۔ مجھ کو اب پھر کسی قدر فرصت تھی۔ تین بچے اسکول چلے جاتے تھے چھوٹا لڑکا بھی تین سال کا ہو چکا تھا میں بھی کاموں میں شامل ہو گئی اور بہت جلد میری انتظامی قابلیت اور میری تقریروں کی شہرت ہونے لگی۔ شودھیر نے حسب معمول میرے راستہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کی۔ لیکن اب مجھے شودھیر کے کہنے کی پرواہ نہ تھی۔ اس کے علاوہ چھ سال کی منجمد زندگی نے مجھ کو بیزار کر دیا تھا۔ میرا دل اور دماغ کسی ایسے کام کے لئے تشنہ تھا جس میں کہ دماغی قوتیں استعمال میں آسکیں —— لیکن یہاں بھی مجھے شکست ہوئی۔

میری شہرت دو ڈھائی سال کے اندر اندر تمام ہندوستان میں پھیل چکی تھی۔ اکابرین کانگریس مجھ سے واقف ہو چکے تھے اور میرے بیحد قدردان۔ مردم شناس نگاہیں مجھے ہندوستان کی آیندہ سیاست میں مجھے ایک اہم جگہ دے چکی تھی۔ غرض میرا مستقبل بہت شاندار تھا۔ لیکن یہ بھلا شودھیر کو کیسے گوارا ہوتا جس شخص کی تنگ نظری نے میرے پچیس روپے زیادہ تنخواہ پانا تو گوارا نہ کرسکا تھا وہ یہ کس طرح گوارا کرتا کہ وہ ہنوز ایک معمولی سا اسکول ماسٹر ہو اور میں آسمان سیاست پر تارے کی طرح چمکوں۔

اس دفعہ اس نے قطعی اور مکمل ترکیب مجھے ہمیشہ کے لئے علمی اور عملی دنیا سے الگ کرنے کی سوچی۔ اس نے کہنا شروع کیا کہ شہر میں اس کی صحت اچھی نہیں رہتی دوسرے شہر میں رہنا بہت زیادہ گراں پڑتا ہے بہتر ہے کہ ہم سب کسی دیہات میں جائیں۔ اس نے کوشش کرکے اس چھوٹے سے گاؤں کے اسکول میں اپنا تبادلہ کرا لیا اور آج دس گیارہ سال سے ہم لوگ یہاں ہیں۔

میری طبیعت کی عورت کے لئے یہ گاؤں زندہ قبر ہے عورت تو عورت یہاں کوئی مرد بھی نہیں جس نے کبھی اس گاؤں سے باہر کی دنیا کی ایک جھلک بھی دیکھی ہو جو کہ میرے خیالات سے اتفاق کرنا تو درکنار ان کو سمجھ بھی سکے۔ لیکن اب مجھ میں جد و جہد کی طاقت باقی نہیں رہی تھی

اپنی شکست مان لی ہے... میں نے اپنے ارمان اپنی تمنائیں اپنی... آرزوئیں سب دفن کر دی ہیں اب میری زندگی ایک زندہ لاش ہے۔

اس کے بعد استانی کچھ ٹھہر گئی اور پھر کہا سردارنی صاحبہ آپ تعجب کریں گی کہ اس ساری رام کہانی سے سوشیلا کا کیا تعلق سردارنی صاحبہ میں نے نریندر کمار دیکھا ہے... وہ — وہ بالکل اس قسم کے آدمی ہیں جیسے شودھیر۔ اور شیلا چنچل شوخ حوصلہ شیلا بالکل ویسی ہے جیسا کہ میں تھی آپ کے لئے یہ یقین کرنا مشکل ہوگا لیکن۔ سردارنی صاحبہ یقین کیجئے میں ایسی ہی تھی۔

اور خدا نہ کرے اگر شیلا کی شادی نریندر کمار سے ہوئی تو وہ بھی ایسی ہی ہو جائے گی جیسی میں۔ نریندر میں بہت سخت احساس کمتری ہے۔ میں نے اس کو پچاسوں دفعہ آپ کے لڑکوں سے باتیں کرتے دیکھا۔ ان کے ہنسی مذاق سے وہ اسی طرح جھینپتا ہے جیسے شودھیر کا بچ میں۔ وہ برتری میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کی ندامت اس کے دل سے کبھی نہیں جائے گی۔ سردار صاحب کے ذریعہ سے ترقی کرنے سے یہ احساس اور بھی زیادہ طاقت پا لے گا کم نہیں ہوگا۔ اور یہ تنگ نظر کم حوصلہ اور خود اعتمادی سے عاری انسان شیلا کو بھی اپنے سطح پر لا کر چھوڑے گا۔ سردارنی صاحبہ شیلا جیسی لڑکی کو بروں کی کمی نہیں خدا کے لئے اس کی زندگی برباد نہ کیجئے۔

یہ کہکر استانی نے جلدی سے اپنی پرانی سی چھتری اور فرسودہ سا بیگ اٹھایا اور نمستے کہکر باہر نکل گئی۔

کے مخالف فحاشی اور عریاں نگاری کے حریف اردو کے
ترقی پسندی کے مشہور شاعر ماہر القادری نے حسب حسن و شباب پر قلم اٹھایا ہوگا تو کیا لکھا ہوگا — اس کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے تازہ افسانوں کا مجموعہ جو حال ہی میں شائع ہوا ہے پڑھا جائے جس میں ماہر القادری نے ترقی پسند افسانے کے علی الرغم ایک نئی راہ اختیار کی ہے۔ اور اس پر چلکر دوسروں کے لئے ایک مثال بھی قائم کی ہے "**حسن و شباب**" مجلد قیمت عا علاوہ محصول

ملنے کا پتہ۔ نگارستان ایجنسی اردو بازار جامع مسجد دلّی

(جو نئے اور پرانے ادب کے جواہر پاروں کا مخزن ہے)

مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرار افلاطوں

اقبال مرحوم کے اس شعر کی تشریح دیکھنا منظور ہو تو ایک مرتبہ

حیدرآباد کی نسوانی دنیا

دیکھئے:۔ یہ کتاب آپ کو عصر حاضر کی ان خواتین سے روشناس کرے گی جو مکالمات فلاطوں بھی لکھ سکتی ہیں۔ خوبصورت گردپوش مجلد قیمت عہ ملنے کا پتہ

نگارستان ایجنسی اردو بازار جامع مسجد دلّی

(جو تمام ادبی کتابوں کا خزانہ ہے)

ہندی ادب

ترقی کی کن منزلوں سے گذر رہا ہے اس کا صحیح اندازہ ہر اردو پڑھنے والے کے لئے ضروری ہے چنانچہ وقت کی اہم ضرورت کے پیش نظر افضل عابدی نے ہندی کے منتخب افسانوں کو اردو کا لباس پہنایا ہے۔ ہندی کی کوملتا اور لچک اردو میں ادبی دلفریب ہو گئی ہے چنانچہ ان افسانوں کا مجموعہ۔

پگڈنڈی

ضرور ملاحظہ فرمائیے قیمت مجلد عہ

ملنے کا پتہ

نگارستان ایجنسی اردو بازار جامع مسجد دلّی

(جہاں ہر قسم کی کتابیں موجود ہیں)

www.taemeernews.com

عذرا

(زیر تصنیف ناول عذرا کا ایک باب)

صالحہ عابد حسین

عذرا، ہاجرہ کی جیسی صورت دیکھ کر ہنس پڑی "تو یہ بات ہے، اس پر نانا ابا انصار ماموں سے ناراض ہیں؟"

ہاجرہ نے افسردہ لہجے میں کہا "نہ صرف ناراض ہیں بلکہ جائداد تک سے بے حق کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔"

عذرا "اچھا؟ جائداد سے بھی بے حق کر دیں گے؟ یہ تو بہت برا ہوگا پھر انصار ماموں یورپ بھی نہ جا سکیں گے۔ آخر نانا ابا کو اس قدر ضد کیوں ہے۔ نہ جانے بڑھاپے میں اپنی ہر بات منوانے کا کیا خبط ۔ ۔ ۔ ۔ وہ تو یہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شوق ہو جاتا ہے۔"

ہاجرہ "عذرا ہم تم ان کے نقطۂ نظر کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہ پرانے زمانے اور پرانے خیالات کے آدمی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کا لڑکا گورنمنٹ میں بڑا عہدہ پائے یا بیرسٹری میں نام اور دولت پیدا کرے۔ ان کی سمجھ میں یہ آ ہی نہیں سکتا کہ اخبار کے کام جیسے حقیر پیشے کو ایک پڑھا لکھا سمجھدار لڑکا کس لئے اختیار کرنے پر مصر ہے"

عذرا "ہندوستانیوں کا محض جسم ہی نہیں دماغ اور ذہن تک دوسروں کا غلام ہو گیا ہے۔ وہ غلامی سے آگے کچھ سوچ ہی نہیں سکتے۔ جیسے دیکھو آئی، سی، ایس کا خبط جیسے دیکھو آئی سی ایس کا شوق۔ بہت ترقی کی تو وکالت۔ مانا کہ وکالت آزاد پیشہ ہے مگر بھئی سنا تو یہی ہے کہ اس میں ہزاروں میں سے کوئی ایک وکیل سچا اور ایمان دار رہتا ہوگا۔"

ہاجرہ "پھر بابا دادا کی محبت جو پچھتر برس سے ان کے دل میں گھر کر چکی ہے اسے وہ کیسے دل سے نکال دیں؟ ان کی تو یہ خواہش ہے کہ خواہ کسی طرح ہو سب جائداد گھر ہی میں رہے۔ اسی لئے انہوں نے یہ خیال کیا تھا مگر انصار بھائی نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر وہ بہت ہی ناراض ہیں۔"

عذرا "یہ اچھی رہی کہ جائداد کی خاطر زبردستی شادی کر دی جائے"

ہاجرہ "اس گفتگو کے بعد دادا ابا نے انصار بھائی کو ایک دن اور سوچنے کے لئے دیا۔ اس دن انصار بھائی سارے دن اپنے کمرے میں پڑے رہے نہ کھانا کھایا نہ باہر نکلے۔ شام کو پھر دادا ابا نے چھوٹتے ہی پوچھا "تم نے کیا طے کیا؟" انصار بھائی نے سر جھکا کر کہا "نانا ابا مجھے آپ کی حکم عدولی کرتے ہوئے سخت رنج ہوتا ہے لیکن افسوس ہے کہ میں آپ کا حکم نہیں مان سکتا۔ آئی سی ایس اور "لا" میرے لئے دونوں بے معنی چیزیں ہیں میں صرف ادبی کام ہی کر سکتا ہوں یا تو جرنلزم کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دیجئے ورنہ پی، ایچ، ڈی کی ——— رہی دوسری بات؟ اس پر دادا ابا بات کاٹ کر بولے "ہاں دوسری بات کے لئے کیا فیصلہ کیا؟"

عذرا۔ (اشتیاق سے) "کیا جواب دیا انصار ماموں نے؟"

ہاجرہ (جھجک کر) "انہوں نے کہا میرا فیصلہ وہی ہے جو کل تھا ——— ہاجرہ میری بہن ہے اور بہن کی حیثیت سے میں اسے دنیا میں سب سے زیادہ چاہتا ہوں مگر ۔ ۔ ۔ ۔ مگر ۔ ۔ ۔ ؟ دادا ابا کڑک کر بولے" مگر ——— مگر کیا؟" انصار بھائی نے آہستہ سے کہا "مگر میں اپنی زندگی بھر کی شریک جسے بنانا چاہتا ہوں ——— یعنی میرا مطلب ہے کہ جس قسم کی لڑکی میں پسند کرتا ہوں وہ ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔ اور قسم کی ہوگی" دادا ابا یہ سن کر بہت ہی خفا ہوئے مگر انصار بھائی چپ چاپ کھڑے رہے۔ میں اس ڈر سے کہ دادا ابا کو خبر نہ ہو جائے چپکے سے کھسک آئی۔"

عذرا "دیکھو ہاجرہ ایمان ایمان سے بتانا۔ تمہیں بھی اس بات کا افسوس ہوا؟"

ہاجرہ "بالکل نہیں۔"

عذرا "میں نے کہا تھا کہ ایمان سے سچ سچ بتانا تمہیں رنج نہیں ہوا کہ انصار نے ناپسند کر دیا؟ اچھا غصہ تو آیا ہوگا؟"

ہاجرہ "نہیں اجی مجھے ان پر غصہ نہیں آیا بلکہ اور زیادہ محبت ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ خود میں نے انہیں ہمیشہ اپنا بڑا بھائی سمجھا اور کبھی بھولے سے بھی میرے دل میں یہ بات نہیں آئی جس کے سارے خاندان میں لے دے کے صرف ایک بھائی ہو وہ کیسے یہ چاہے گی کہ وہ بھائی بھی اس سے چھین لیا جائے۔"

عذرا: "اچھا اگر انصار راضی ہو جاتے پھر تم کیا کرتیں؟"

ہاجرا: "کہہ نہیں سکتی۔ ممکن ہے دادا ابا سے کسی طرح کہلواتی، ممکن ہے راضی برضا ہو کر چپ ہو رہتی۔ لیکن اس بات سے خوش ہرگز نہ ہوتی"

عذرا: "آخر کیوں؟ انصار ماموں جیسی صفات کے لڑکے بہت کم ہوتے ہیں۔ اتنی خوبیوں کے انسان کو تم اپنا شریک زندگی بنانے سے ناخوش ہوتیں؟"

ہاجرہ: "ہاں۔ انصار میرے بھائی ہیں اور جو خیالات ان کے میرے لئے ہیں وہی میرے بھی ان کے لئے ہیں۔ بھائی کی حیثیت سے میں ان سے بہت محبت کرتی ہوں۔ انھیں بہت اچھا آدمی سمجھتی ہوں۔ لیکن . . . . لیکن . . . . انھیں کی طرح میں اپنے . . . . میرا مطلب ہے . . . . ."

عذرا (مسکرا کر بات کاٹتی ہے) "ہاں تمہارا مطلب ہے اپنے شریک زندگی میں . . . . ."

ہاجرہ (شرما کر جملہ پورا کر دیتی ہے) "اور ہی قسم کے صفات چاہتی ہوں"

عذرا: "خدا کے لئے مجھے بھی تو بتاؤ وہ کیا صفات ہیں؟"

ہاجرہ (جھینپ کر) "بھئی جانے دو۔ یہ بتاؤ کہ کیا کیا جائے مجھے سخت صدمہ ہے کہ انصار بھائی سے دادا ابا خفا ہو گئے ہیں اب وہ انہیں خرچ دینا بھی بند کر دیں گے۔ کئی دفعہ ارادہ کیا کہ دادا ابا سے کچھ کہوں مگر بھئی ڈر لگتا ہے"

عذرا: "انصار ماموں سے بھی بات چیت ہوئی؟"

ہاجرہ۔ "وہ بچارے اس قدر دل گرفتہ ہو رہے ہیں کہ دیکھ کر دلی قلق ہوتا ہے۔ کئی دفعہ ان سے بات کرنی چاہی مگر میں تو اس خیال سے پسینے پسینے ہو جاتی ہوں کہ دادا ابا نے میرے بارے میں ان سے ایسی بری بات کہی"

عذرا (ہنس کر) "بری بات کی بھی ایک ہی رہی"

ہاجرہ: "عذرا تم سے انصار بھائی بے تکلف ہیں تم ان سے پوچھو کہ اب ان کا ارادہ کیا ہے؟"

عذرا: "ہاں پوچھوں گی"

ہاجرہ: "اور یہ بھی پوچھنا کہ وہ کس لڑکی سے بیاہ کرنا چاہتے ہیں۔ شاید کوئی ایسی لڑکی ہو جسے دادا ابا پسند کریں اور ان کی ناراضگی دور ہو جائے"

عذرا: "مجھے وہ بھلا کیا بتائیں گے؟ شاید انہیں علی گڑھ یا آباد میں اپنی ننھیال کی کوئی لڑکی پسند آ گئی ہو گی ——— یا بھئی شاید کوئی کالج کی لڑکی وڑکی ہو۔ ورنہ وہ میری ہاجرہ جیسی پیاری لڑکی سے شادی کرنے سے ہرگز انکار نہ کرتے۔ چراغ لے کر ڈھونڈیں گے تو ایسی بیوی نہ ملے گی"

ہاجرہ: "اچھا اب زیادہ بکواس نہ کرو"

عذرا: "انصار ماموں رضیہ سے تو بیاہ کرنا نہیں چاہتے؟"

ہاجرہ: "میرا تو یہ خیال نہیں ہے۔ اور بھئی ان لڑکوں کے دل کا حال کچھ معلوم بھی نہیں ہو سکتا۔ اچھا تو کل ضرور پوچھنا"

عذرا: "اگر موقعہ ملا تو ضرور پوچھوں گی"

اگلے دن دوپہر کو ہاجرہ نے عذرا کو پرچہ بھیجا "دادا ابا باہر گئے ہیں۔ انصار بھائی کی طبیعت صاف نہیں وہ گھر میں ہیں موقع ہے آ جاؤ" عذرا نے ماں سے کہا "اماں انصار ماموں کی طبیعت خراب ہے آپ اجازت دیں تو میں اور سیدہ جا کر انھیں دیکھ آئیں؟" ماں نے اجازت دیدی اور یہ دونوں بہنیں ہاجرہ کے ہاں پہنچیں۔ ہاجرہ اندر کمرے میں تھی عذرا ہاجرہ کے پاس چلی گئی اپنے کمرے کے آگے برآمدے میں انصار پلنگ پر دلائی اوڑھے لیٹے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ سیدہ ان کے پاس چلی گئی، پانچ منٹ بعد عذرا بھی انصار کے پاس برآمدے میں آ گئی۔ انصار لیٹے تھے اور سیدہ اصرار کر کے ان کا سر دبا رہی تھی۔ عذرا کو دیکھا تو انصار گڑبڑا کر اٹھ بیٹھے "اوہو، عذرا آئی ہیں، آئیے آئیے تشریف لائیے" یہ کہہ کر جلدی سے اٹھ کر آرام کرسی گھسیٹ کر آگے بڑھا دی عذرا نے روکتے ہوئے کہا "توبہ آپ کیوں اٹھتے ہیں میں بیٹھ جاؤں گی" سیدہ بولی "دیکھئے انصار ماموں یہ بات ٹھیک نہیں کہ چھوٹی باجی کے آتے ہی آپ اٹھ کر بیٹھ گئے آپ لیٹ جائیے"

عذرا: "کیسی طبیعت ہے؟"

انصار: "کچھ نہیں۔ رات کچھ سردی لگ گئی صبح سے نزلہ ہے اور شاید کچھ حرارت بھی ہو"

سیدہ: "حرارت؟ آپ کو تو اچھا خاصا بخار ہے"

انصار" اب تم خواہ مخواہ مجھے بیمار بنا دو تو اس کا کیا علاج"؟

عذرا نے انصار کو نبض پر اپنی انگلیاں رکھ کر کہا "نبض تو خاصی تیز ہے۔ تیز بخار تو نہیں مگر شاید سو تو ہو گا"۔

انصار مسکرائے "اوہو تم تو اب پوری ڈاکٹر بنتی جاتی ہو۔ حرارت کی ڈگری تک بتادی"۔

عذرا" اب آپ لیٹ جایئے ورنہ میں جاتی ہوں"۔

انصار دوسری آرام کرسی پر کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔ اور دو کرسیوں پر یہ دونوں بیٹھ گئیں۔ ذرا دیر خاموشی رہی آخر عذرا نے کہا۔

"انصار ماموں آپ ہم سے ناراض کیوں ہیں"۔

انصار" میں؟ میں ناراض ہوں؟ تم سے!!"

سیدہ" ناراض ہی ہوں گے تب ہی تو ہمارے ہاں آتے ہیں"۔

انصار کے چہرے پر فکر و پریشانی کے بادل چھا گئے مگر اپنی پریشانی کو چھپاتے ہوئے انھوں نے کہا "بھئی معاف کرنا اس زمانے میں بہت مصروف رہا اس لئے نہیں آسکا"۔

عذرا" بھئی اب انصار ماموں بڑے آدمی ہو گئے ہیں"۔

انصار (حیران ہو کر)" یہ کیا بے تکی بات تم نے کہی"۔

عذرا" بے تکی کیوں بالکل تُک کی بات ہے۔ اب آپ بڑے آدمی ہو جا ہے نہ گئے ہوں مگر اپنے کو سمجھنے ضرور لگے ہیں"۔

انصار" یہ جو میں دو چار دن نہیں آیا کا اس پر اتنی خفگی۔ واقعی عذرا میں سخت پریشانی میں تھا"۔

عذرا" اسی لئے تو کہہ رہی ہوں۔ پہلے جب آپ اپنے کو بہت بڑا آدمی نہیں سمجھتے تھے تو اپنی ساری باتیں' اپنی پریشانیاں اور فکریں اپنی دلچسپیاں اور مصروفیتیں' اپنی خواہشیں اور آرزوئیں سب کی سب اپنی منی سی بھانجی' کو اپنی' چھوٹی سی دوست' کو' ضدی اور لڑاکا بہن' کو بتا دیا کرتے تھے۔ ہر بات میں اس سے مشورہ لیتے تھے اور اب ہم سے باتیں چھپاتے ہیں۔ اب آپ اُسے اس قابل سمجھتے ہی نہیں کہ اتنا بڑا عالم فاضل ادیب شاعر وغیرہ وغیرہ . . . ۔ ایسی چھوٹی معمولی اور گھٹیا لڑکی سے بات کرے"۔

انصار سر جھکائے کسی سوچ میں بیٹھے رہے۔

سیدہ" باجی ٹھیک تو کہہ رہی ہیں پہلے آپ ان سے کتنی باتیں کرتے تھے۔ لڑتے جھگڑتے بھی تھے۔ ادبی بحثیں بھی کرتے تھے۔ چھیڑتے بھی تھے۔ نہ جانے اب کے حیدرآباد سے آکر آپ اس قدر متین اور سنجیدہ کیوں ہو گئے ہیں"۔

عذرا" خیر متین اور سنجیدہ تو کیا ہوں گے۔ مگر جیسا کہ میں نے کہا اب یہ اپنے کو کچھ سمجھنے لگے ہیں۔ خیر بھئی کسی پر زبردستی تھوڑا ہی ہے"۔

انصار" عذرا —— تمہاری شکایت سر آنکھوں پر تم درست کہتی ہو۔ واقعی میں بڑا نالائق ہوں کہ اپنے سچے خیر خواہوں سے دل کی بات نہیں کہتا۔ کیا کروں میری عقل چکر میں ہے۔ کاش اس وقت سعید بھائی یہاں ہوتے اور میری مشکل کا حل بتاتے"۔

یہ کہہ کر انصار نے پریشان ہو کر اپنا سر کرسی کے تکئے پر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر لیں عذرا نے اپنا ہاتھ اس کی کرسی کے ہتھے پر رکھ دیا اور جھک کر بولی" انصار ماموں آپ کی پریشانی سے مجھے بڑا صدمہ ہوتا ہے —— اچھا مجھ سے کہنے میں کچھ حرج ہے"؟

انصار" حرج کچھ بھی نہیں۔ پریشانی ساری یہ ہے کہ نانا ابا مجھ سے سخت ناراض ہیں اور یورپ جانے کی اجازت نہیں دیتے۔

عذرا" یہ کوئی ایسی سخت پریشانی کی بات نہیں۔ آپ اس وقت ان کا کہنا مان لیجئے۔ چند سال بعد جب موقع ملے گا۔ تب چلے جایئے گا۔ آخر یورپ پارس کا پتھر تو نہیں کہ بغیر اس سے چھوئے آدمی سونا بن ہی نہیں سکتا"۔

انصار" عذرا —— میں ولایت محض نام نمود کی خاطر جانا نہیں چاہتا۔ بلکہ اپنی تعلیم کی تکمیل کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں جرنلزم کی تعلیم کا کوئی معقول بندوبست ہی نہیں۔ اور اگر اپنا جانا ملتوی بھی کردوں تب بھی نانا ابا خوش نہ ہوں گے"۔

عذرا" کیوں؟"

انصار" وہ چاہتے ہیں کہ میں آئی' سی' ایس کروں' یا پھر جائیداد کا انتظام —— کیا میں یہ دونوں کام کرسکتا ہوں"؟

عذرا" نہیں۔ ان میں سے تو ایک بھی آپ نہیں کرسکتے آخر نانا ابا کو اس قدر ضد کیوں ہے؟ آپ کچھ دن ٹھہر جایئے بھائی جان آجائیں گے تو انھیں سمجھا دیں گے"۔

انصار" ان کو کوئی نہیں سمجھا سکتا۔ وہ مجھ سے کسی طرح

خوش نہ ہوں گے۔"

عذرا: "خواہ مخواہ کا وہم۔ جب آپ "کامریڈ" میں کام کرنے گئے تھے تب بھی تو وہ خفا ہو گئے تھے پھر آخر غصہ دھیما پڑا یا نہیں؟"

انصار: "اس مرتبہ جو بات وہ منوانا چاہتے ہیں وہ ان کے لئے بہت اہم ہے اور چونکہ میں نے اس کے ماننے سے صاف انکار کر دیا ہے اس لئے وہ مجھ سے نہ صرف ناراض ہیں بلکہ عاق کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔"

سیدہ: "انصار ماموں یہ عاق کرنا کیا ہوتا ہے؟"

عذرا: "خدا نہ کرے جو عاق کریں۔"

انصار: "ہاں عذرا انہوں نے یہی فیصلہ کیا ہے۔ خیر اس کی تو مجھے پروا نہیں کہ وہ مجھے جائیداد سے بے حق کر دیں گے بلکہ خدا گواہ ہے مجھے تو خوشی ہو اگر یہ جائداد کا پھندا کسی طرح میرے گلے سے نکل جائے ورنہ مجھے شاید ساری عمر اپنی صلاحیتوں کو ابھارنے کا موقع نہ مل سکے گا۔ مگر اس بات کا سخت صدمہ ہے کہ نانا ابا جنہوں نے ماں باپ سے زیادہ محبت اور [illegible] پالا پوسا انہیں مجھ سے صدمہ پہنچا۔ مگر کیا کروں ان کا حکم ماننا میرے بس کی بات نہ تھی۔"

عذرا: "آخر وہ ایسی کیا بات ہے؟"

انصار: "وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

سیدہ: (خوش ہو کر) "شادی کرنا چاہتے ہیں؟ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے آپ نے تو ایسا منہ بنا کر کہا جیسے وہ آپ پر کوئی بڑا ظلم توڑنے والے ہیں۔"

انصار: "ناپسندیدگی کی شادی سب سے بڑا ظلم ہے۔"

عذرا: "کس سے کرنا چاہتے ہیں؟"

انصار: "تمہیں یہ نہیں بتاؤں گا ورنہ تم بھی مجھ سے ناراض ہو جاؤ گی۔"

سیدہ: "میں سمجھ گئی۔ ہاجرہ آپا سے؟"

انصار: "بھئی یہ ذرا سی فتنی کتنی چالاک ہے۔"

عذرا: "ہاجرہ اور ناپسند؟"

انصار: "عذرا — تم بھی یہ کہتی ہو؟ ہاجرہ میری بہن ہے سگی بہن — نانا ابا تو محض جائداد کی محبت میں مجبور زبردستی کر رہے ہیں۔ حالانکہ میں شادی اور جائداد کو بالکل الگ الگ سمجھتا ہوں۔"

عذرا: "وہ تو ظاہر ہی ہے۔ لیکن یہ بتائیے کہ آپ نے ہاجرہ جیسی بے مثل صورت و سیرت والی لڑکی کو ناپسند کر دیا تو پھر کیا آپ کے لئے آسمان کی حور آئے گی؟"

انصار: "خیر حور پری مجھے چاہئے بھی نہیں۔ ہاجرہ میری بہن ہے اور اس لحاظ سے وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے لیکن میری بیوی اس سے مختلف قسم کی ہوگی۔"

عذرا: (مسکرا کر) "بھلا بتائیے تو کیسی ہوں گی وہ آپ کی تخیل کی ملکہ؟"

انصار: "تم میرا مذاق اڑانے لگیں اسی لئے تو میں تمہیں بتاتا نہیں تھا۔"

عذرا: (لمبا سا منہ لٹکا کر) "توبہ توبہ — آپ کا اور مذاق!! اب یہ بے ادبی نہ ہو گی لیجئے اب میں پوری سنجیدہ فہمیدہ بن گئی اب بتائیے۔"

انصار: "تم تو میرے سر ہی ہو گئی میں نے تو ایسے ہی کہا تھا۔"

سیدہ: "انصار ماموں اب آپ بات ٹال رہے ہیں بتائیے بھی کیسی ہوں گی آپ کی بیوی؟"

انصار: "ابھی یہ تھوڑا ہی سوچا ہے کہ کیسی ہو گی۔ صرف یہ سوچا ہے کہ کیسی نہیں ہو گی۔"

عذرا: "بہانے بنانے خوب آتے ہیں۔"

سیدہ: "اچھا یہی بتا دیجئے کہ ہماری ممانی جان کیسی نہیں ہونگی۔"

انصار: "آخر کیا کرو گی پوچھ کر؟"

سیدہ: "کہیں سے انہیں ڈھونڈ کر لائیں گے۔ ہاں پھر بتائیے نا؟"

عذرا: "مجھے معلوم ہے یہ کیسی لڑکی پسند کرتے ہیں۔"

انصار: (اشتیاق کو چھپا کر) "اچھا؟ پھر بتاؤ تاکہ میری مشکل بھی حل ہو جائے۔"

عذرا: "گورے رنگ کی خوبصورت فیشن ایبل لڑکی جو

www.taemeernews.com

کم سے کم بی اے تک پڑھی ہو جو آپ کے ساتھ ڈنر پارٹیوں اور جلسوں میں جائے، کھلے منہ ہوا کھائے، یورپ بھی ساتھ جا سکے۔ امیر اور خطاب یافتہ باپ کی بیٹی ہو ـــــ اور ـــــ اور ـــــ"

سیدہ: "اور اس کا نام۔ ر ـــــ سے شروع ہوتا ہے"

انصار۔ (کھل کھلا کر ہنس پڑا) "توبہ ہے آپ لوگوں کا قیاس مگر مجھے دلی رنج و افسوس کے ساتھ اس گناہ کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آپ کی قیاس آرائیاں بے کار گئیں۔ میری بیوی میں ان میں سے ایک بھی صفت نہ ہوگی۔"

عذرا: "خیر معلوم ہو گیا کہ آپ ہمیں جلکہ دیتے ہیں۔"

سیدہ: "اب تو انصار ہوں آپ کو بتانا ہی پڑے گا"

انصار: "مگر شرط یہ ہے کہ مذاق نہ اڑانا ـــــ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ نہ بہت خوبصورت ہو اور نہ گوری۔"

عذرا: "بلکہ کالی بدشکل چیچک رو ـــــ"

انصار۔ نہیں بھئی کالی بدشکل چیچک رو بھی نہ ہو بلکہ گندمی رنگ ہو ـــــ اچھا ناک نقشہ ہو۔ مطلب یہ کہ دلکش ـــــ صورت ہو ـــــ اور بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی نہ ہو اور نہ بالکل جاہل ہو، نہ حد سے زیادہ فیشن ایبل ہو نہ پرانی لکیر کی فقیر ـــــ نہ بالکل بے پردہ ہو نہ ایسی سخت پردہ دار کہ گھر سے باہر قدم رکھنا گناہ سمجھے ـــــ نہ کسی خطاب یافتہ باپ کی بیٹی ہو نہ جاہل خاندان کی ـــــ"

عذرا: "نہ یہ ہو نہ وہ ـــــ نہ ایسی ہو نہ ویسی ـــــ ایسی کانٹے کی تول بھائی جان تو ملنا مشکل ہے۔"

انصار: "دبو، گھسو، رونی صورت نہ ہو۔ میری ہم خیال، ہم مذاق ہم مزاج ہو۔ میرے کام میں دلچسپی لے سکے ـــــ میرا ہاتھ بٹا سکے۔ میری دلچسپیوں میں حصہ لے سکے۔ میرے خیالات کو سمجھ سکے میرے مقاصد سے ہمدردی رکھے اور ـــــ"

سیدہ: "بڑی کڑی شرطیں ہیں۔"

عذرا: "آپ نے یہ سب شرائط بتانے میں ذرا دیر کر دی، خیر اب اللہ میاں کو معلوم ہو گیا اب وہ ان سب صفات کی حامل لڑکی پیدا کرنے کی کوشش کرے گا مگر اس کے لئے آپ کو کم از کم پندرہ بیس برس انتظار کرنا پڑے گا۔"

انصار: "میرا تو یہ خیال ہے کہ اللہ میاں اب سے بہت پہلے اس قسم کی ایک لڑکی بنا چکا ہے اب یہ اور بات ہے کہ اس تک میری رسائی نہ ہو۔"

سیدہ: "معلوم ہوتا ہے آپ کی نظر میں کوئی صاحبہ ہیں۔"

عذرا: (جس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا) سیدہ اب اٹھو بڑی دیر ہو گئی اماں انتظار کر رہی ہوں گی۔"

انصار: "تم نے میرے تخیل کی داد نہ دی عذرا۔"

عذرا: "کہا تو انتظار کیجئے کہ ان صفات کی خاتون عالم وجود میں"

انصار: "یہ تمہاری زبردستی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

عذرا: "یہ بتائیے اب آپ کیا کریں گے؟"

انصار: "میری تو عقل چکر میں ہے کہ کیا کروں کیا کروں، کل تو دہلی جا رہا ہوں تاکہ میرے سامنے سے ہٹ جانے سے نانا ابا کا غصہ کچھ کم ہو۔ پھر وہاں سے آکر سعید بھائی کے آنے پر ان کے مشورے سے کچھ طے کروں گا۔"

سیدہ: "آپ شام کو ہمارے ہاں آئیے۔ اماں کئی مرتبہ آپ کو پوچھ چکی ہیں۔ ان سے سب باتیں کہئے وہ بڑا اچھا اور مناسب مشورہ دیتی ہیں۔"

انصار: "میرا خود بہت جی چاہتا ہے مگر ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ بھی نانا ابا کی ہم خیال نہ ہوں اور مجھ سے ناراض ہو جائیں۔"

عذرا: "اماں اس قسم کے دقیانوسی خیالات کی نہیں۔ وہ تو ہمیشہ کہا کرتی ہیں کہ لڑکے کی رائے سے شادی کرنا چاہئے۔"

انصار: (مسکرا کر) صرف لڑکے کی؟ لڑکیوں کے متعلق ان کا کیا نظریہ ہے؟"

عذرا بغیر جواب دیئے کھڑی ہو گئی اور ساتھ ہی سیدہ بھی، انصار ہاجرہ کے کمرے تک ان دونوں کے ساتھ آئے۔ ہاجرہ اندر سے نکلی اور ہاتھ سے انصار کو سلام کر کے آہستہ سے کہا "بھائی جان اب آپ کا جی کیسا ہے؟" انصار نے ایک نظر ہاجرہ کے چہرے پر ڈالی۔ لفظ "بھائی جان" سے ہاجرہ کے خیالات اس پر واضح ہو گئے اس نے کہا "بہن میری فکر نہ کرو اچھا ہوں" اور یہ کہہ کر چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف چلے گئے یہ تینوں کمرے میں چلی آئیں۔

ہاجرہ نے تو خوب باتیں ہوئیں انصار بھائی سے، چلو ان

www.taemeernews.com

کے دل کی بھڑاس تو نکل گئی۔

عذرا۔ شاید۔

ہاجرہ۔ میں نے چھپ کر ان کی سب باتیں سنیں۔ اب میں سمجھ گئی کہ وہ کون ——— کیسی لڑکی چاہتے ہیں۔

سیدہ۔ اچھی آپا بتائیے وہ کس لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے نجمہ آپا سے۔

ہاجرہ۔ نہیں۔ کیوں عذرا تمہارا کیا خیال ہے؟

عذرا۔ (کچھ کھوئی ہوئی سی) میرا تو کچھ بھی خیال نہیں۔

ہاجرہ۔ مگر میں اس لڑکی کو خوب جانتی ہوں۔

سیدہ۔ تیری آپا مجھے بھی بتا دیجے۔

ہاجرہ۔ تم بچی ہو۔ تمہیں ان باتوں سے کیا غرض ———

سیدہ نے منہ بنا کر ہاجرہ کی طرف دیکھا پھر ایک نظر عذرا کے چہرہ پر ڈالی اور کھل کھلا کر ہنس پڑی ——— "میں سمجھ گئی ——— سمجھ گئی ———"

غزالانِ لکھنؤ

مجاز

فردوسِ حسن و عشق ہے دامانِ لکھنؤ
آنکھوں میں بس رہے ہیں غزالانِ لکھنؤ

صبر آزما ہے غمزۂ ترکانِ لکھنؤ
رشکِ زنانِ مصر کنیزانِ لکھنؤ

ہر سمت اک ہجومِ نگارانِ لکھنؤ
اور میں کہ ایک شوخ غزلخوانِ لکھنؤ

مطرب بھی ہے شراب بھی ابرِ بہار بھی
شیراز بن گیا ہے شبستانِ لکھنؤ

ٹوٹے ہوئے ہے تیغ دسنانِ حسنِ بے نقاب
ناوک فگن ہے جلوۂ پنہانِ لکھنؤ

سمجھی ہے میں نے عشوہ گریِ نظر یہاں
دیکھی ہے میں نے پاکیِ دامانِ لکھنؤ

اب تک رہا ہے اور رہے گا بہت دنوں
دلّی کا درد طالبِ درمانِ لکھنؤ

"اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
وہ نوبہارِ ناز کہ ہے جانِ لکھنؤ"

پھر لکھنؤ کی روح ہے بے چین و مضطرب
چھیڑا ہے کس نے تارِ رگِ جانِ لکھنؤ

دستِ جنوں کو روکئے یہ خبط چھوڑیئے
رسوا ہے یونہی چاکِ گریبانِ لکھنؤ

کچھ روز کا مسافر و مہماں ہوں اور کیا
کیوں بدگماں ہوں یوسفِ کنعانِ لکھنؤ

اب اس کے بعد صبح ہے اور صبحِ نو مجاز
ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ

www.taemeernews.com

اور یہ افسانہ نگار!

ایرانی کو افسانے سناتے دیکھ کر مجھے شولاپور کا واقعہ یاد آ گیا
میں ناکام کے ساتھ شولاپور میں جہتاب کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ اب سمجھئے کہ شاعر تو آخر شاعر ہی ہوتا ہے ایک رات تو کسی طرح جہتاب اور ناکام کی تبادلۂ سخن ہی میں گزر گئی۔ ویسے بھی دونوں اپنے اپنے کلامِ بلاغت نظام کا اسٹاک ختم کر چکے تھے۔ اب ہر پھر کے وہ سنائے ہوئے اشعار ہی ایک دوسرے کو سنا رہے تھے میں رات کو برآمدے میں اطمینان سے سوتا رہا صبح ۶½ بجے بیدار ہوا کمرے میں جا کر دیکھا تو بجلی جل رہی تھی اور ناکام و جہتاب، اپنے اپنے پلنگوں پر اوندھے پڑے تھے بجلی کا پنکھا آہستہ آہستہ ان پر ہوا جھینکے جا رہا تھا میں نے ناکام کو جھنجھوڑا وہ آنکھیں سے اندھیرا دیکھ کر یہ کہہ کر سو گیا سونے دے یار ہم چار بجے تو لیٹے ہی تھے۔ دوسرے دن چونکہ ناکام نے اپنے بیس سال کے بچھڑے ہوئے شاعر دوست حشر کو اپنی شولاپور کی آمد سے مطلع کر دیا تھا لہٰذا دس بجتے بجتے وہ آن پہنچا ہم سب ناشتہ کر کے فارغ ہوئے تھے۔ یہ حشر صاحب بہر عنوان حشر ہی تھے ہاتھی کا سا جسم ناریل سا قد گوشت کے ابھرے ہوئے حصے میں آنکھیں، ناک، منہ وغیرہ ٹکے ہوئے۔ تھے آتے ہی ناکام سے گلے ملے کچھ عرصے وہ ایک دوسرے کو متعجب نظروں سے دیکھتے رہے اور پھر پلنگوں پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ جہتاب اپنے دفتر چلے گئے مجھے کوئی کام نہ تھا اس لئے میں کرسی کھینچ کر ان کی باتوں میں شریک ہو گیا چند منٹ کے بعد ہی ناکام نے گنگنانا شروع کیا میرے کان کھڑے ہوئے اور حشر نے اچکن اتار کر سرہانے ڈال دی بلکہ آلتی پالتی مار کر مقابلے کے لئے جم گیا۔ بزرگوں سے سنا تھا کہ ؎

جبکہ دو موذیوں میں ہو کھٹ پٹ
اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ

دیکھ کر میں کنی کاٹ گیا۔ ٹہلتا ہوا برآمدے تک آ کر ان کمرے میں باہر کی کھڑکی کھول کر دیکھنے لگا۔ سڑک پر سینکڑوں آدمی ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔ دبلے پتلے، کالے گورے، عورتیں بچے، غرضکہ زندگی کی لہر ہر طرف دوڑتی پھر رہی تھی۔ ناکام کے کمرے میں

جیون ساتھی

سے شعر خوانی کی آواز برابر آ رہی تھی۔ ایک غزل ناکام پڑھتے تھے دوسری حشر پھر ناکام پھر حشر۔ میں گھبرا کر نیچے اتر گیا اور باغ میں ٹہلنے لگا۔ واقعی میں اس روحانی غذا سے اس قدر بیزار اور تنگ آ چکا تھا کہ خودکشی کر لینے کو جی چاہتا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر تک میں ادھر سے ادھر بے مدعا پھرتا رہا اور پھر اوپر چڑھ گیا۔ ناکام کے کمرے سے اب کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گیا تو کیا دیکھتا ہوں دونوں ہاتھ پیچھے رکھے ہوئے دونوں شاعر بے حال بیٹھے ہیں مگر چہروں پر فاتحانہ تبسم کی سرخی۔ آنکھیں جیسے ابھی ابھی اپنی جگہ پر آ گئی ہیں پیشانی کی رگیں پھولی ہوئی پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے کہیں کہیں ناچ رہے تھے مگر نگاہوں سے نگاہیں ملی ہوئی تھیں شاید برابر رہے تم لوگ؟ میں نے مسکرا کر پوچھا۔ دونوں کی نگاہیں مجھ پر لرزتی ہوئی آن پڑیں ہونٹ کانپے مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔ میں ہنستا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ بالکل اسی طرح لوگ ایرانی کو دیکھ رہے تھے وہ برابر افسانے سنائے جا رہا تھا اپنی تحریر کی تصویر بن رہا تھا جو کہتا وہ بن کے دکھا دیتا تھا کوئی بیس صفحے پڑھ چکا تھا اور اس سے زیادہ ابھی باقی تھے۔ مروت والوں کا مجمع تھا مگر اب اتنی ہی مروت باقی رہ گئی تھی کہ زبانیں تعریف سے خاموش تھیں چہروں پر بے چینی اور وحشت کے آثار تھے مگر ایرانی کو اس کی پرواہ نہ تھی وہ مانا ہوا افسانہ نگار تھا اس کی تحریر کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ وہ ایسی باتوں پر کب توجہ دیتا تھا اس نے افسانوی ادب کو زندگی سے قریب اور قریب تر کرنے میں اپنے کردار و گفتار کو بھی قربان کر دیا تھا اس نے یہ تمام اضافی مسائل، اخلاق، مروت، محبت، بلکہ حلال و حرام کی تمیز بھی اپنے پس پشت ڈال دی تھی وہ ہندستان کے پست اور اندھیرے ماحول سے تنگ تھا جہاں آزاد خیالی بالکل نہیں۔ جہاں در مردوں کی مائیں بہنیں پردے میں رہتی ہیں جہاں پیدائش سے لے کر قبر تک کے حالات چھپا چھپا کر رکھے جاتے ہیں۔ وہ حکومت کا تنخواہ دار ملازم تھا مگر وہ کہتا تھا کہ خیالات ہمیشہ باغیانہ رکھنے چاہئیں۔ صفحے پر صفحے الٹے جاتا تھا ایک دریائے

آمد و آورد تھا کہ آندھی سے چلا آ رہا تھا اس کا سانس پھول گیا تھا زبان کبھی
کبھی لڑکھڑا جاتی تھی جیسے وہ پانی کے ایک آدھ گھونٹ سے پھر رواں
کر دیتا تھا۔ ابھی کئی افسانہ نگار باقی تھے جو پڑھنا چاہتے تھے کئی
شاعر بھی آس لگائے بیٹھے تھے۔ صدر مجلس اونگھ رہے تھے حاضرین
انجمن میں زیادہ تعداد افسانہ نگاروں اور شعرا کی تھی۔ جا بجا پیاس سے تنگ
تھے کئی پنکھے چل رہے تھے مگر سب ہی کو پسینے آ رہے تھے مجھے متلی
ہونے لگی پنکھے کی ہوا گرم ہوتی چلی گئی۔ پیٹ میں اچھال ہونے لگا۔
افسانہ نگار برابر پڑھے جا رہا تھا حتیٰ کہ مجھے اس کی صورت بھی
کم کم دکھائی دینے لگی اور آخر اس کی آواز بھی مدہم ہوتی معلوم ہوئی
میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور دروازہ کی طرف لپکا باہر باغ میں ٹھنڈی
ہوا نے مسیحائی کی۔ میں گھاس کے ایک تختہ پر گر پڑا اور نہ جانے کتنی
دیر پڑا رہا حتیٰ کہ ایک چوکیدار نے کہا کہ صاحب باغ خالی کیا جا رہا
ہے ۱۲ بج گئے۔ میں ۷ بجے ادبی مجلس میں شریک ہوا تھا جب سے
اس موذی افسانہ نگار کے پھیر میں رہا اور ٹھیک گیارہ بجے وہاں
سے اٹھ کر بھاگا تھا اب ۱۲ بج گئے تھے اور کلب میں جہاں مجلس
منعقد ہو رہی تھی وہاں اب بھی روشنی کی بڑی تعداد باہر نکل پڑنے
کو بے قرار تھی۔

رشید اختر ندوی کا نیا ناول

تشنگی پہلی فرصت میں پڑھئے قیمت للعہ

ان کے دوسرے ناول

تلخیاں	عہ
سودائی	عہ
سازِ شکستہ	عہ
سوزِ دروں	عہ

ملنے کا پتہ

نگارستان ایجنسی اردو بازار دلی

واردات

اصطفےٰ رضا اصطفےٰ

ناز جس دل پہ تھا وہی نہ رہا
اب وہ سرمایۂ خوشی نہ رہا

کہہ دیا اُن سے جو نہ کہنا تھا
بیخودی میں خیال ہی نہ رہا

بادہ کش محتسب ہوا جب سے
ساقیا لطفِ میکشی نہ رہا

جب سے دل مر گیا یہ حالت ہے
خندہ بھی باعثِ خوشی نہ رہا

میکشوں کی کمی رہی ورنہ
ساغرِ عشق تو تہی نہ رہا

یا مجھے حس نہیں رہا باقی
آدمی یا اب آدمی نہ رہا

گر سزا و جزا کا آئے خیال
پھر تو کچھ لطفِ بندگی نہ رہا

آنے دیتے نہ لب پہ آہ مگر
وقت اب اس کا مقتضی نہ رہا

آپ ہی کا ہے آپ لیجائیں
اصطفا دل کا مدعی نہ رہا

www.taemeernews.com

فاصلہ

ابراہیم جلیس

میری آنکھوں کے پیالے نیند سے بھرے جا رہے تھے۔ لیکن شہاب دندناتا ہوا کمرے میں گھس آیا اور میری قمیص کا کالر پکڑ کر اس بدتمیزی سے مجھے پلنگ پر سے اٹھا دیا کہ ساری نیند آنکھوں سے چھلک کر گر گئی۔ طبیعت اتنی جھلا گئی کہ جی چاہتا تھا کہ اس کے پھولے پھولے گالوں پر ایک زنانے کا تھپڑ لگاؤں ـــــــ مگر اس کے چہرے پر تو جیسے یتیمی برس رہی ہے۔ بسورتے ہوئے وہ کہنے لگا۔

"یار ـــــــ میری مدد کرو۔ واللہ میں مر جاؤں گا۔"

ایک لمبی جمائی لیتا ہوا میں پلنگ سے اٹھ کھڑا ہوا اور انگڑائی توڑتے ہوئے شہاب کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ ہونٹوں پر آپ ہی آپ مسکراہٹ آ گئی ـــــــ واہ کیا مزیدار بات کہی! ایک مریل دوسرے مرنے والے کے آگے گڑگڑا رہا ہے کہ مجھے موت سے بچاؤ۔ ایک مجبور دوسرے مجبور سے التجا کر رہا ہے کہ میری مدد کرو۔ بھلا میں بھی کوئی خدا یا سرمایہ دار ہوں کہ کسی کی موت و زیست اور مدد میرے قبضۂ اختیار میں ہو۔ میں نے شرارتاً منہ بگاڑتے ہوئے کہا۔

"دوست ـــــــ یہ ایک کلرک کا کمرہ ہے وائسریگل لاج نہیں۔ یہاں مدد تو نہیں مل سکتی۔ البتہ سگریٹ مل سکتی ہے۔ پیو گے؟"

ایک سگریٹ جلا کر میں نے ڈبیا اس کی طرف بڑھا دی۔ لیکن ڈبیا کو میز پر پھینکتے ہوئے اس نے کہا۔

"مذاق نہ کرو ـــــــ میں اس وقت قطعی مذاق کے موڈ میں نہیں۔ سگریٹ بھی نہیں پی سکتا کیونکہ یہ دل تو پہلے ہی سے دھواں گھر بنا ہوا ہے۔"

میں سب کچھ سمجھ گیا کیونکہ سبھی جانتے ہیں کہ دل میں دھواں کب اور کیوں پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے پچھلی تفصیلات پوچھے بغیر ہی میں نے یہ پوچھ لیا۔

"تو پھر کیا ہوا تمہاری محبوبہ کو ـــــــ کیا اسکی شادی کسی اور سے ہو رہی ہے یا اس کے دشمنوں کا مزاج ...."

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میری کوئی محبوبہ ہے۔ میں نے تو ابھی تمہیں نہیں بتایا ـــــــ!"

اپنی قیافہ شناسی کی تعریف سنکر ایک لمحہ کے لئے ایک ارتعاش آگیں مسرت سے میرا دل کھل اٹھا۔ اگرچہ یہ ایک بہت ہی ادنیٰ قسم کی قیافہ شناسی ہے لیکن موقتی طور پر میں اپنے آپ کو ایک ایسا قیافہ شناس سمجھنے لگا جس نے اس کو ایک علم کی طرح باقاعدگی سے سیکھا ہو مگر پھر بے وقوفی سے میں نے اپنی قیافہ شناسی کا سارا بھرم خود ہی کھو دیا۔

"اے ـــ میں تو صرف بو سونگھ کر بتا سکتا ہوں کہ کون لڑکا یا لڑکی عشق کے آزار میں مبتلا ہے۔ عشق تو اپنا آپ پروپگنڈسٹ ہے۔"

وہ کچھ بھونڈے انداز میں شرما گیا۔ یہ عاشق و معشوق جب شرماتے ہیں تو بڑی مضحکہ خیز ہو جاتی ہیں ان کی صورتیں ـــــــ شہاب کی صورت دیکھ کر تو میری ہنسی ضبط ہی نہ کر سکا۔ شہاب بھی ہنسنے لگا ایسے جیسے کوئی آدمی منظرِ عام پر ننگا ہو جانے سے پہلے تو گھبرا جاتا ہے۔ چھپنے کے لئے کونے ڈھونڈتا ہے اور پھر کوئی راہِ فرار نہ پا کر ڈھٹائی سے اپنے تماشائیوں پر ہنسنے لگتا ہے۔ لیکن یہ ہنسی جلد ہی غائب ہو گئی۔ اور اس نے ڈانٹ پلائی۔

"ہنسو مت ـــــــ میں اس وقت تم سے بہت ضروری مشورہ کرنے آیا ہوں۔"

مجھے عورت اور مرد کی محبت پر مطلق اعتماد نہیں۔ دو برس پہلے تک میں بھی خدیجہ سے محبت کرتا تھا لیکن آج وہ ایک بلوری محل کی بیگم ہے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ غریب ہی لیکن تیرے لئے دنیا کے سارے قوانین سے بغاوت کر سکتا ہوں۔ تیرے لئے جیل کی سنگین دیواروں سے سر ٹکرانا بھی مجھے منظور ہے۔ مگر خدیجہ کے باپ کی آنکھیں بڑی سرخ سرخ اور غصیلی تھیں۔ اس کی مونچھیں بڑی بڑی اور گھنی گھنی تھیں۔ اب خدیجہ کو شوہر بھی ملا تو سرخ سرخ غصیلی آنکھوں اور گھنی گھنی مونچھوں والا ـــــــ

www.taemeernews.com

لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس بلوری محل میں میرے کمرے سے بھی
جو گئے بڑے جو بیس کمرے ہیں۔ بہت بڑا کمپونڈ ہے جس میں صرف خوشبودار
پھولوں کا باغ ہے۔ دو چمکیلی موٹریں ہیں ــــــ اور بیچاری خدیجہ
بھی تو مجبور ہے۔ کلوپیٹرا سے لیکر خدیجہ تک ہر عورت کے دل میں یہ فطری
تمنا ہوتی ہے کہ وہ زمین کے زیادہ سے زیادہ خطّے پر حکومت کرے۔ اگر وہ
میرے ایک کمرے کو چوبیس کمروں والے بلوری محل پر ترجیح دیدیتی تو شاید
ساری نسوانیت کے "... وقار کو صدمہ پہنچتا۔

سگریٹ کے کش کے ساتھ باوجود ضبط کرنے کے ایک لمبی آہ
نکل ہی گئی اور شہاب نے پوچھا:۔

"تم خاموش کیوں ہو گئے ــــــ کیا تم میری
مدد نہ کرو گے؟"

میں نے اپنے دل کی اس نئی چوٹ کو ہتھیلی سے سہلاتے ہوئے کہا:۔

"میں ضرور تمہاری مدد کروں گا شہاب ــــــ
میں اس طرح چپ چاپ تمہارے ہی متعلق سوچ
رہا تھا ــــــ تمہاری مدد کا ایک بڑا ہی اچھا
طریقہ میں نے ڈھونڈا ہے"

شہاب نے کہا:۔

"مگر تم نے میری پوری بات تو سنی ہی نہیں"

محبت کے میدان کے ایک پرانے تجربہ کار کی طرح میں نے کہا:۔

"پوری بات سننے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تم یہی
کہو گے کہ میں جس لڑکی سے محبت کرتا ہوں وہ اب
ایک ایسے شخص کے حوالے کی جا رہی ہے جو کسی
صورت میں بھی اس کے لئے موزوں نہیں ہے
وہ یا تو کوئی بڈھا سرمایہ دار ہے یا کوئی ادھیڑ عمر کا
رنڈوا یا پھر کوئی آوارہ نوجوان یا خوب شراب
پیتا ہے، جاپانی پاؤڈر اور لپ اسٹک سے لپی
تپی بازاری عورتوں کا دلدادہ ہے۔ لیکن میں
سمجھتا ہوں کہ ہر عاشق اپنے رقیب کے بارے میں
یہی رائے رکھتا ہے اور اگر برا نہ مانو تو میں کہوں
کہ تمہارے بارے میں بھی میری یہی رائے ہے"

شہاب نے غصّہ اور حیرت سے ملی جلی عجیب آواز میں پوچھا:۔

"کیا مطلب ــــــ ؟"

سگریٹ سے دوسرا سگریٹ جلاتے ہوئے میں نے اطمینان سے کہا۔

"مطلب یہ ہے مائی ڈیر شہاب ــــــ کوئی مرد عورت کو
کبھی خوش نہیں رکھ سکتا۔ اس لڑکی کی شادی اگر تم جیسے "تحت الفظ"
سے ہو جائے تو تم ساری عمر اس کو ایک ساڑی سے دوسری ساڑی
نہ پہنا سکو۔ ہر روز فاقے کراتے رہو اور ہر سال بچے پیدا کرتے رہو۔ تم
آج اس کے کانوں میں میٹھی میٹھی لمبی لمبی سرگوشیاں کرتے ہو لیکن اس سے
تمہاری شادی ہو جائے تو تم اس کو محض اس بات پر ڈانٹ دو گے کہ
اس نے سالن میں اتنا زیادہ نمک کیوں ڈال دیا؟ آج وہ سرخ شلوار پہنے
ہوئے تمہیں بہت حسین و رنگین نظر آ رہی ہے لیکن کل اسی سرخ شلوار کو
دیکھ کر تم جلا اٹھو گے ــــــ کہ "ارے میں کہتا ہوں یہ شلوار
بدل ڈالو۔"

شہاب نے بڑی غصیلی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا:۔

"کیا بک رہے ہو تم ــــــ میں تمہاری
خرافات تو سننے نہیں آیا تھا یہاں ــــــ ؟"

میں نے شہاب کے منہ پر سگریٹ کا سارا دھواں اگلتے ہوئے کہا:۔

"یار ــــــ جب تم غصے سے سرخ ہو جاتے ہو تو میرا جی سب
سیب کھانے کو چاہتا ہے ــــــ"

شہاب کھسیانا ہو کر مسکرانے لگا۔

"دیکھو ــــــ میں پھر کہہ رہا ہوں کہ میں اس وقت
قطعی مذاق کے موڈ میں نہیں"

میں نے مصنوعی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اور ــــــ آج میں بھی کسی مجبور کی مدد کرنے
کے بہت موڈ میں ہوں"

شہاب نے گالی دی۔

"تیری ایسی تیسی ــــــ مذاق چھوڑ پہلے پوری
بات سن لے ــــــ"

میں نے اس کو اڑاتے ہوئے کہا:۔

"ابے ہٹ یار ــــــ کیا پوری بات سنائیگا۔
تو اگر نصیحت نہیں سنتا تو سن ــــــ یہ شہنائی
کی آواز سن ــــــ دور سے یہ شہنائی کی آواز کتنی میٹھی

میٹھی اور رسیلی محسوس ہو رہی ہے۔ میرے پیارے دوست تیری محبوبہ بھی شہنائی کی آواز ہے۔ اسے دور ہی سے سن۔ قریب آجانے پر یہی رسیلی آواز بڑی کرخت ہو جائیگی ——— مائی ڈیر شہاب ——— محبوبہ بھی فاصلے کی پابند ہوتی ہے جس کا بھی فاصلے سے بڑا لگاؤ ہے ———

شہاب غصے سے اٹھ کھڑا ہوا اور گرجنے لگا۔

"تم میرا مذاق اڑا رہے ہو ——— بیہودے۔ میں تمہیں اتنا خودغرض اور کمینہ نہیں سمجھتا تھا۔"

میں نے شہاب کا راستہ روک لیا اور شہاب ہی کی طرح غرا کے کہا۔

"شہاب آج میں تمہیں یہاں سے اس وقت تک نہ جانے دوں گا جب تک تم اپنی محبوبہ کو بھول جانے کا عہد نہ کرو ——— یہ محبت نہیں۔ بلکہ ذلیل سی جوانی کا گھن ہے۔ دراصل تم خودغرض اور کمینے ہو صرف ایک ہی لڑکی کے عشق میں تم ساری انسانیت سے دغا کر رہے ہو۔ تمہارا دل اتنا تنگ کیوں ہے کہ اس میں ایک ہی لڑکی سما سکے۔ اپنے دل کو اتنا وسیع کرو کہ اس کی پہنائیوں میں چالیس کروڑ انسان سما سکیں ——— اعلیٰ ترین محبت یہی ہے۔"

شہاب نے میری قمیص کا کالر پکڑ کر کہا۔

"ہٹ جاؤ میرے راستے سے ——— مجھے تم جیسے پاگلوں کی بکواس کی ضرورت نہیں۔"

میں نے اس کے دونوں شانے مضبوط پکڑ کر کہا۔

"شہاب ——— تم دیکھ رہے ہو۔ میرا قد چھ فٹ ایک انچ ہے۔ میرے سینے کی چوڑائی ۳۵ انچ ہے۔ میرا وزن ایک سو انچاس پاؤنڈ ہے۔ میرے کنوارے گول گول بازوؤں میں تم جیسے چار شہابوں کو روک لینے اور سنبھالنے کی قوت ہے۔ تم یہاں سے جا نہیں سکتے ——— عہد کرو کہ تم اپنی محبوبہ کو بھول جاؤ گے ——— میرے ڈارلنگ دوست ——— یہ وقت سرخ عروسی شیروانی پہننے کا نہیں جبکہ ساری انسانیت لہو میں نہا رہی ہے۔ تمہاری محبوبہ کی یہ کلیاں تو اب بھی سنوری ہوئی ہیں لیکن اب سر پیٹتی ہوئی انسانیت کی زلفوں میں کتنے الجھیڑے پڑ گئے ہیں ———"

شہاب نے چڑ کر مجھے دھکیلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہٹ جاؤ ——— ورنہ میں تمہارے منہ پر گھونسہ لگا دوں گا ———"

میں نے کڑوی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے تم کیا گھونسہ لگاؤ گے۔ اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے کے لئے مدد مانگتے پھر رہے ہو۔ اور اپنے آپ کو عاشق بھی کہتے ہو۔ گھونسہ لگانے کا بھی دعویٰ کرتے ہو۔ واہ ——— عشق تو طاقت کا نام ہے اور تمہارا وزن صرف ۱۱۲ پاؤنڈ۔ تم اپنی محبوبہ کے والدین سے ڈرتے ہو۔ چوراہے پر کھڑے ہوئے پولیس کے سپاہی سے ڈرتے ہو۔ عدالت کے کٹہرے سے ڈرتے ہو۔ حتیٰ کہ اپنے آپ سے ڈرتے ہو۔ اور پھر کہتے ہو کہ تمہیں اس سے محبت ہے۔ یہ محبت نہیں بلکہ اس لڑکی کے نرم و گداز لچکیلے جسم میں جو شہوانی مقناطیس ہے وہ تمہیں اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ ایک طرح کا عشقِ لذت تمہیں اس کی طرف دھکیل رہا ہے۔ میرے ہم جلیس ——— اگر محبت ہوتی تو نارِ نمرود میں کود جانے والی ابراہیمیت تم میں پیدا ہو جاتی۔ تم عقل و خرد کی گھاٹیوں میں یوں آوارہ نہ پھرتے مجھ جیسے ارسطو سے صلاح مشورہ نہ کرتے ——— ذرا اپنی تاریخ کے ماضی میں تو جھانکو ——— وہ دیکھو پرتھوی راج ہزاروں دشمنوں کے مجمع سے جہاں شہزادی کو اڑا لئے جا رہا ہے۔ میرے بیوقوف دوست ——— چیرز دو چیرز ——— یہاں بجاؤ تالیاں ———"

شرارتاً میں نے شہاب کے گال تھپتھپا دئے اور وہ جھینپ کر کرسی پر بیٹھ گیا میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب تم واقعی شہاب ہو ——— میرے سعادتمند دوست ——— محبت میں خون کی روانی اتنی ہی تیز ہوتی ہے کہ تم بار بار غصہ میں اٹھ کھڑے ہو جاتے ہو ——— اب دیکھو۔ اس کرسی پر کھسیانی بلی کی طرح

بیٹھے ہوئے کیسے دلچسپ نظر آ رہے ہو۔ اجازت دو تو تمہاری ایک تصویر اسی پوز Pose میں کھینچ لوں۔ اور تمہاری محبوبہ کے پاس بھیج دوں ——— مگر شاید لڑکیاں کھسیانے پنے پسند نہیں کرتیں ؟"

شہاب ہنسی نہ روک سکا اور میں نے تکیئے کے سہارے نیم دراز ہوکر دو سگریٹ ایک ساتھ جلائے اور ایک شہاب کی انگلیوں میں تھما دیا۔ اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش کھینچتے ہوئے کہا:۔

"آج تم اتنی بکواس کیوں کر رہے ہو ———"

میں نے جواب دیا:۔

"آج تعطیل ہے اور میں خالص ہندوستانی ہوں میرا پڑدادا وسط ایشیا سے نہیں آیا تھا لیکن میں بکواس تو نہیں کر رہا ہوں ——— شہاب تم ہی کہو کہ تمہاری محبوبہ کو کیا حق ہے کہ ایک جاہل قوم کے تعلیم یافتہ فرزند کو دیس کے بجائے اپنی گداز آغوش کا لالچ دے ——— مستقبل کے سوداگر کو اپنی زلفوں کی گھنیری چھاؤں میں میٹھی نیند سلا دے ——— ہماری آنکھوں کے آگے کوہِ نور چمک رہا ہے لیکن یہ لڑکیاں بیچ میں اپنے رنگ برنگی آنچل کیوں پھیلا دیتی ہیں"

سگریٹ کے نشے نے شاید شہاب کو بھی انسپائر کر دیا تھا۔

"تمہارا خیال غلط ہے۔ عورت اگر دوش بدوش ہو تو ہم کوہِ نور کیا آسمان کے تارے توڑ لائیں"

مجھے جیسے گدگدی ہوئی اور میں ہنس پڑا۔

"یہ آسمان کے تارے توڑنے کی بھی خوب رہی۔ ہر انسان آسمان کے تارے توڑ لاتا رہا ہے لیکن نئے نئے انسانوں کے ساتھ ساتھ نئے نئے تارے بھی آسمان پر نمودار ہوتے رہے ہیں نہ انسان ختم ہوں گے اور نہ تارے ——— یہی حال رہا تو میری موت کی وجہ قنوطیت ہوگی"

شہاب نے مجھ پر چوٹ کی۔

"مگر میری محبوبہ تمہاری خدیجہ کی طرح نہ جاہل ہے نہ اور نہ ڈرپوک ———"

شہاب کا یہ جملہ جیسے میرے دل میں چبھا اور میں نے تڑپ کر کہا:۔

"میں کہتا ہوں اس دیس کی ہر لڑکی خدیجہ ہے۔ اپنے والدین کی سرخ سرخ آنکھوں اور گھنی گھنی مونچھوں سے ڈرنے والی۔ باہر گلی میں بندوق کی آواز سن کر اپنے شوہر کو اپنی باہوں میں قید کر لینے والی۔ اپنے آنسوؤں سے اپنے شوہر کے دل کو گھول گھول کر نرم اور کمزور بنانے والی یہ عورتیں دوش بدوش ہوں تو پھر اپنی سلامتی ہی خطرے میں پڑ جائے۔

شہاب نے اکڑ کر جواب دیا:۔

ذرا میری اس سے شادی تو ہو لینے دو۔ پھر میں تم کو قائل کرا دوں گا کہ زندگی کے راستے پر عورت کا دوش بدوش ہونا کتنا ضروری ہے۔ اچھا اب میں جاتا ہوں۔

وہ جانے لگا اور میں غصے سے پلنگ پر اٹھ بیٹھا اور چیخ پڑا۔

"ٹھیرو ——— کہاں جاتے ہو۔ پہلے اقرار کر دو کہ جب تک دھرتی ماتا کی کلیاں نہ سنور جائیں تم اپنی محبوبہ کی مانگ میں سہاگ کی افشاں نہ بکھیرو گے ———

ٹھیرو ——— اے کمینے، خودغرض —— مردود!"

شہاب سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ وہاں سے ہاتھ ہلاتے ہوئے اس نے پکارا۔

"تھینک یو فار دی کامپلیمنٹس مائی ڈیر ———

٭　٭　٭　٭　٭　٭　٭　٭

اس ملاقات کے چند مہینوں بعد ایک شام میں نے عابد روڈ پھولوں سے لدی پھندی ایک سرخ رنگ کی موٹر ہمیوں براتیوں کے ہجوم میں چیونٹی کی طرح رینگتے دیکھی۔ پھولوں کے سہرے میں مجھے شہاب کی موٹی بھدی ناک نظر آئی۔ میں نے موٹر کے قریب جا کر شہاب کے کان میں کہا:۔

"کیوں بے ——— یہ قوم کی خدمت شروع ہو گئی۔ مگر تو نے مجھے دعوت کیوں نہیں دی ———؟"

شہاب نے میرے بازو میں چٹکی لیتے ہوئے کہا:۔

"کسی سے میں نے سنا تھا کہ تو مر گیا ہے"

میں نے رینگتا ہوئے موٹر کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا:۔

"اچھا اب کچھ ہی دن انتظار کر معلوم ہو جائے گا کہ دراصل کون مر گیا ہے ———؟"

www.taemeernews.com

شہاب نے بات بدلنے کی خاطر کہا :-

"اچھا رات میں گھر آنا ——— بریانی ملیگی کھانے کو"

میں نے پیٹ سہلاتے ہوئے جواب دیا :-

"مجھے تو بھوک نہیں — کہو تو اپنے پالتو کتے کو

بھجوا دوں ———"

اور پھر میں باتوں سے نکل کر سپرونٹ ہاتھ پڑ آگیا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

پھر چند مہینے گذر گئے۔ ایک دن شہاب پھر ملا میں نے پوچھا :-

"تم اور تمہاری تعلیم یافتہ بہادر بیوی ایک دوسرے

کے دوش بدوش کتنے ستارے آسمان سے توڑ لاتے ہو۔"

اس نے ذرا جھینپتے ہوئے کہا :-

"اور تین مہینے ٹھہر جاؤ ——— ایک بڑا ہی پرنور

ستارہ طلوع ہونے والا ہے۔"

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

تین مہینے اور گذر گئے۔ شہاب کے گھر وہ پرنور ستارہ طلوع ہوا اور میں نے دعوت میں بریانی کھائی۔ اس کے بعد میں روز شہاب کے گھر جانے لگا۔ لیکن ستارہ کیا طلوع ہوا شہاب کے چہرے کی روشنی ماند پڑنے لگی۔ جب دیکھو جھلایا ہوا چڑچڑا ——— بدمزاج۔ اسی اثنا میں اس کے بچے کی آیا سے شہاب کے گھر کے قصے بھی معلوم ہونے لگے۔ وہی شہاب جو کہتا تھا کہ مجھے دنیا میں صرف اپنی محبوبہ کے کان میں سرگوشیاں کرنے کا مشغلہ پسند ہے۔ اب چار چار روز تک اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ وہ سبز ساڑھی باندھتی تو وہ اسے نیلی ساڑھی باندھنے کو کہتا۔ وہ شفقی رنگ کا بلاؤز پہنتی تو وہ اسے سلمہ ستارے والا بلاؤز پہننے کو کہتا ——— وہ سرخ شلوار پہنتی تو وہ چلا اٹھتا ——— ارے میں کہتا ہوں یہ شلوار بدل ڈالو۔

ایک دن میں نے شہاب کو چھیڑا۔

"ڈیر شہاب ——— سنا ہے آجکل تو آپ اور آپکی

بیگم دوش بدوش بڑی ہنگامہ آرا زندگی بسر کر رہے ہیں

میں سنا چاہتا ہوں کہ دلیں اب آزادی ہوا چاہتی ہے"

شہاب نے میرے بائیں گال پر ایک زوردار تھپڑ لگا دیا۔ میں اس تھپڑ کا جواب تو دینا چاہتا تھا لیکن شہاب کی صورت پر بڑی بیتی برستی ہے۔ اور اب تو دن کا دباؤ بھی کم ہو گیا تھا۔ میٹھی میٹھی لمبی لمبی سرگوشیاں بھی ختم ہو گئی تھیں سرخ شلوار بھی اتر گئی تھی۔ اور اب تو شہاب مر بھی گیا تھا وہ شہاب جس کا دن ہوٹلوں اور کافی ہاؤس میں گزرتا تھا اب مہینے میں ایک آدھ بار دکھائی دیا تو ایسا محسوس ہوا جیسے خواب میں اسے دیکھ لیا۔ اس کی بیوی کے رنگیلے آنچل کی اوٹ میں چالیس کروڑ سہمے کے ننگے انسان زندگی کے پنجے میں کلبلا رہے تھے لیکن اس کے اپنے بچے کی کلبلاہٹ اسے کچھ بھی نہیں سننے دیتی تھی۔ وہ تو اپنی بیوی کی زلفوں کی گھنیری چھاؤں میں کبھی کا لمبی تان کر سو گیا تھا ——— مر گیا تھا۔

....

....

....

لیکن ایک دن میں نے سنا کہ اس کی بیوی نے آلو کے سالن میں بہت زیادہ مرچ ڈالدی تھی اور اس کے منع کرنے کے باوجود سرخ شلوار پہنی تھی۔ اور شہاب نے آپے سے باہر ہو کر اس کو اتنا پیٹا تھا کہ وہ میکے چلی گئی تھی۔

تمام دوستوں کا خیال ہے کہ اس کی بیوی تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ بڑی ضدی اور مغرور تھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس کے میکے چلے جانے سے اس کا حسن پھر سے عود کر آ ئے گا۔ وہ پھر سے خوبصورت بن جائیگی۔ چاہے وہ میلی کچیلی شلوار ہی کیوں نہ پہنے اور شہاب ایسا محسوس کریگا جیسے شہنائی کہیں دور بج رہی ہے۔

دو نئی کتابیں

زرد چہرے ابراہیم جلیس کے افسانوں کا مجموعہ جس پر قاضی عبدالغفار نے مقدمہ بھی لکھا ہے اگر قاضی صاحب کا مقدمہ بھی اس پر نہ ہوتا تو کتاب اپنے ادبی وقار کو ذرہ برابر نہ گرنے دیتی۔ قیمت دو روپے چار آنے (عہ)

روسی ظرافت ترجمہ مسلم ضیائی ایم۔ اے جس میں روس کے تمام مزاح نگار اور طنز نگاروں کے شاہکاروں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ قیمت دو روپے چار آنے (عہ)

نگارستان ایجنسی اردو بازار دلی

www.taemeernews.com

پرواز کے بعد

قرۃ العین حیدر

جیسے کہیں خواب میں جنجر روجرز یا ڈائنا ڈربن کی آواز میں سان فرنیڈو ویلی" کا نغمہ گایا جا رہا ہو اور پھر ایک دم سے آنکھ کھل جائے یعنی وہ کچھ ایسا سا تھا جیسے مائیکل اینجلو نے ایک تصویر کو مکمل کرتے کرتے اکتا کر یونہی چھوڑ دیا ہو اور خود کسی زیادہ دلچسپ موڈل کی طرف متوجہ ہو گیا ہو۔ لیکن پھر بھی اس کی سنجیدہ سی ہنسی کہہ رہی تھی کہ کبھی میں ایسا ہوں کہ دنیا کے سارے مصور اور سارے سنگتراش اپنی پوری کوششوں کے باوجود مجھ جیسا شاہکار نہیں بنا سکتے چپکے چپکے مسکرائے جاؤ بیوقوف۔ شاید تمہیں بعد میں افسوس کرنا پڑے -

اوسیغو ــــــ اوسائیکی ــــــ اوہیلن ــــــ

اے ہمارے نئے ریفریجریٹر ــــــ

گرمی زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ پام کے پتوں پر جو مالی نے اوپر سے پانی گرایا تھا تو گرد کہیں کہیں سے دھل گئی تھی اور کہیں کہیں اسی طرح باقی تھی۔ اور بھیگتی ہوئی رات کوشش کر رہی تھی کہ کچھ رومینٹک سی بنجائے۔ وہ برفیلی لڑکی جو ہمیشہ سفید غرارے اور سفید دوپٹے میں اپنے آپ کو سب سے بلند اور الگ سا محسوس کرنے پر مجبور کرتی تھی، بہت خاموشی سے ہکسلے کی ایک بیحد لغو کتاب "پوائنٹ کاؤنٹر پوائنٹ" پڑھے جا رہی تھی جس کے ایک لفظ کا مطلب بھی اس کی سمجھ میں نہ گھس سکا تھا۔

وہ لیمپ کی سفید روشنی میں اتنی زرد اور غمگین نظر آ رہی تھی جیسے اس کے برگنڈی کیوٹکس کی ساری شیشیاں فرش پر گر کے ٹوٹ گئی ہوں یا اس کے مینڈو کو سخت زکام ہو گیا ہو اور جیسے ایک چھوٹے سے گلیشیر پہ آفتاب کی کرنیں بکھر رہی تھیں۔

چنانچہ اس دوسری آتشین لڑکی نے جو ... سائنس کی طالب علم ہونے کی وجہ سے زیادہ پریکٹیکل تھی اور جو اس وقت برآمدے کے سبز جنگلے پر بیٹھی گملے میں سے ایک شاخ توڑ کر اس کی کیلیا ونٹاور ڈبل کیپاڈنڈ پتیوں کے مطالعے میں مصروف تھی، اس برفیلی لڑکی کو یہ رائے دی تھی کہ اگر گرمی زیادہ ہے تو پوائنٹ کاؤنٹر پوائنٹ پڑھنے کے بجائے سو جاؤ یا پھر نئے ریفریجریٹر میں گھس کر بیٹھ جاؤ حالانکہ گرمی اس میں اور بھی زیادہ ہو گی مگر اس کا اثر دماغ کے لئے مفید ہو گا کیونکہ اس میں رکھے ہوئے گرم گرم آم بالکل ادھوں کی طرح سرد ہو جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ تجویز قطعی ناقابل عمل تھی اور کوئی دوسرا نسخہ اس سائنس کی طالب علم کے ذہن میں اس وقت نہیں آ رہا تھا اس لئے وہ برفیلی لڑکی خشمگیں ... اسی طرح ہکسلے سے دماغ لڑاتی رہی اور وہ آتشین لڑکی شاہینہ بانو پیر ہلا ہلا کر ایک گیت گانے لگی جو اس نے فرسٹ اسٹینڈرڈ میں سیکھا تھا اور جس کا مطلب تھا کہ جب شاہ جارج کے سرخ لباس والے سپاہیوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز بازگشت ہماری پرانی اسکاچ پہاڑیوں ... میں ڈوب جائے گی اور اپریل کے مہتاب کا طلائی بجرا موسم بہار کے آسمان کی نیلی لہروں میں تیرتا ہوا تمہارے باورچیخانے کی چمنی کے اوپر پہنچ جائے گا اس وقت تم وادی کے نشیب میں میرے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنو گی اے سرائے کے مالک کی سیاہ آنکھوں اور سرخ لبوں والی بیٹی ــــ!

لیکن رات خاصی گرم ہوتی جا رہی تھی اور نا ہم کا ایک کونہ جو سمندر میں دور تک نکلا چلا گیا تھا اس پر ناریل کے جھنڈ کے پیچھے سے چاند طلوع ہو رہا تھا اور دور ایک جزیرے پر بنے ہوئے پرانے کھنڈر میں گھنٹے کی گونج اور (Evensong) کی لہریں لرزاں تھیں اور اس وقت مائیکل اینجلو کے ادھورے شاہکار تم کو ایک بڑی عجیب سی ناقابل تشریح کوفت اور الجھن سی محسوس ہو رہی تھی جس کا تجزیہ وہ کسی طرح بھی نہ کر سکتا تھا حالانکہ وہ مطمئن تھا کہ ایسے حادثے وہاں تقریباً روزانہ شام کو ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی وہ ایک سخت بہت پریشان سا ہو گیا تھا۔

کیونکہ آج دوپہر اس کو بہت تلخی سے یہ احساس ہوا کہ وہ مغرور چھوٹے چھوٹے بالوں والی برفیلی سی لڑکی جو ہر وقت اپنے مجموں پر جھکی رہتی ہے اوروں سے کس قدر زیادہ مختلف ہے

www.taemeernews.com

جب اس نے اس چھوٹے سے قد والی لڑکی سے جس کی چھوٹی سی ناک پر بے اختیار پیار آجاتا تھا اور جسے وہ تھوڑی دیر بعد احتیاط سے پاؤڈر کرلیتی تھی اور جس کی بڑے سے ہیٹ کی زرد ڈوری پر گہرے سبز شنائل کی ٹہنیوں سے بندھے ہوئے ... مصنوعی شگوفے سج رہے تھے، بعد از ... کے لہجے میں پوچھا کہ میرے ساتھ شام کا کھانا کھانے چلو گی تو اس نے جواب دیا تھا ہاں چلو ——— اور پھر وہ اس کے ساتھ ... پچھلے قدموں سے زینہ طے کر کے نیچے سڑک پر آگئی تھی اور بس اسٹینڈ کی سمت بڑھتے ہوئے اس چھوٹی سی لڑکی نے، جس کی طرح کی لڑکیاں ... یا کناٹ پلیس میں تیزی سے ادھر سے ادھر جاتی نظر آتی ہیں اس سے پوچھا تھا تم نے اسکول کب سے جوائن کیا ہے؟

ابھی ایک ٹرم بھی پوری نہیں ہوئی ... اور ... یاسے تمہارا ؟

مگ ——— میگڈ ... ڈی ... اور تمہارا ؟

جم ——— جمال ——— جمال ... ——— جو تم پسند کرو

اور وہ دونوں بس اسٹیشن کے مجمع ... میں ... گئے۔

اور اس برفیلی لڑکی نے اپنے بھورے بھورے بال پیچھے کو سمیٹے اور اپنے دن بھر کے کام کو غور سے دیکھنے کے بعد اپنی کار کے انتظار میں کلاس روم کی کھڑکی میں آکھڑی ہوئی۔

اور وہ پیاری سی ناک ... والی میگ روز شام کی طرح خداوند خدا کی کنواری ماں کی تصویر کے آگے شمع روشن کرتے ہوئی سوچ رہی تھی کہ مجسموں میں اگر احساسِ زندگی پیدا ہو جائے تو بڑی مصیبت ہوتی ہے۔ اور پھر بھلا نتائج پر کون غور کرتا پھرے ——— طوفانی لہروں کا ایک ریلا جو ساحلوں سے ٹکراتا پھر رہا تھا سیاہ آنکھوں والے فنکار کی گرم سانسوں نے اس سرد اور بے روح مجسمے میں جان ڈال دی تھی۔ گلیشیا کی طرح ——— لیکن یہ بہت پرانی بات تھی۔ کاش کار ل اسل ٹو کے نیچے اس سے کبھی نہ ملتا میگ جس نے اپنی عمر ان سرد مجسموں کی معیت میں گذاری تھی جو اس کے چھوٹے سے قصبے کی خانقاہ کے بھورے پتھروں والے اندھیرے ہال اور دوسرے کمروں میں پھیلے پڑے تھے برسوں سے ایک ہی طرح۔ سینٹ اگنس اور سینٹ فرانسس اور سینٹ جارج ——— زندگی منجمد پتھروں کا ایک ڈھیر تھی اور پیدا ہونے کے جرم کی پاداش One Mario کی خوابیدہ موسیقی اور دعاؤں کی کتاب کا نیلا ربن ——— یہ بہت پرانی بات تھی یہ ———

پھر اس کی آنکھیں نیور لجیا کے شدید درد سے بند ہونے لگیں اور وہ اپنے ننھے سے سفید پلنگ پر گر گئی۔ کارل اولاس کا گنار ——— ... ل کی رو برٹ ٹائلر جیسی ناک، جس پر ایک شام روشن ایرانی نے غصے میں آکر ایک مکہ رسید کیا تھا۔ روشن ایرانی، ... راعظم مسعود اور آفتاب ——— ہم کے وہ تین پورپین دوست جو دن بھر برٹش نیوز ایجنسی میں کام کرنے کے بعد ... پیانو بجا بجا کر شور مچایا کرتے تھے۔ پھر گیٹ وے آف انڈیا کی محرابوں کے وہ اندھیرے سائے وہ ہسپانوی سرینیڈ۔

کلاس میں وہ برفیلی لڑکی ایک آدھ بار بے ... اسی سے نظر اٹھا کر اسے دیکھتی اور بڑی معروفیت سے مجسے ... کراس کے پیر تراشنے لگتی۔ اور مائیکل اینجلو کے شاہکار کے اودے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر کے رہ جاتی۔

مئی کی ... سی راتیں اس طرح گذر گئیں۔

بولیوارڈ ... درختوں کے سائے میں کھلے آسمان اور چمکیلے ستاروں کے نیچے موسم گرما کے MARRYMAKERS ... رخشندہ کو وہ سارے پرانے گیت یاد دلائے دے رہے تھے جن کی طرزوں کی سیٹی ... سنتے ہی اس کا دل ڈوب سا جاتا تھا ——— ٹارا الارا ٹارا الارا جون پیل ... روز ماری ——— گڈ نائٹ مائی لو ——— ماریا ایلینا ——— ... میں ڈوبے ہوئے سمندری ریت کے ٹھنڈے ٹیلوں پر سے دوسرے ساتھیوں کے گیتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ ریت پر ٹہلتے ٹہلتے تھک کر رخشندہ کہنے لگی ——— برج ماما کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم سب ایک دوسرے کو غمگین بنائے بغیر زندگی گذار سکیں اور سارے کام ہمیشہ ٹھیک ٹھیک طرح ہوا کریں ——— دنیا کے یہ عقلمند عقلمند لوگ ———

رات خاموش ہوتی جارہی تھی۔ برج کو اس سے خیال آیا کہ اس نے ایک فلم میں شاید "بلڈ اینڈ سینڈ" میں ایک ... ساجملہ سنا تھا جو اس کو اب تک یاد تھا۔

MADAM, WALKING ALONGINLIFE WITH YOU HAS BEENAGLACIOUS TIME.

رخشندہ اس کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور ان کے قدموں کے نشان ریت پر ان کے پیچھے پیچھے بنتے جا رہے تھے۔ اور بحیرۂ عرب کی نیلی، ٹھنڈی موجیں ان کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ رخشندہ رانی۔ مہتاب ہنس رہا ہے تم بھی مسکرا دو ——

او انکل ٹوبی —— تم اتنے اچھے سے ہو۔ میں سچ مچ بے انتہا بیوقوف ہو گئی ہوں۔

کیونکہ اس نے سنا تھا کہ اس کا ہونیوالا منگیتر بمبئی اسکول آف اکنومکس سے ڈگری۔ لینے کے بعد گھر واپس جانے کے بجائے یہاں صرف اس لئے رہتا ہے کیونکہ یہاں اس کی ایک کیب موجود ہے اور وہ ڈرنک بھی کرتا ہے اور موسم گرما کی چاندنی راتوں میں اپنے بوہیمین دوستوں کے ساتھ اپنی سرخ گرجتی ہوئی کار میں ورسوا اور جوہو کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا ہے —— اور آنٹیں لڑکی نے چلا کر کہا تھا تو وہ تم کیسی پاگل ہو —— او خدا ——

او خدا —— وہ کیسے دن تھے —— وہ کیا زمانہ تھا۔

انیس بیس سے لے کر چوبیس پچیس سال تک کی وہ عمریں —— ذرا ذرا سی بات، معمولی سے واقعات، جذبات کی لہریں، بڑی زبردست ٹریجڈی یا کومیڈی یا میلوڈراما معلوم ہوتی تھیں —— وہ چاروں دوست، ایک دوسرے کے خیالات وافکار دکھ سکھ اور محبتوں کے شریک —— مہینے کے آخر میں ردمین رولینڈ یا شا کی تازہ کتابیں خریدنے کے لئے اپنے فاؤنٹن پن بیچنے کو تیار —— بگ کی حفاظت اور عزت کی خاطر کارل کی دل کش ناک پر مکہ رسید کرنے کو مستعد —— شام کو مادر مقدس کی تصویر کے سامنے شمع جلانے کے بعد بگ ان کے لئے چائے تیار کرتی۔ ان کے اور بہت سے دوست آتے —— اور وہ سب دیوان پر، صوفے پر، قالینوں پر بیٹھ کر مصری تمباکو کا دھواں اڑاتے ہوئے جانے کیا کیا باتیں کرتے رہتے لمبی لمبی بحثیں اور تنقیدیں جن کو وہ بالکل نہ سمجھ سکی ——

سکر وائیلڈ کی زندگی، ڈی ایچ لارنس کی کتابیں، لیگی وزارتوں کی چپقلش، ریڈ اسٹار اور رشا، بنگال، خدا اور مذہب اور اکثر وہ جوش میں آ کر ایسی ایسی باتیں کہہ جاتے کہ وہ خوف سے لرز سی اٹھتی اور مریم کی طرف عفو طلب نگاہیں اٹھا دیتی پھر کوئی چیز ان کی مرضی کے خلاف ہو جاتی تو وہ اسے ڈانٹ دیتے تھے۔ مہینہ ختم ہونے سے بہت پہلے اگر بٹر وال کے کوپن تمام ہو جاتے یا بار بار ری ٹچنگ کرنے پر بھی کوئی تصویر درست نہ ہوتی یا فلیٹ کا کرایہ ادا کرنے سے قبل ہی پکنکوں اور سینما پر سارا روپیہ ختم ہو جاتا تو وہ چاروں فوراً اپنے آپ کو WRECHSOFLIFE سمجھنے پر مستعد ہو جاتے اور یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتے کہ وہ فنکار ہیں اس لئے زندگی کے ان زبردست مصائب میں گرفتار ہیں —— اور بگ کو ان کے بچپن پر پیار آ جاتا۔

او میگڈلین —— او موسم گل کے نیلے پرندو ——

بحیرہ عرب سے اٹھنے والے بھاری بھاری بادل [۲۳] کالج روڈ ماٹنگا کے اس فلیٹ کی جانب اڑتے چلے آ رہے تھے جس کے نیچے ایک سیاہ بیوک آ کر رکی اور زینے طے کرنے کے بعد LAN DING پر پہنچ کر کسی نے زور سے گھنٹی بجائی اور چمکیلے پتھروں سے سجی ہوئی دو شاندار خواتین اندر آ کر صوفے پر اس طرح بیٹھ گئیں گویا ایسا کرنے کا انہیں پورا پورا حق حاصل تھا۔ تین دوست گھبرا کر تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر کمرے میں ایک عجیب حساس سی خاموشی طاری ہو گئی۔ کھڑکیوں کے باہر بادل آہستہ آہستہ گرج رہے تھے۔

آپ جمال انور احمد کے دوست ہیں نا؟ اس خاتون نے جس کے اونچے اونچے ہالی ووڈ اسٹائل کے بال تھے ساری کے آنچل کو بازو پر لپیٹتے ہوئے گہری آواز میں پوچھا۔ وہی ڈرامہ شروع ہونیوالا تھا جو ایسے موقعوں پر آج تک ہزاروں مرتبہ کھیلا جا چکا ہے۔

وہ عورت کون ہے جس کے ساتھ وہ یہاں رہتا ہے؟ دوسری، زیادہ گرانبار خاتون نے سوال کیا۔ عورت —— انہوں نے بگ کو ایک پیاری سی معصوم سی، رنگین تصویر کے سوائے اور کسی زاویۂ نظر سے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا —— عورت —— اس کے لئے بڑا بھونڈا لفظ تھا ——

www.taemeernews.com

وہ تو یاسمین کی کلیوں کا خواب تھی بس ۔۔۔۔ وہ سوچنے لگے کہ ان شہزادیوں جیسی عالیشان خواتین سے کن الفاظ میں اور کس طریقے سے بات کریں ۔۔۔۔ پہلی کم عمر خاتون نے شاید یہ خیال کرکے کہ یہ جرنلسٹ اور فنکار ضرورت سے زیادہ حساس ہوتے ہیں، ذرا نرمی سے پھر پوچھا ۔۔۔۔

"میرا مطلب ہے کہ وہ خاتون کون ہیں اور یہاں کب سے ۔۔۔۔ "رگ کے لئے خاتون" کا لفظ بھی بڑا عجیب سا معلوم ہوا۔ رگ تو بس رگ تھی۔ یاسمین کی ایک بڑی سی کلی۔

"آپ انہیں جانتے ہیں؟"

"جی ہاں، بہت اچھی طرح سے۔"

"معلوم ہوا۔ ہے کہ ایک مس ہیگڈلین ڈی کوڈرا ۔۔۔"

"جی ۔۔۔۔ جی ہاں درست بالکل ۔۔۔۔ جی ۔۔۔"

"آپ کو ضرور معلوم ہوگا کہ وہ کون اور کس طرح کی ۔۔"

وہ تینوں ایک دم پھر پریشان ہوگئے۔ "معاف فرمائیگا یہ ہم کو نہیں معلوم۔"

"خوب۔ اور آپ انہیں بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں ۔۔۔۔"

"کیا یہ لڑکی کسی باعزت طبقے سے تعلق رکھتی ہے؟"

دوسری خاتون نے اپنی بزرگانہ بلندی سے کہا۔

باعزت طبقہ ۔۔۔۔ رگ کے متعلق یہ ایک نیا انکشاف تھا جو پہلے ان کے دماغ میں کبھی نہ آیا تھا۔ ان تینوں میں سے ایک چپکے سے دیوان پر سے اُٹھ کر پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا اور باقی کے دونوں دل ہی دل میں اسے بددعائیں دینے لگے۔

"باعزت ۔۔۔۔ ار ۔۔۔۔ دیکھئے اس لفظ کو مختلف معنوں میں لیا جاسکتا ہے ۔۔۔۔ خصوصاً اس شہر کی سوسائٹی میں ۔۔۔۔ یعنی کہ ۔۔۔۔ ار ۔۔۔۔"

اعظم مسعود سینٹ زیویٹرز میں لوجک کا بہت اچھا طالبعلم رہ چکا تھا۔ دل میں اس نے کہا کم بخت جم کا بچہ خود تو غائب ہوگیا اور ہم اس مصیبت میں پھنس گئے۔ آنے دو گدھے کو۔ زینے کی طرف کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور وہ اندر آئی اور اس نے ان معزز مہمانوں کو ایک لمحے کے لئے غور سے دیکھا اور ذرا پیچھے کو ہٹ گئی ۔۔۔۔

"آپ مس ڈی کوڈرا ہیں؟"

معاف کیجئے گا ہم آپ کے گھر میں اس طرح بلا اجازت اور بغیر اطلاع آگئے لیکن ۔۔۔۔"

"مادموزیل آپ غلطی پر ہیں۔ یہ میرا گھر نہیں ہے میرے پاس فرسٹ فلور پر صرف ایک کمرہ ہے۔ میں ان لوگوں کے لئے چاء اور کھانا تیار کرنے یہاں آئی ہوں۔"

اور ان دونوں اونچی خواتین نے اپنی بلندی پر سے جھک کر دیکھا کہ وہ محض ایک سفید خام بادرچن ہے ۔۔۔۔ یعنی یہ بڑی بڑی آنکھوں والی بھولی سی لڑکی ۔۔۔۔ اسی کی طرح کی دوسری سینکڑوں سفید خام یہودی اور اینگلو لڑکیوں میں سے ایک ۔۔۔۔ اف۔ نفرت کی پوٹ ۔۔۔۔

گفتگو بہت طول کھینچ رہی تھی۔ بڑی خاتون نے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے کہا ۔۔۔۔

"دیکھو لڑکی ۔ کیا تم میرے بیٹے کو پسند کرتی ہو؟"

کیسا بیوقوفی کا سوال تھا۔ اس نے سوچا۔ بھلا جم کو کون پسند نہیں کرے گا۔ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں بے ساختگی سے اوپر اٹھا کر پوچھا ۔۔۔۔ "کیا جم خود آپ کو پسند نہیں؟"

"۔۔۔۔ اوہ ۔۔۔۔ لیکن میری بچی جم تو سراسر اپنا اپنا لڑکا ہے ۔۔۔۔" کمرے میں پھر وہی عجیب سا سکوت چھا گیا ۔۔۔۔

"مجھے پتہ چلا ہے کہ میرا لڑکا تم سے شادی کرنے کو بھی تیار ہے۔ جانتی ہو اس کے کیا معنی ہیں اور اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟"

اوہ ۔۔۔۔ او خدا ۔۔۔۔ اب یہ سب کچھ برداشت سے قطعی باہر تھا ۔۔۔۔ روشن ایرانی بجلی کی طرح کشن ایک طرف کو پھینک کر دیوان پر سے کھڑا ہوگیا اور رگ کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا جیسے قیمتی چمکیلے پتھروں میں سجی ہوئی ساڑھے تین سو اونچی اونچی باعزت خواتین چاروں طرف سے رگ پر حملہ کرنے والی تھیں۔ ہولے

زور سے دروازوں کے پٹ بند ہو گئے۔ باہر بارش کے پہلے قطرے کھڑکی کے شیشوں سے ٹکرا رہے تھے۔

—— تم خوبصورت تصویریں بنا کر ان میں رنگ بھر دو اور وہ ہمیشہ ان تصویروں کی اصلیت کا یقین کرتی رہے گی، تمہارا کام صرف یہی ہے کہ اس سے خوشنما خوشگوار ستاروں کی باتیں کرتے رہو۔ اس کی ماں نے اسے بچپن میں بتایا کہ شیطان کی اتنی لمبی دم ہے، اتنے بڑے سرخ کان ہیں۔ ایسے نوکیلے سینگ ہیں۔ وہ بہت ہی برا ہے۔ اور دنیا جب بہت ہی زیادہ بری جگہ بن گئی تو ایک طوفان آیا اور نوح جو ایک بیحد عمدہ انسان تھا اپنے باعزت خاندان سمیت بچ رہا اور پھر ابراہیم اور سلیمان اور داؤد اور موسےٰ اور عیسےٰ جو سب ایک سے ایک اچھے لوگ تھے دنیا کو ٹھیک کرنے کے لئے آئے خود خدا کو زمین پر آ کر جھیل کی سطح پر چلنا پڑا —— وہ ان سب باتوں پر یقین رکھتی ہے بالکل اسی طرح جیسے چھوٹے بچے اپنے نرسری کے قصوں اور پیٹر پین اور اسنو وائٹ کی کہانیوں کو سچ سمجھتے ہیں —— لیکن بچے بڑے ہو جاتے ہیں اور اس کے ہاتھ سے زیتون کی ڈالیاں اور للی کے پھول چھین کر اسے چپکے سے کانٹوں کا تاج پہنا دیا جاتا ہے اور پھر ساری حقیقت معلوم ہو جاتی ہے ——

تم اس سے وعدہ کرتے ہو کہ آج رات کو سارے چاند ستارے توڑ کر اس کے آگے ڈال دو گے لیکن اسی رات کو اولمپس پر رہنے والے خداؤں کی بیویاں اس سے یہ وعدہ بھی چھین لیتی ہیں اور تم ان لوٹتے ہوئے چاند ستاروں کا سامنا نہیں کر سکتے —— روشن بیٹے ذرا اپنے خدا کو آواز دینا ——

اعظم مسعود نے تھک کر پائپ چلا لیا اور وہ سب خاموش ہو گئے۔ وہ مصور تھے، انگریزی کے عمدہ جرنلسٹ تھے، معاشیات اور ادبیات میں ایم، اے کر چکے تھے۔ پولکا اور والز خوب کرتے تھے اور سی آئی کے سوئمنگ ٹینک کے کنارے گھنٹوں پڑے رہا کرتے تھے لیکن میگڈلین اپنا گٹار سنبھال کر کارل کے ساتھ اپنی قسمت آزمائی کرنے کہیں اور کسی دوسرے دیس کو چلی گئی اور وہ اسی طرح دیوان پر پڑے روبین رولینڈ اور شاہ مرالعہ کرتے رہے۔

ان دونوں نے میٹرو میں نیچے اپنی کرسیوں پر بیٹھ کر مرحوم لیزلی ہاورڈ پر افسوس کرنا شروع ہی کیا تھا کہ برابر کی نشست پر سے کسی نے پوچھا "مادام یہ سیٹ ریزرو تو نہیں؟" "جی نہیں" رخشندہ نے ادھر دیکھے بغیر جواب دیا اور پھر برج کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئی —— نووارد نے کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ جلاتے ہوئے پھر پوچھا "مادام دھواں آپ کو ناگوار تو نہیں گذرے گا؟" "جی نہیں" اب کے سگریٹ لائٹر کی روشنی میں رخشندہ نے اس کی طرف نظر کی اور اسے لگا جیسا سارا میٹرو ڈائنامائیٹ سے اڑ کر دور فضاؤں میں لڑھکتا جا رہا ہے۔ برج راج کھڑے ہو کر ڈریس سرکل میں جانے کے لئے شاہندہ اور شیا ملا کا انتظار کرنے لگا —— ری شی رانی جلدی اٹھو۔ مجمع زیادہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ تیزی سے گینگ وے کو پار کر کے زینے پر چڑھنے لگے۔ وہ شخص اپنی نشست پر بیٹھا دوسری طرف دیکھتا رہا۔ فلم شروع ہو چکا تھا۔ پردے پر برٹش موویٹون نیوز کی تصویریں کوندنے لگیں ——

"اوہ برج ما ما جلدی اوپر چڑھئے" رخشندہ کی برفیلی پیشانی پر پانی کے ننھے منے قطرے نجانے کہاں سے آ گئے۔ برج نے اس کا سفید ہاتھ پکڑ کر اسے سب سے اونچی سیڑھی پر کھینچ لیا اور وہ مجمع کے ریلے کے ساتھ ایک جھونک سے اس کے اوپر گر سی گئی۔ وہ اندھیرے میں شیا ملا اور شاہندہ کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ اس نے اپنا ہاتھ آہستہ سے چھڑا لیا۔ OH GOSH

THE GORGEOUS- DELICIOUS THILL OF IT.

وہ دیر تک اتنی سی بات کو سوچتی رہی۔ پھر اس کا جی چاہا کہ ایک زبردست زلزلے میں یہ سارا میٹرو ٹوٹ کر گر جائے اور برج اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر کہیں دور بھاگ جائے —— گرتے پہاڑوں اور ٹوٹتی چٹانوں اور شور مچاتے ہوئے انسانوں سے بچا کر بہت دور —— اور پھر وہ —— وہ دوسرا شخص، وہ مائیکل اینجلو کا شاہکار نیچے بیٹھا تھا —— چند منٹ قبل اس کے بالکل قریب ——

اور پھر دوسری رات کو آتشیں لڑکی نے اسے تاج میں دیکھا اور اس کا جی چاہا کہ ایک تیز آگ میں اسے جلا کر راکھ کر ڈالے، اس کی بکھری ہوئی مسکراہٹ کو، اس کے

www.taemeernews.com

الجھے الجھے بالوں کو ــــ وہ اس صوفے پر بیٹھ آئی تھی اس گیلری میں سے گذری تھی ان کشنوں کو چھو چکی تھی جن پر وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اپنی شامیں گذارتا تھا ــــ جبکہ وہ دوسری برفیلی رخشندہ خاموشی اور سکون سے چھلکتے اور بیورلی نکولس پڑھتی رہی تھی۔" مس ڈی کوڈرا کیسی ہیں؟" اس نے پوچھا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ وہ جا چکی ہے "اچھی ہیں۔ شکریہ" اس نے اسی سکون سے جواب دیا "آپ میرے ساتھ ایک راونڈ لیں گی؟"

"آئیے" اس نے کہا کیونکہ وہ ہمیشہ بہت پریکٹکل رہتی تھی۔ اور جیال کو تعجب ہوا کہ وہ اس آسانی سے اس کے ساتھ فلور پر کیسے آ گئی۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ڈیڑھ سو منٹ کے ساتھ ساتھ آگ کے شعلوں میں گھوم رہا ہے جسے بس دو چھینٹوں کی ضرورت تھی لیکن شعلے بہت اونچے اٹھتے جا رہے تھے۔ رقص ہوتا رہا

کا ایک نغمہ اپنی پوری تیزی سے بج رہا تھا۔ اس کی تھکی ہوئی نظریں خود بخود دیلائی ڈوڈ کی ان دیواروں کی طرف اٹھ گئیں جن کے دروازوں پر گہرے سبز پردے پڑے تھے اور جن کے سامنے فرن کی ڈالیاں برقی پنکھوں کی ہواؤں میں آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔

دنیا کے سارے ریڈیو اسٹیشن آدھی رات کا گجر بجا چکے تھے۔ باغ کی پتیاں اور سمندر کی لہریں خوابستان کے جادو میں ڈوبتی جا رہی تھیں۔ کسی نے بڑی پیاری آواز میں کہا "میں آ سکتا ہوں؟" وہ جو اب تک برآمدے میں آرام کرسی پر لیٹی پوائنٹ کاونٹر پوائنٹ ختم کرنے کی کوشش کر رہی تھی اپنا برف جیسا لباس سمیٹ کر جھٹکے پر بیٹھ گئی "یہ کون ہے؟" اس نے ذرا گھبرا کر برساتی کی طرف دیکھا۔

"اگر آپ کہیں گی تو میں ابھی ابھی فوراً واپس چلا آؤں گا۔" اس کا بات کرنے کا انداز بیحد بیحد دلکش تھا۔ وہ اور زیادہ پریشان ہو گئی ــــ

"ماہم سے باندرہ کا قریب ترین راستہ ــــ"

"نہ نہیں میں راستے کی تلاش میں آپ سے مدد کی درخواست نہیں کر رہا ــــ"

"ــــ تو کیا ــــ کیا آپ کا پٹرول ختم ہو گیا ہے؟"

"جی نہیں میرے پاس ڈھیروں۔ گیلنوں پٹرول موجود ہے"

"پھر ــــ پھر ــــ آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"میں؟ کچھ بھی نہیں ــــ میں سامنے سے گذر رہا تھا آپ کو بادام کی شاخوں میں سے برآمدے میں بیٹھا دیکھا تو بس چلا آیا اندر ــــ جاؤں واپس؟"

"اوہ گوش ــــ آپ نے اتنی دور سے مجھے کیسے دیکھ لیا۔ مشاہدہ بہت تیز ہے"

"جی ہاں مشاہدے کا میں ماہر ہوں۔ بہت عمدہ عادت ہے یہ۔ زندگی بہت دلچسپ ہو جاتی ہے اس سے۔ ایسی ایسی چیزیں نظر آ جاتی ہیں اور اجازت دیجئے کہ انگریزی میں کہوں کہ ہم ایسی چیزوں کی روح میں گھس سکتے ہیں جن کو دیکھنے کی بظاہر کوئی خاص ضرورت نہیں ــــ سگریٹ پی لوں؟ شکریہ ــــ"

"نجانے آپ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ خصوصاً جبکہ آپ مجھے قطعی جانتے بھی نہیں بہت دلچسپ اور عقلمند معلوم ہوتے ہیں آپ ــــ"

"جی ہاں۔ شکریہ۔ غالباً آپ پہلی خوبصورت لڑکی ہیں جس نے ایک خوبصورت لڑکے کے سامنے یہ اقرار کیا ہے ورنہ عموماً مجھے آپ جیسی لڑکیوں سے یہ شکایت رہتی ہے کہ وہ اپنی عقل کے مقابلے میں کسی کو کچھ سمجھتی ہی نہیں"

"بیٹھ جائیے۔ اس آرام کرسی پر ــــ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی ہیں اور اس وقت اس گرم رات میں بادام کی شاخوں کی سرسراہٹ کے نیچے اس طرح باتیں کر رہے ہیں جیسے ہمیشہ سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں ــــ ہیں نا؟"

"جی ہاں ــــ بہت عجیب۔ دنیا میں بہت سی باتیں حد سے زیادہ عجیب ہو جاتی ہیں جن کا بالکل آپ کو احساس نہیں ہوتا ــــ ار ــــ دیکھئے لڑکیوں میں ہیرو ورشپ کا مادّہ ایک بڑی سخت کمزوری ہے ــــ"

"ہیرو ورشپ؟"

"جی ــــ اس وقت آپ مجھے بس چپکے چپکے ایڈمائر

کئے جا رہی ہیں حالانکہ ابھی چند لمحے قبل جب آپ تصور میں ہم کے ساتھ مسوری میں سیب کے درختوں کے نیچے بیٹھی تھیں تو میرے دخل در معقولات پر آپ کو زوروں کا غصہ آگیا تھا۔ ٹھیک ہے نا؟"

"سیب کے درخت؟"

"جی ہاں سیب کے درخت۔"

"مجھے یقین ہے کہ ——"

"جی کہ رات گرم ہے اور چاند کے جادو کا اثر شاید مجھ پر بھی ہو گیا ہے اسی لئے میں اپنے بستر پر آرام کرنے کے بجائے ماہیم کی خاموش سڑکوں پر مارے مارے پھر کر خوبصورت لوگوں کے بنگلوں میں گھس کے ان سے الٹی الٹی باتیں کرنے کا عادی ہو گیا ہوں ——"

"اوہ گوش —— !"

"دیکھئے شاید آپ نے شمال کے برفانی کوہستانوں میں سوئے ہوئے کسی کانونٹ میں اب تک اپنی عمر گذاری ہے کم از کم آپ نے سینٹ زیویرز میں تو کبھی نہیں پڑھا۔"

"آپ نے یہ کیسے اندازہ لگایا؟"

"کیونکہ آپ بات بات پر اوہ گوش کہہ کر خدا کی مدد چاہتی ہیں حالانکہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسی خوشگوار رات میں خدا کو ہماری باتوں پر غور کرنے یا ان میں مداخلت کرنے کی قطعی ضرورت یا فرصت نہیں۔ اور یہ بھی کہ سینٹ زیویرز کی لڑکیاں زیادہ تیز اور صاف گو ہوتی ہیں —— آپ جیسے اسکول میں ہیں نا؟"

وہ اسی طرح سگریٹ کے دھوئیں کے حلقے بنا بنا کر کہتا رہا "دلچسپ خیال ہے۔ سیب کے درختوں کے جھنڈ میں ملکہ پکھراج کے ریکارڈ بج رہے ہوں۔ یا کوئی درگا میں گا رہا ہو —— سکھی موری رُدم جھوم۔ سکھی موری —— تمہیں پسند ہے درگا؟ بہت خوبصورت راگ ہے —— دیوی بھجو درگا بھوانی ——"

"کم از کم مجھے اپنا نام تو بتا دیجئے ——"

"میرا نام —— ؟ برج راج وارشنے —— جمال انور —— روشن ایرانی —— جو چاہو سمجھ لو!! ادھر دیکھو۔ میں تمہارا خواب ہوں۔ اور تم چاندنی اور پھولوں کا گیت۔ پر مجھ میں اور ان لہروں میں جو تمہارے برامدے سے ٹکرا کر واپس چلی جاتی ہیں ایک چھوٹا سا فرق ہے۔ یہ دنیا سے بغاوت کرنا چاہتی ہیں اور کچھ نہیں کر پاتیں میں دنیا سے بغاوت نہیں کرتا لیکن چاندنی رات میں تمہارے بنگلے پر آ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ اور پھر یہ لہریں ساحل کو چھوڑ کر دور سمندر کی گہرائیوں میں جا کر کھو جاتی ہیں۔ سیب کے باغ میں چپکے سے خزاں گھس آتی ہے اور بادام کی کلیاں اور سبز پتے خشک ہو کر پریشان ہو جاتے ہیں اور ملکہ پکھراج کے ریکارڈ اور تان پورے کے تار ٹوٹ جاتے ہیں ایک دن۔ اور آخر میں نیلے پروں والی چڑیاں خزاں زدہ شاخوں پر سے اپنے پر پھیلا کر بہار کے تعاقب میں دور جنوب کے ہرے مرغزاروں کی طرف اُڑ جاتی ہیں —— جب خواب پچھلی رات کی چاندنی کی طرح پھیکے پڑنے لگتے ہیں اس وقت کی بے کیفی اور الجھن کا خیال کرو۔ سچ سچ کی مسرت تم کہیں بھی نہیں پا سکتیں رخشندہ بانو۔ شاید تم سوچ رہی ہو کہ اگر ہمگذ بین تمہیں مل جائے تو تم اپنی برفانی بلندی پر سے اس سے کہو —— کارل برون کے ساتھ کہیں بہت دور چلی جاؤ —— بے حقیقت پرتگالی لڑکی —— اس کا گٹار اور تیز آواز —— یہی تیرا بہترین راستہ ہے۔ برج راج سے تم کہو انکل ٹوبی آپ میری دوست شیالا کے ایک خوبصورت اور ڈیشنگ سے ماموں ہیں جو اپنی سیاہ ڈی کے ڈبلو خوب تیز چلاتے ہیں اور بس۔ آپ بھی تشریف لے جائیے۔ کیونکہ مسوری میں ہنی مون کے لئے سوائے میں ایک پورا سوئیٹ ریزرو کروا لیا گیا ہے جس کے پیچھے کا سیب کے درختوں کا جھنڈ ——"

"اوہ"

"اب تمہیں نیند آ رہی ہے۔ اگر تم مجھے یاد کرو گی کہ تو میں پھر کسی ایسی ہی چاندنی رات میں الہ دین کے دیو کی طرح تمہارے خواب میں آ جاؤں گا۔ شب بخیر رخشندہ سلطانہ"

وہ اطمینان سے جنگلے پر سے کود کر باغ کے اندھیرے میں اتر گیا اور پھر اس کے قدموں کی چاپ سنسان سڑک کی خاموشی میں کھو گئی۔

www.taemeernews.com

Will you kindly keep away.?

اور جم کو جواب تک ... یہ سوچ رہا تھا ـــــ جانے کیا سوچ رہا تھا ایسا معلوم ہوا کہ برف کے سارے پہاڑ اور ساری چٹانیں ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گر پڑی ہیں اور ان کے بوجھ میں دب کر وہ بے تحاشہ خوبصورتی اور نفاست سے سجا ہوا کمرہ نیچے گرتا چلا جا رہا ہے۔

وہ سنگھار میز کے اسٹول پر بیٹھی ایک کتاب کی ورق گردانی کرتی رہی اور وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا ـــــ وہ جو ـــــ وہ جو ـــــ اور خدا ـــــ "یہ مت کہو کریں کر رہی ہوں۔ مجھے تم سے نفرت ہے ـــــ شدید نفرت" ـــــ یا اللہ ـــــ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ اسے ابتک رونا کیوں نہ آیا۔ نہ معلوم اسے کیا ہو گیا تھا ـــــ میری بچاری بچی ـــــ ہنی مون ختم ہوتے ہی میں سائکو انالسٹ سے اس کا علاج کرواؤں گا۔ لیکن وہ خاموش رہا۔

"اچھا کم از کم تم تو سو جاؤ۔ بہت تھک گئی ہوگی ـــــ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا اور وہ مخالفت کے بغیر ضدی بچے کی طرح مسہری پر گر گئی۔ وہ ٹہلتا رہا۔ اس رات اس نے سگرٹوں کا سارا ڈبہ ختم کر دیا تھا۔

تکیوں ... منہ چھپا کر اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اس نے سنا جیسے کہیں بہت دور سے آواز آ رہی تھی۔ جم دریچے میں کھڑا کہہ رہا تھا" اس کا انجام تم نے کیا سوچا ہے؟ (LEGAL SEPARATION ـــــ) اس نے اپنے آپ کو کہتے پایا۔ پھر وہ سو گئی جیسے اس نے دن بھر روتے روتے گذارا تھا ـــــ اور بمباری یا زلزلے سے گری ہوئی عمارت کے ملبے میں سے نکلے ہوئے کسی زخم خوردہ انسان کی طرح وہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا ـــــ بالوں کی ایک لٹ اس کی برف جیسی پیشانی پر آ گری تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ جھک کر اس لٹ کو وہاں سے ہٹا دے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا ـــــ یہ اس کی بیوی تھی۔ رخشندہ ـــــ خدایا! اور وہ خود جم تھا۔ جمال انور اے مائیکل اینجلو کے شاہکار ـــــ او بلند و برتر خدا۔ کیا ہم سب پاگل ہیں۔ خوابگاہ کا ٹیبل لیمپ رخشندہ پر اپنی کرنیں پھینکتا رہا۔ اس نے سبز روشنی جلائے بغیر اپنے آپ کو صوفے پر ڈال دیا۔

پھر وہ چار دوست خاموشی سے زینے پر سے اتر کے اس کار کی سمت بڑھے جو گیٹ وے کے اندھیرے سائے میں کھڑی تھی۔ اس پاگل کر دینے والی موسیقی کی گونج گیلریوں اسٹالوں اور سمندری ہواؤں میں ابتک لرزاں تھی۔

مادام میگڈلین ریوبن جو فٹ لائٹ کی تیز کرنوں میں نہائی ہوئی گا رہی تھی۔ اور کارل ریوبن جو پیانو پر بیٹھا تھا اور ہال جو الٹرا فیشن ایبل لوگوں سے پٹا پڑا تھا ـــــ اور ـــــ انہوں نے سنا کہ کارل ریوبن اور مادام ریوبن اپنے آرکیسٹرا کے ساتھ جہاں جاتے ہیں شہرت اور عزت ان کے قدموں پر جھک جاتی ہے۔ شمال کے سارے بڑے بڑے فیشن ایبل شہروں میں ان کے کونسرٹ ہو چکے ہیں، ریڈیو میں ان کے پروگرام رکھے جاتے ہیں اتحادی فوجوں کو (E NTA TAIN) کرنے کے لئے ان کو خاص طور سے مدعو کیا جاتا ہے۔ مادام ریوبن۔ جو سیاہ یا نقرئی شام کے لباس میں چمکیلے پتھروں سے سجی ہوئی خاموشی سے اپنے جیون ساتھی کے ہاتھ کا سہارا لے کر اسٹیج پر آتی ہے اور پھر ساری دنیا پاگل ہو جاتی ہے اس کے نغموں سے ـــــ اور انہیں تیزاب کی سی تلخی اور تیزی کے ساتھ یاد آیا۔ کارل کہا کرتا تم میرے ساتھ چلو مگ میں تمہیں بلبلوں اور کوئلوں کی ملکہ بنا دوں گا۔ میگڈلین ـــــ میگڈلین ـــــ میری سینوریتا۔ گوا کی کالی راتیں تمہیں پکار کر واپس بلا رہی ہیں۔ ماتوں کو تمہارے بالوں میں پھنسا کے سجا کریں گے اور مہتاب کے مغنی کا گٹار بجتا رہے گا ـــــ تم مگ ـــــ سرخ ہونٹوں والی جو بیتا ـــــ تمہاری نیورلجیا کی شکایت ہمیشہ کے لئے دور ہو جائیگی تم میری آنکھوں سے دیکھو گی میرے کانوں سے سنو گی میرے جادو سے رقص کرو گی اور ساری کائنات مدہوش ہو کر ہمارے ساتھ ناچنے لگے گی۔ بیوقوف لڑکی جو ان چار سر پھرے ہندوستانی لڑکوں کے لئے کرافورڈ مارکیٹ سے مچھلی کے ڈبے خرید کر لاتی ہو اور ان کی چائے کی پیالیاں صاف کرتی ہو۔ رب یہودہ کی قسم اس بھورے بالوں والی بکری میں ذرا بھی عقل نہیں۔

پھر انہوں نے سنا اتحادی فوجوں کو محظوظ کرنے والی ایک پارٹی کے ہمراہ مشرق قریب جاتے ہوئے جہاز پر ایک

حادثے کی وجہ سے مسٹر کارل ریوبن کا انتقال ہوگیا اور خوبصورت اور غمگین مادام ریوبن پارٹی سے علیحدہ ہوکر اپنے وطن واپس چلی گئیں ——

اور ایک نیلگوں صبح گوا کے ایک چھوٹے سے ہرے بھرے قصبے کے پرانے اور بھورے پتھروں والے کیتھڈرل میں جب ماس ختم ہونے کے بعد فادر فرانسیکو نے قربان گاہ کے دریچے کے سامنے کا پردہ برابر کیا تو ان کی پیشانی پر اور بڑی بڑی نیلی آنکھوں میں ایک تلملاتی مسرت اور اطمینان کی روشنی چمک رہی تھی کیونکہ ایک بھٹکی ہوئی روح آخر اپنے چرواہے کے پاس پہنچ چکی تھی —— "خداوند خدا کی رحمت ہو اس پر وہ یسوع کی دلہن بن گئی ——" دعا کے آخری الفاظ بھورے پتھروں والے ہال کے منجمد سناٹے میں ڈوب گئے اور فادر ڈائیگو آرگن بند کرکے سیڑھیوں سے نیچے اتر آئے۔ باہر آسمان کے نیچے بہت سے ٹوٹے ہوئے نیلے پر ہوا میں تیرتے پھر رہے تھے۔

اور ایسی ہی ایک نیلگوں شام کے اندھیرے میں جبکہ ایک گالا نائٹ کے اختتام پر گیٹ وے، برساتی اور گیلریوں میں مجمع کم ہوتا جا رہا تھا، موٹریں اسٹارٹ ہو چکی تھیں اور اکا دکا لوگ سیڑھیوں پر اور سڑک کے کنارے سگرٹ جلاتے اور اپنے دوستوں کو شب بخیر کہنے کے لئے رکے ہوئے تھے۔ ان چار دوستوں نے اپنے پائپوں کی راکھ جھٹکی اور ان کی سرخ کار ڈھلوان پر بہنے لگی رات گرم تھی اور ورسوا اور جوہو کی سایہ دار سڑکیں ان کا انتظار کر رہی تھیں ——

صبح کو افق پر شفق کی سرخی کو توکس نے نہیں دیکھا لیکن عصرِ حاضر کے افق پر دور کے خون کی سرخی دیکھنا ہو تو کامریڈ شاعر مخدوم محی الدین کا

سرخ سویرا

دیکھئے جس کے ہر لفظ میں انقلاب کی خوبھی ہے اور رومان کا پیرتو بھی خوبصورت گرد پوش بہترین طباعت اور کتابت مجلد عہ/

ملنے کا پتہ: نگارستان ایجنسی اردو بازار —— دلی
(جہاں سے ہندوستان کے ہر مطبع کی کتابیں ملتی ہیں)

سیف و سبو

جوش ملیح آبادی نے اپنے کلام کو خود انتخاب [illegible] بقول ان کے

"میں نے اس انتخاب کی خاطر دوبارہ ان شبستانوں کو روشن ان باغوں کو شاداب ان آسمانوں کو پُرسحاب ان زمینوں کو سرسبز ان دریاؤں کو رواں ان امنگوں کو رقصاں، ان تاروں کو لرزیدہ، ان رشتوں کو پیچیدہ، ان جلووں کو غلطاں اور ان رخساروں کو فروزاں کیا جو میری نوجوانی کی محبوب ترین متاع اور میری نوعمری کے ثلج کے ہیرے تھے ایسے ہیرے جن کے ہر گوشے پر صدہا کوہ نور قربان کئے جا سکتے ہیں"

بہترین طباعت و کتابت مجلد قیمت عہ/ علاوہ محصول۔

ملنے کا پتہ

نگارستان ایجنسی اردو بازار —— دلی
(جہاں سارے ہندوستان کی مطبوعات مل سکتی ہیں)

جوش ملیح آبادی کی دیگر تصانیف

عرش و فرش۔	نیا مجموعہ نظم	للعہ/
آیات و نغمات۔	مجموعہ نظم	صہ/
شعلہ و شبنم۔	؍؍ ؍؍	؍؍
نقش و نگار۔	؍؍ ؍؍	سہ/
حرف و حکایت۔	؍؍ ؍؍	للعہ/
فکر و نشاط۔	؍؍ ؍؍	عہ/
روحِ ادب	نظم و نثر	سہ/

نگارستان ایجنسی اردو بازار —— دلی

www.taemeernews.com

وہ رات

حمیدہ سلطانہ

اُف خدا وہ رات! جب کوہ الموڑہ کی ایک خوشنما کوٹھی میں خوابگاہ میں تنہا پڑی ہوئی نیند نہ آنے کے باعث میں کروٹیں بدل رہی تھی اس ویران رات کو سینے ٹوریم کی سفید عمارت چاند کی کرنوں میں لپٹی ہوئی ایسی معلوم ہوا رہی تھی جیسے کفنائی ہوئی میت ہو۔ ہوا کے ہلکے جھونکے خاموش فضا سے اس طرح سرگوشیاں کر رہے تھے جس طرح کسی عزیز ہستی کی دائمی جدائی پر اس کے اقربا دھیمی دھیمی آہیں بھرتے ہیں۔

موت کی سی خاموشی وسعت کائنات پر پھیلی ہوئی تھی دوپہر رات گذر چکنے کے باوجود میری آنکھوں سے نیند ایسی دور تھی جیسے ایک ہجراں نصیب کی آنکھوں سے اس کا محبوب!

اور میرے خیالات شکستہ جہاز کے تختوں کے مانند ہچکولے کھا رہے تھے روح پر اندوہ فزا سکوت طاری تھا ماضی کی یادوں نے مرے گرد تانا بانا سا بن دیا تھا اور اسی جال میں پھنسا ہوا میرا مضطرب دل کسی نو گرفتار قفس پرند کے مانند پھڑپھڑا رہا تھا سینے ٹوریم میں میری پیاری سہیلی اور مشہور جواں سال شاعرہ نوشابہ تین مہینے سے موت و زیست کی کشاکش کے درمیاں پڑی ہچکولے لے رہی تھی ——

سینے ٹوریم کی بھیانک اور اداس فضا میں جہاں کی ہوا دواؤں کی بو سے ہر وقت بوجھل سی رہتی تھی اُس کا دم ضرور گھٹتا تھا لیکن اس کی نازک خیالی اور شاعرانہ طبیعت پر یہ بوجھ اس لئے بار نہ تھا وہ سمجھتی تھی کہ ہر وہ دن جو نیا آتا ہے اُس کی غمگین زندگی کے ختم ہونے کی مبارک خبر لاتا ہے۔ میرے علاوہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ نوشابہ خوش دل و خوشحال نوشابہ اس موذی مرض میں مبتلا کیوں ہو گئی اس کا سبب کیا ہے کسی کو اس کا خیال آتا بھی تو کیسے؟ غم نصیب نوشابہ نے اپنے دلی اندوہ کو ظاہری شگفتگی کے پردے میں اس طرح چھپا رکھا تھا "جس طرح مجروح فاختہ پر سنوار کر اپنے جان لیوا زخم کو چھپا لیتی ہے"۔ اس نے اپنی مایوسیوں اور ناکامیوں کے منہ پر شگفتگی کی ایسی دبیز نقاب ڈالی تھی کہ کوئی اصلیت کو پا ہی نہ سکتا تھا لیکن دل کا زخم بناوٹی خوشی کے مرہم سے نہ بھر سکا اور آخرکار ایک دن سمن زار ادب کی وہ اچھوتی کلی جس کو اپنے شبستان عیش کی زینت بنانے کے طبیعت متمنی نہ تھے بن کھلے ہی مرجھانے لگی وہ نوشابہ جس کی دلکش صورت اور والہانہ نغمے ادبی محفلوں میں جنت نگاہ اور فردوس گوش تھے اب بستر علالت پر پڑی زندگی کے دن تڑپ تڑپ کر گذار رہی تھی۔

میں اس حقیقت کو ہرگز نہ سمجھ سکتی مگر میں اس کے لڑکپن کی ساتھی تھی بالکل اسی طرح جیسے اختر تھا۔ آہ وہ معصوم اور کتنا بے فکری کا زمانہ تھا اکثر تمام تمام دن ہم تینوں کو ساتھ کھیلتے گذرتا تیتریاں پکڑنے میں اختر مشاق تھا لڑکپن سے ہی اس کی فطرت یہ تھی کہ وہ اپنی دلچسپی کی خاطر معصوم ننھی سی جانوں کا خاتمہ کردے ——

"کاش اس حقیقت کو نوشابہ نے سمجھ لیا ہوتا"۔ میں اختر کی ہم سن تھی اور نوشابہ ہم سے کوئی دو سال چھوٹی مگر غضب کی باتون شوخ اور ضدی لڑکی تھی اس کی ضد کا یہ عالم تھا کہ جب مجھ سے اور اختر سے روٹھ جاتی تو جب تک تیتریوں کے سارے اچھے موسکے پر شیشے کی گولیاں اور چاکلٹ کے خالی ڈبے ہم دونوں سے نہ لے لیتی کبھی بھی نہ منتی تھی۔

مجھے تو اکثر اس کی پرواہ نہ ہوتی مگر اختر نوشابہ کے بغیر چند لمحے بھی نہ گذار سکتا تھا اور اس ننھی ضدن سے ایسا ڈرتا تھا گویا وہ کوئی ملکہ ہے۔

باتیں بنانے میں نوشابہ کو کمال حاصل تھا میری امی تو اس کو پیار سے مینا کہا کرتی تھیں اور اس کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ اشعار پڑھنے کے مقابلوں میں ہر مرتبہ مجھ سے اور اختر سے وہ بازی لے جاتی تھی اور ہمیشہ اپنی کلاس میں اول آتی تھی۔ "آہ یہی ذہین لڑکی محبت کی بازی میں ایک شاطر کھلاڑی سے ہار گئی یہاں سب کچھ ——"

ہمارا ساتھ اُس وقت سے ہوا جب نوشابہ پوری صاف بات بھی نہ کرسکتی تھی اور جدا ہوتے وقت وہ ماشاءاللہ سولہ سال کی سمجھدار زیرک حساس دوشیزہ تھی اب وہ بات بات پر روٹھتی اور لڑتی نہ تھی لیکن اس کی معصوم شوخیاں اب بھی جوں کی توں تھی۔

غریب اختر تو ہر وقت ہی اس شرارت کی پتلی کی شرارتوں کا نشانہ بنا رہتا تھا۔

صورت کے لحاظ سے نوشابہ کچھ حسین نہ تھی گندم رنگ موزوں نقشہ والی دبلی پتلی لڑکی تھی لیکن "اس کی آنکھیں" ہاں اُس نے غضب کی دلکش آنکھیں پائی تھیں خمار سے بوجھل ہمیشہ نیم وا گویا ابھی نیند سے بیدار کردی گئی ہوں۔

اور لانبے لانبے ہلال کی طرح خمیدہ ابرو جب کسی چیز کو وہ دیکھتی ہوتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ آنکھیں بند کئے کسی حسین تصور میں ڈوب گئی ہے۔

اس کے چہرے پر ذہانت اس طرح پھیلی رہتی جیسے اس کے اور ہم سنوں کے چہروں پر معصومیت یا شوخی اور لبوں پر ہمیشہ ایک ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ "ایک زندگی کے نقاد کی مسکراہٹ جو دنیا اور دنیا والوں کی روح کی گہرائیوں تک پہنچ کر ان کی حقیقت پہچان گیا ہو۔"

اختر بھی اب ۱۸ سالہ خوش رو متین نوجوان اس کے گورے رنگ پر سبزے کا آغاز بہت بھلا لگتا تھا اور عینک کے شیشوں سے جھانکتی ہوئی ذہین آنکھیں مرعوب کن تھیں۔ اختر و نوشابہ کی محبت نے عمر کے ساتھ ترقی کی تھی۔ آمد شباب نے بھی ان کی پُر خلوص محبت پر سایہ نہ ڈالا تھا نوشابہ کیونکہ لڑکی تھی اور حساس شرمیلی لڑکی اس لئے وہ اب اختر سے رک کر ملتی تھی اس نے اپنی محبت پر شرم وحیا کے پردے ڈال دیئے تھے لیکن اختر کی بے خودانہ وارفتگیاں اس کی ہر ادا سے اس کا اظہار کرتی تھیں۔ کہ نوشابہ کا وہ سچا پرستار ہے کئی اور ہم سنوں میں ان دونوں کی باہمی محبت افسانہ بن کر رہ گئی تھی میری حیثیت ان دونوں کے لئے شفیق و غمگسار دوست کی سی تھی اس لئے جب ابا جان کے انتقال کے بعد مجھے بھائی جان کے ہمراہ ان کی ملازمت پر بمبئی جانا پڑا تو اس المناک جدائی نے ہم سب کو غم سے نڈھال کردیا اور خط وکتابت کے لمبے چوڑے وعدوں کے بعد اختر و نوشابہ نے مجھے الوداع کہا لڑکپن کے ساتھیوں کے چھوٹنے کے باعث مجھے سخت دقت تھی لیکن مجبوری تھی بمبئی آنے کے بعد مجھے برابر اُن کے خط ملتے رہے ان خطوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دونو اب بھی ایک دوسرے پر جان دیتے ہیں اور ان کی بے لوث پُر خلوص باہمی محبت میرے لئے باعث مسرت تھی۔

دو سال بعد نوشابہ نے مجھے لکھا "اختر چاہتے ہیں کہ ہماری منگنی ہوجائے اماں جان اگر وہ خواستگاری کریں گے تو ضرور مان لیں گی لیکن بھلا تم ہی بتاؤ بہن! کہ میں پھر اس آزادی سے ان سے کس طرح خط وکتابت کروں گی ابھی تو گرمیوں میں ایک سال کے لئے اُن کو اپنے آرٹ کی تکمیل کے لئے فرانس جانا ہے۔ میرا کہنا تو وہ نہیں مانتے تم ہی سمجھاؤ۔

میں نے اختر کو ہدایت کی کہ فی الحال وہ خاموش رہے نوشابہ بہرحال اس کی ہی ہے پھر جلدی کیوں کی جائے اور اس نے مرے کہنے پر عمل کیا۔

اختر نازک خیال مصور تھا اور بہترین فن کار اس نو عمری ہی میں اس کی بنائی ہوئی تصاویر ملک بھر کی فنون لطیفہ کی نمائشوں میں انعام حاصل کرچکی تھیں۔ اور اختر و نوشابہ کی اس گہری محبت کا راز ہی شاید ان دونوں کی دماغی ہم آہنگی تھی بعض اوقات ایسا ہوتا کہ نوشابہ جو باوجود الھڑ دوشیزہ ہونے کے لحاظ سے پختہ کار شاعرہ تھی کسی موضوع پر نظم کہتی اور اختر اس نظم کے تخیل کو لے کر تصویر بنا لیتا دونو اوائل عمر ہی سے اپنے فنی کمالات کے لحاظ سے فن کار تسلیم کئے جانے لگے تھے۔

اکثر صاحب ذوق حلقوں کی جانب سے ان دولوں کو ان کی کاوشوں پر خراج تحسین دیا جاتا تھا" یہ دونوں آسمان کمال کے درخشندہ ستارے ایک ساتھ مل کر جگ مگائیں گے تو ایک عالم اُن کی ضوفشانی سے منور ہوجائے گا" یہ خیال ہی مجھے خوشی سے بے خود کردیتا۔

نوشابہ کے لکھنے کے مطابق گرمیوں میں اختر بمبئی آیا اور ہمارے ساتھ دو دن ٹھہر کر فرانس روانہ ہوگیا ان دو دنوں میں بھی اس کا موضوع گفتگو نوشابہ اور اس کے ادبی کارنامے رہے اُس نے

www.taemeernews.com

نوشابہ کی وہ نئی تصویر بھی دکھائی جو فرانس کے سفر میں اس کے ہمراہ جا رہی تھی۔ ان تین سالوں میں نوشابہ کچھ سے کچھ ہوگئی تھی اب اس کے بھرپور جسم میں ایک لوچ بھرا گداز آگیا تھا اور دلربا آنکھوں کی چمک سحر کن ہوگئی تھی بحیثیتِ مجموعی اب اس کی ہستی کشش انگیز تھی اختر کے جانے کے بعد نوشابہ کے خطوط پہلے کی طرح دلچسپ نہیں رہے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے پاس لکھنے کو کچھ نہیں رہا ہمیشہ یہی لکھتی تھی "چند ہفتوں کے لئے تم آجاؤ" الماس! میرا دل نہ جانے کیوں ان دنوں بہت اداس رہتا ہے "۔ اختر کے خط پچھلے چند مہینوں میں تو حسبِ معمول نوشابہ کے ذکر سے بھرے ہوتے تھے لیکن کچھ دن بعد اپنے سیر سپاٹوں کا ذکر لکھنے لگا پھر اس نے ایک خط میں لکھا "یورپین لڑکیاں ہندوستانی لڑکیوں سے بہت زیادہ بہادر باحوصلہ اور محنتی ہوتی ہیں

"ان عورتوں کو اگر آپ کام کرتے دیکھیں تو حیران رہ جائیں بہن!

میں اس کے بس خط کو پاکر کچھ کھٹک گئی خیال ہوا کہیں یہ رنگین طبع نوجوان کسی فرانسیسی حسینہ کے دامِ زلف میں تو نہیں الجھ کر رہ گیا جو باتیں بنا رہا ہے لیکن پھر مجھے اپنی اس بدگمانی پر ندامت ہوئی اختر کی پُرخلوص محبت نوشابہ کے ساتھ اور اس کا والہانہ انداز وارفتگی یاد آگیا۔

انہیں دنوں نوشابہ نے مجھے لکھا الماس یہ خبر یقیناً تمہارے لئے بہت مسرت افزا ہوگی کہ اختر کی بوا جان اور میری اماں جان نے ہم دونوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کرنے کا عہد کر لیا ہے ان کو گفتگو کرتے میں نے سن لیا ہے تم یہ مژدہ اختر کو بھی دیدینا۔

اور میں اب مشرقی اور خاندانی رواج کے مطابق ان کو خط نہ لکھوں گی کیونکہ وہ صرف میرے دوست ہی نہیں منگیتر بھی ہیں ہمارے خاندان میں لڑکیاں منگیتروں کا ذکر سنتی تک نہیں میں بھلا ان کو اب خط کیسے لکھوں ـــــ بے شرم اور شوخ دیدہ سمجھیں گے۔ تم ہی ان کی خیریت لکھدیا کرنا" میں نے جواب دیا چل دیوانی جب بات ابھی ظاہر نہیں ہوئی تو خط لکھنے میں حرج کیا ہے اگر الگ نہیں بھیجتی تو مجھے بھیجدیا کر میں اپنے خط میں رکھدیا کروں گی" مگر وہ شرمیلی لڑکی نہ مانی اور پھر اس نے اختر کو خط نہ لکھا ـــــ

اختر کے خط ان دنوں بہت کم آتے تھے اور آتے بھی تھے تو بہت مختصر اور سیر و تفریح کے تذکرے سے لبریز نوشابہ کا نام بھی ان میں نہ ہوتا تھا میں سمجھی وہ بھی نوشابہ کے مانند منسوب ہونے کے باعث شرمانے لگا ہے۔

اکتوبر کی ایک سہانی شام کو اختر کا تار ملا کہ میں کل بمبئی پہنچ رہا ہوں۔

اس تار کو پاکر میں خوشی سے پھولی نہ سمائی میری نوشابہ کا محبوب اور منگیتر اور میرا لڑکپن کا ساتھی آرہا تھا۔ میرا دل خوشی سے وجد کر رہا تھا خیر مقدم کی پرزور تیاریاں کیں رات بھر خوشی کے مارے سو بھی نہ سکی اور علی الصبح بھائی جان کے ہمراہ بندرگاہ پر چل دی۔

جہاز سے کشتی پر میں نے اس کو اترتے دیکھا اور پھر اس نے ہاتھ کا سہارا دیکر ایک نازک اندام حسینہ کو اتارا میرا دل اس کے ساتھ اس کافر ادا کو دیکھ کر دھڑکا لیکن پھر میں نے خیال کیا یہ اس کے کسی جاننے والے کی بیوی یا بہن ہوگی مگر آہ میرا گمان صحیح تھا چند لمحے بعد وہ میرے قریب کھڑا اپنی بیوی کا تعارف مجھ سے کرا رہا تھا۔ "دیکھو پیاری ایلسی یہ میری عزیز بہن الماس! جو سگے بھائیوں کی طرح مجھے عزیز رکھتی ہیں اور الماس بہن یہ میری پیاری بیوی ایلسی"۔ میرا سر چکرا گیا یارب یہ وہی اختر تھا جو نوشابہ کے نام پر جان دیتا تھا اب کس انداز فخر سے ایک اور پری جمال حسینہ کو پہلو میں لئے کھڑا تھا بمشکل خود کو سنبھال کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پھولوں کے وہ ہار جو میں اختر کے لئے لائی تھی اس کی بیوی کے گلے میں ڈالدیئے اور کہا۔

"ماشاءاللہ تمہاری ایلس تو تمہارے حسن نظر کا زریں شاہکار ہیں اختر خدا نظر بد سے بچائے" میرے اس جملے نے جس میں ہلکی سی طنز پوشیدہ تھی اختر کو نادم کر دیا لیکن وہ جلد ہی سنبھل گیا اور ہم سب گھر کی جانب روانہ ہوئے راستے میں کسی نے کوئی بات نہ کی اختر اب میری ملامت آمیز نظروں کے سامنے خاموش سرنگوں تھا اور ایلس ہندوستانی چہروں کو دیکھنے میں معروف اور میں خیالات کے طوفان کو سینے میں دبانے کی کوشش

کررہی تھی گھر پہنچ کر کھانے کے بعد جب ایلس آرام کرنے کمرے میں چلی گئی اور ملاقاتی رخصت ہوئے تو میں نے اختر سے کہا یہ تم نے کیا کیا اختر اُف تم کیسے سنگدل نکلے اب نوشابہ کا کیا حشر ہوگا۔

میں بہت شرمندہ ہوں اور نوشابہ کا گناہگار لیکن مجبوری سے حالات ہی کچھ ایسے پیش آگئے تھے کہ میں نے شادی کی۔ اختر نے سرد آہ لے کر کہا۔

مگر اس کی اس سرد آہ کا مجھ پر مطلق اثر نہ ہوا۔ مکار انسان! ایک معصوم لڑکی کی زندگی فریب محبت دے کر اس نے تباہ کردی اور خود دوسری لڑکی سے شادی کرلی"۔ میں نے جل کر کہا اگر تجھ کو ایک غیر ملکی جنس سے شادی کرنی تھی تو محبت کا ڈھونگ کیوں رچایا تھا میری بھولی نوشابہ کے دل سے کیوں کھیلتے رہے۔

کون کم بخت کھیلتا رہا مجھ بدنصیب نے کب کسی اور سے محبت کی آپ کو تو ان حالات میں مجھ سے " ہمدردی کرنی چاہیئے" مجھے حالات کے زیر اثر مجبور ہو جانا پڑا۔ لیکن نوشابہ میرے دل کی ملکہ ہیں اور رہیں گی، ایلس صرف میری بیوی ہے میں نے اس سے کبھی محبت نہیں کی نہ کرسکتا ہوں میرے اس کے تعلقات محض مادی ہیں اور میرے دل پر نوشابہ کا قبضہ ہے وہ میری محبوبہ ہیں شاید شادی کرکے میں ان کا اتنا احترام نہ کرسکتا ان کو اتنی محبت نہ دے سکتا جتنی کہ اب میرے دل میں ہے میں ان کی پرستش کرتا ہوں وہ میرے من مندر کی دیوی ہیں اور میں پجاری۔

میں اس سنگدل بے حس انسان سے زیادہ گفتگو کرنی فضول سمجھی اور اس کو بیٹھا چھوڑ کر کھڑی ہوگئی "آہ یہ جفاکار مرد ہم غریب لڑکیوں کو مٹی کا بے حقیقت کھلونا سمجھتے ہیں، جاہا جب تک کھیلتے رہے جاہا جب توڑ دیا نہ ان کے پاس حساس دل ہے نہ پاکیزہ جذبات"۔

یہ وہی اختر تھا جو نوشابہ کی ذراسی علالت سے بیقرار ہو جاتا تھا اس کے روٹھ جانے کے خیال ہی سے سہم جاتا تھا اور اب اس دیدہ دلیری سے اس کی محبت جتا کر ایک اور کا فرادا حسینہ کا شوہر بن کر باتیں بنا رہا تھا اور محبت کے فلسفے پر الٹی سیدھی لے دے رہا تھا وہ اب بھی یہ نہ چاہتا تھا کہ نوشابہ اس کے دام محبت سے نکل جائے مجھے سخت غصہ آرہا تھا اس لئے شام کی چائے پر کمرے سے میں نہ نکلی دردِ سر کا بہانہ کئے پڑی رہی۔

نوشابہ کی معصوم محبت کا یہ تباہ کن انجام دیکھ کر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا تھا اور اس کی بے بسی پر میں نے آنسو بہا بہا کر تکیہ بھگو دیا تھا۔

آخر کئی گھنٹے خیالوں میں غرق رہنے کے بعد مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اس مشکل کے وقت میں میرا اس کے پاس ہونا ضروری ہے ایسا نہ ہو شدت غم میں اور خرمنِ عیش پر ایک دم یہ نامرادی کی بجلی گرنے سے میری پیاری سہیلی کی جان پر بن جائے یا وہ حواس کھو بیٹھے صورت حالات امی اور بھائی جان کو سمجھا کر میں اپنی آنا کے ہمراہ دوسرے روز صبح میں لکھنؤ روانہ ہوگئی۔ اختر رات کو ہی جاچکا تھا چونکہ اسے دو تین روز دہلی اپنی بڑی بہن کے پاس ٹھہرنا تھا اس لئے مجھے اطمینان تھا کہ نوشابہ کو پہلے پہنچ کر میں سنبھال لوں گی میری غیر متوقع ملاقات پر نوشابہ بہت خوش ہوئی اور میرے گلے سے چمٹ کر اس نے اس اچانک ملاپ پر خوشی کے آنسو بہائے اور میں نے اُس بدنصیب کی بربادی پر غم کے۔ اختر کی آمد کی اطلاع اس کو مل چکی تھی اس لئے جب ہم دونوں کمرے میں تنہا رہ گئیں تو اس نے دبے ہوئے لہجے میں سوال کیا وہ دہلی تو پہنچ گئے ہوں گے اور شرم و خوشی کے ملے جلے جذبے کی سرخی نے اس کے رخساروں کو دلفریب کردیا۔

ہاں شاید میں نے لاپروائی سے جواب دیا اور بے ساختہ میرے لبوں پر سرد آہ آگئی۔ میرے اس انداز نے اسے چونکا دیا اور گھبرا کر بولی خیر تو ہے الماس: تم اتنی پریشان کیوں ہو اختر اچھے تو ہیں؟

ہاں ہاں بہت اچھے بہت خوش میں نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا اختر اور بیگم اختر بھی۔

بیگم اختر' اس نے تعجب بھرے لہجے میں۔ مضطرب ہو کر کہا کیا کہہ رہی ہو؟ الماس!

میری نوشابہ جفاکار اختر تجھ جیسی معصوم لڑکی کی پاکیزہ محبت کے لائق نہ تھا اس کو بھول جا وہ تو اس فرانسیسی چڑیا کے قابل تھا وہ اس کو مل گئی میں نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار بھرے

لہجے میں کہا میرے اس جملے نے نوشابہ کو سپید کر دیا وہ سنگ مرمر کے بت کے مانند بے حس و حرکت بیٹھی رہی نہ اس کی آنکھ میں آنسو تھا نہ لب پر آہ بہت دیر بعد اُس نے میری جانب نظریں اٹھائیں۔

"اُف کتنی بھیانک اور ویران آنکھیں معلوم ہو رہی تھیں اُسکی ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ میری جانب نہیں دیکھ رہی بلکہ دور خلا میں کچھ تلاش کر رہی ہے"

اچھا ہی ہوا کہ اختر نے شادی کر لی وہ بہت خوبصورت ہو گی اس طرح اس نے کہا گویا وہ مجھ سے مخاطب نہیں ہے اپنے کو آپ سمجھا رہی ہے۔

میں سمجھی کثرتِ الم سے اس کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے لیکن اس کے بعد نوشابہ کے معمولات میں فرق نہ تھا وہ پہلے کی طرح باتیں بھی کرتی تھی اور ہنستی بھی تھی لیکن اس کی ہر حرکت سے یہ واضح ہوتا تھا کہ وہ یہ سب کچھ عادتاً کر رہی ہے اس کا اصلی وجود اپنے جسم سے دور خدا جانے کہاں رہتا تھا۔

ہر وقت کچھ کھوئی کھوئی سی رہتی نیم مدہوشی سی اس کے گندمی رنگ سے اب سرخی کی جھلک معدوم ہو چکی تھی اور ذہین چہرے پر اداسی کا ہلکا سا بخار چھا گیا تھا۔ موٹی تو وہ کبھی بھی نہ تھی لیکن دل کے غم نے چند ہفتوں میں ہی اُس کو اتنا ناتواں کر دیا تھا کہ جب وہ چلتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے بلکہ شاخ سے پھول ٹوٹ کر گر رہے ہیں۔

اختر آیا بھی اور بالکل معمول کے مطابق ملتا رہا نوشابہ کے سامنے پھر وہی اختر معلوم ہوتا جیسا کہ شادی سے قبل تھا اس کی رفتار و گفتار میں وہی بچوں جیسی بے ساختگی تھی اور نوشابہ کے ساتھ وہی صبر و روا الہانہ انداز محبت میں اس شخص کی دوہری زندگی سے حیران بھی تھی اور متنفر بھی لیکن نوشابہ فریب خوردہ محبت نوشابہ اب بھی یہی سمجھتی تھی کہ اختر اب بھی اسی کا ہے" آہ اندھی محبت تیری فریب کاریاں"

اختر کو وہ شادی کے معاملے میں بے قصور سمجھتی تھی بھولی ناتجربہ کار لڑکی مجھے حیرت تھی کہ اس ذہین لڑکی کی غیر معمولی ذہانت اپنے معاملے میں کیوں اتنی کند ہو گئی تھی جو اور لوگوں کے معاملات سلجھانے میں کمال رکھتی تھی اس سے کئی مرتبہ اس بات پہ الجھ پڑی اس کو سمجھایا کہ وہ بھی اس بے وفا انسان کو چھوڑ دے اور اپنے کسی اور قدردان سے شادی کر کے اپنی زندگی کو کامران بنائے لیکن ہر بار اس نے مسکرا کر یہی جواب دیا تم سچ کہتی ہو الماس! میں سب کچھ جانتی ہوں محسوس کرتی ہوں لیکن میرا دل میرا نہیں اختر کا ہے من کے سنگھاسن پر اس بے وفا کی تصویر رکھی ہے اس کو کیسے اٹھا دوں اختر یہاں تنہا آیا تھا لیکن اُس نے اصرار کر کے ایلس کو بھی بلایا اور ایک دو دن نہیں پورے پندرہ دن مہمان رکھا اور اس طرح اس کی تواضع میں مصروف رہی گویا وہ بہت عزیز و معزز مہمان ہے۔

میں دو مہینے اس کے پاس رہ کر اس کی غمگین و ناکام زندگی پر افسوس کرتی ہوئی واپس ہوئی اس کے خطاب بھی ملتے رہتے تھے لیکن یہ اب بجائے اختر کے ذکر کے ادبی مشاغل کے تذکروں سے لبریز ہوتے تھے میں بھی اب بھول کر بھی اختر کا ذکر نہ لکھتی تاکہ اس کو اپنی پامال حسرتوں کی داستان یاد نہ آ جائے اس طرح دو تین سال گذر گئے۔ اچانک مجھے اطلاع ملی کہ وہ دق کے نامراد مرض میں مبتلا ہو گئی ہے اور المورڈہ سینے ٹوریم میں ہے اس روح فرسا خبر کو سن کر میں رہ نہ سکی اور فوراً المورڈہ چلی آئی۔

ماضی کے واقعات پر اب غور کرنے کا وقت نہیں رہا تھا مشرق سے سپیدۂ سحری نمودار ہو چلا تھا اور صبح کی نماز کا وقت تھا اس لئے میں بھی کلمہ پڑھ کر اٹھ بیٹھی اور نماز کے بعد چند گلاب کے شگفتہ پھول اور چنبیلی کے پھولوں کے گچھے ہاتھ میں لئے ہوئے سینے ٹوریم میں پہنچی۔ نوشابہ مومی مورت کے مانند بے حس و حرکت بستر پہ پڑی تھی اور ڈاکٹر جھکا ہوا اس کے دل کا معائنہ کر رہا تھا۔ بہت دیر کے بعد اس نے سر اٹھایا اور افسوسناک لہجے میں دھیمی آواز سے کہا۔

خاتون۔ آپ کی پیاری سہیلی اب اس دنیا میں کچھ دیر کی مہمان ہے کاش یہ نوجوان شاعرہ جاں بر ہو سکتی۔

کچھ تدبیر کرو ڈاکٹر! میں نے گھبرا کر کہا۔

میں کیا اب کوئی ڈاکٹر بھی مریضہ کو موت کے منہ سے نہیں چھڑا سکتا اس پر عالم نزع طاری ہو چکا ہے خدا آپ کو اور بوڑھی ماں کو اس غم ناک حادثے پر برداشت کی طاقت عطا

www.taemeernews.com

فرمائے ڈاکٹر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور رخصت ہوا میں نے نرس کو خالہ امی کو بلانے کے لئے بھیجا اور خود نوشابہ کے قریب بیٹھ کر اس کے زرد سرد ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر گرم کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

آنکھیں کھولو نوشابہ دیکھو آج کی صبح کتنی حسین اور روشن ہے بالکل تمہاری نظموں کی طرح آج تمہاری سالگرہ کا دن ہے نا پیاری!

اس نے آنکھیں کھول دیں "آہ وہ خوبصورت آنکھیں جو اپنی سحر کار جنبشوں سے دلوں کو مسحور کر لیتی تھی اب بے رونق ہو چکی تھیں" سالگرہ کا دن یا دنیا سے رخصت ہونے کا دن امی کہاں ہیں الماس؟ اس نے یاس بھرے لہجے میں کہا۔

ایسی باتیں نہ کرو گڑیا ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی خالہ امی آ رہی ہیں میں نے نرگس کو بھیجا ہے میں نے دل کو سنبھال کر کہا اس نے نقاہت سے ہوں کی اور آنکھیں بند کر لیں۔

خالہ امی بیچاری خوش خوش داخل ہوئیں ان کو کیا خبر تھی کہ ان کی لاڈلی بیٹی کی یہ سالگرہ کا دن نہیں دنیا سے وداع ہونیکا دن ہے۔

میری جان رات تو تم آرام سے سوتی رہیں طبیعت بحال ہو گی نرس کہتی تھی بخار بھی دو دن سے نہیں ہوا اب صرف کمزوری ہے انشاءاللہ جلدی دور ہو جائے گی خدا وہ دن لائے کہ ہنسی خوشی تم کو لیکر گھر جاؤں۔ انہوں نے اس کی پیشانی چوم کر کہا۔

نوشابہ ماں کو مغموم نظروں سے دیکھتے ہوئے صرف اتنا کہہ سکی امی میری پیاری امی اور پھر اس نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں۔

میں بھی بوڑھی بدنصیب خاتون کو نہ بتا سکی کہ اس کی پیاری بیٹی پر عالم نزع طاری ہو چکا ہے اور آنکھوں میں آتے ہوئے آنسوؤں کو جذب کرنے کی خاطر صبح کی ڈاک دیکھنے لگی۔ اس میں اختر کا بھی خط تھا۔ خالہ امی اب نوشابہ کا سالگرہ کا لباس لینے کے لئے جا چکی تھیں میں نے قریب بیٹھ کر اس کو اختر کا خط سنایا۔ لکھا تھا۔

الماس بہن!

میری نوشابہ کی علالت میرے لئے کتنی باعث تکلیف ہے اس سے سمجھ لو کہ میری رات کی نیند باقی رہی ہے نہ دن کی بھوک کاش اس کا یقین آپ کو ہو جائے خیال تھا بجائے خط کے خود پہنچ جاؤں گا لیکن میرا جانا نہ ہو سکا۔ قدرت بھی کتنی ظالم ہے۔ چھوٹے بچے کو نمونیہ ہو گیا تین دن اس کی حالت بہت خراب رہی ایسی حالت میں اس کو چھوڑ کر نہ جا سکتا تھا۔ اس پریشانی میں کئی دن خط بھی نہ لکھ سکا آج اس کی حالت سنبھلی ہے دو تین روز میں یقین ہے ٹھیک ہو جائے گا اور پھر میں اپنی نوشابہ کے پاس ہوں گا میرا جسم یہاں ہے لیکن روح تو اب بھی ان کے ہی گرد ہے

"اپنی نوشابہ کا اختر"

یہ خط سن کر نوشابہ کے مرجھائے ہوئے لبوں پر ہلکی سی ہنسی پھیل گئی اور اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ الماس! اختر سے کہدینا میری زندگی کو تم فریب محبت دے سکتے تھے۔ میری زیست تمہارا انتظار کر سکتی تھی مسلسل فریب کھا سکتی تھی میری موت تمہارا فریب نہیں کھا سکتی میں مجبور ہوں اختر کہ اب اور تمہارا انتظار نہیں کر سکتی اور پھر ایک سسکی لے کر وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔

"آہ اب نوشابہ کا نحیف و زار جسم میرے سامنے پڑا تھا۔ اور اس کی پاکیزہ و غمگین روح عالم بالا کو سدھار چکی تھی خالہ امی مکلف لباس لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں اور میں نے عنابی رنگ کی قیمتی جارجٹ کا دوپٹہ جس پر لکھنؤ کی کامدانی ستاروں کے مانند جھلملا رہی تھی ان کے ہاتھ سے لے کر اس فریب خوردۂ محبت کے جسم پر ڈال دیا۔

چرکے۔ ہاجرہ مسرور کے افسانوں کا مجموعہ۔
قیمت دو روپے چار آنے۔
کھیل۔ خدیجہ مستور کے افسانوں کا مجموعہ۔
قیمت دو روپے۔
صدائے جرس۔ مسز عبدالقادر کے افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت دو روپے
نگارستان ایجنسی اردو بازار دلی

www.taemeernews.com

دھندلکا

اور یہ میری پہلی کہانی تھی ——

"کونسی بڑی بات ہے، میں بھی کہانی لکھ سکتا ہوں۔ ایک چھوٹے سے موضوع کو دو تین سوشل، اقتصادی اور سیاسی پس منظر دیکر مختلف خوبصورت جملوں میں ڈھال لینا اتنی دشوار بات تو نہیں" میں یہ سوچ رہا تھا اور ہزاروں pose کے ساتھ کیپسٹن۔ پارکر اور Crown Bond پر بجلی کے ہرے ماحول میں خود کو ایک آئیڈیل افسانہ نگار ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کرشن چندر کا کشمیری ماحول اچھا رہے گا۔ نہیں، حجاب کا دھندلا پس منظر۔ یہ بات غلط ہے، کیوں نہ کسی نوجوان خاتون کے طرزِ نگارش کے پرخچے اڑاؤں —— میں تھوڑی دیر کے لئے قرۃ العین حیدر کے افسانوی انقلاب کے طوفان میں کھو گیا اور ایسا معلوم ہوا کہ کسی مغربی ساز کی ہلکی ہلکی پھوار میں مجھے افسانے کے بجائے نظم کہنے کے لئے مجبور کر رہی ہیں اور میں اس وقت چاہتا بھی یہی تھا۔ منٹو، عصمت یا بیدی کے کھردرے پتھروں سے ٹکرانا میرے بس میں نہیں تھا۔ حالانکہ میں اس سے مختلف دوسرے Mood میں پتھر تو کیا چٹانوں سے بھی ٹکرا سکتا تھا۔

میں نے منظر تبدیل کرنے کے لئے کمرے کی دونوں مغربی کھڑکیاں کھولدیں۔ گومتی حسب معمول خراماں تھی۔ یہ اسی طرح شاہان اودھ کے زمانے میں بھی خراماں رہی ہوگی۔ اور شاید آج سے زیادہ جوان کے ساتھ۔ مجھے نہ جانے کیوں اس کے ساحلی مناظر اداس نظر آئے حالانکہ مجاز نے کہا "کم بخت کسی الھڑ دوشیزہ کی طرح چل رہی ہے" "جیسے چلنا بھی نہ آتا ہو" میں نے ایک بے ربط سی بات کہدی۔ اب مجاز کا یہ کمزور چہرہ میرے [illegible] گزار رہا تھا۔ یہ حضرت جب میں کھڑکی کھولنے کے لئے اٹھا تھا انہیں سے سیماب وار میرے کمرے میں مچل پڑے تھے۔

"کنیز آج لاہور گئی" مجاز نے منہ بنا کر کہا۔

"اور دکن کی حسینہ؟" میں نے مجاز کی نگاہوں سے بچتے ہوئے پوچھا۔ مجاز اگر متواتر میری طرف دیکھتے رہیں تو میں کانپ اٹھتا ہوں ان

سلام مچھلی شہری

آنکھوں میں ایسے پیمانے چھلکنے لگتے ہیں جن میں ہزاروں قسم کی شراب بھری ہو اور جنہوں نے یہ قسم کھائی ہو کہ ہم کبھی نہ ختم ہوں گے۔ کچھ اور نگاہیں بھی ہیں جن سے میں کانپ اٹھتا ہوں۔ یہ کانپنا۔ مڑ جانا اور بالکل خاموش ہو رہنا میری فطرت ہو کے رہ گئی ہے۔ لوگ اسے احساس کمتری کہتے ہیں اور میں —— کوئی میری ہی طرح ملے تو بتاؤں۔

"میں تمام ہندوستان میں یہ خبر پھیلا دوں گا کہ اب سلام سے مایوس ہو جاؤ۔ کم بخت نے زندگی میں پہلی بار عشق کیا ہے" مجاز نے اپنی روسی Slijle کی ٹوپی میز پر رکھتے ہوئے حسب عادت مجھے چڑانے کے لئے کہا۔

اور میں کنیز سے کہدوں گا کہ یہ مجاز کا تیسرا عشق ہے" میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"آج شام کو محمود آباد ہاسٹل چلوگے؟" میرے دوست نے گفتگو کا موضوع بدلا۔

"طالب علموں سے گھل مل جانے کی سزا میں کئی بار پا چکا ہوں" میں نے اگلے سال کا ایک واقعہ یاد کرتے ہوئے کہا جبکہ ایک دوست قسم کے طالب علم نے "سلو آگیا" کہکر بڑی شفقت سے میرے سر پر چپت رسید کردی تھی حالانکہ میں یونین میں بڑی تمکنت کے ساتھ داخل ہونا چاہتا تھا۔

"تم میں اور ایک طالب علم میں فرق ہی کیا ہے" سردری تو صرف تمہاری طفلانہ اداؤں پر مرتی ہے" آہنگ" کے مصنف نے مجھے (ENCOURAGE) کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو چلوں گا" میں نے چھپائی ہوئی بات کہدی

"راستے میں کبوتر کا یار بھی ملے گا" تیار ہو کر چلیں گے" آخر وہاں Genius ثابت کرنا پڑے گا۔ تم دیکھنا، دو ہی تین جملوں میں کیلاش اور آئی۔ ٹی" دونوں ہاسٹل ناچنے لگیں گے" مجاز نے اپنی نیم گلفتہ آواز میں جلدی جلدی کہا اور چلدیے۔

میں بری طرح (CONFUSED) ہو رہا تھا۔ نیچے گلاس میں شراب ناچ رہی تھی اوپر اوپر بجلی کا پنکھا اور بغل میں "آہنگ" کی نظمیں! باوجود اس حسین ماحول کے میرا دم گھٹا جاتا تھا۔

"تم شراب کیوں نہیں پیتے"؟

"میں مجاز کبھی نہیں ہو جاتا!"

"تم محبت کیوں کرتے ہو؟"

"میں محبت نہیں کرتا!"

"اور سروری —؟"

"اور" رابعہ سلام "—؟"

"صفیہ معین الدین اور فیروز جبیں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے —؟"

"پھر بتاؤں گا۔ فی الحال تو اپنی بیوی کو سوچ رہا ہوں —!"

"بڑے حساس ہو لیکن بغیر شراب کے تم اتنے شگفتہ کیوں ہو۔ تمہاری نظموں کی تازگی اور مہک —" مجاز نے شاید میرے لہجے کی افسردگی محسوس کر لی۔

"کم سنی میں بغیر مرضی کے شادی بھی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے — بے چارہ غریب مڈل کلاس" میرے دوست نے آنسوؤں کو شراب بنانا چاہا۔

"یہ ایک سماجی مسئلہ ہے۔ تم اپنی کوئی پرانی نظم سناؤ — معاف کرنا، نئی اس لئے نہیں کہہ رہا ہوں کہ تم شاعر کی حیثیت سے مجھے دو تین سال پہلے بہت اچھے معلوم ہوتے تھے — ہاں تو سناؤ" میں نے گفتگو کا رخ ظالمانہ طور پر بدل دیا۔ ایسے موقعوں پر مجھے مجاز۔ جمیل بھائی۔ جعفری۔ بنے بھائی۔ سبط۔ شگفتلا۔ مایا۔ رشیدہ آپا۔ ناگر۔ جمال بھائی۔ محمود بھائی اور بھی ہم عمر اور بڑے دوستوں نے ہمیشہ معاف کر دیا ہے اور اس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں۔

"رخصت اے ہم سفرو! شہر نگار آ ہی گیا"

"نہیں" "اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب"

"وہ نظم تو نہ سناؤں گا"

"یہ نظم تو نہ سنوں گا"

"تو تم سناؤ — چنبیل کا سانپ!"

"— اور چنبیل کا یہ زہریلا سانپ"

شیخ کو ڈس کے سویرے ہی سے چلاتا ہے۔

جنگ۔ موت۔

اور گناہ —!"

کھدر کے سیاہ فام انسان نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے سلام کیا اور ہم دونوں چل پڑے

ظفر صاحب نے چائے کے آخری دور سے ممنون کیا اور شاعروں کی یہ نشست ختم ہو گئی۔ مجاز کا خیال غلط تھا "کیلاش اور "آئی۔ٹی" دونوں ہاسٹل بت کی طرح خاموش تھے — ہاں بنگلے پر واپس آتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ گومتی ناچ رہی تھی۔

یہ بنگلہ میرا اپنا نہیں تھا۔ بلکہ میں ان دنوں "انور" اور "شمیم" کے مصنف کا مہمان تھا فیاض صاحب میری طالب علمی کے زمانے سے مجھ پر بڑے مہربان ہیں۔ اب فیض آباد سے یہاں پریکٹس کے لئے آ گئے ہیں اور یونیورسٹی یونین کی دوسری طرف ایک راجہ صاحب کی کوٹھی میں مقیم ہیں۔ یہ علیگیرین ناول نگار ایک ہی وقت میں میرا دوست بھی ہے اور بزرگ بھی —

یہ دونوں کھڑکیاں جن کا رخ گومتی کی طرف ہے اب تک کھلی تھیں میں نے ساحلی مناظر کی طرف نظر ڈالی۔ اداسی رنگ بھر رہی تھی۔ میں نے اپنی میز کا گلدان دیکھا، گلاب مسکرا رہے تھے۔ میں نے اپنے پارکر کو چوم لیا۔ اب وہ Crown Bond پر بڑے ناز سے خراماں تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ کچھ دیر پہلے "کیلاش" اور "آئی۔ٹی" دونوں بت کی طرح خاموش تھے اور مجاز کا خیال سراسر غلط تھا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجاز کا خیال ٹھیک تھا "کیلاش" ناچا اور خوب ناچا مگر میرے علاوہ کوئی دوسرا یہ رقص نہ دیکھ سکا — یہ دونوں بت کی طرح خاموش تھے مجاز نے تو یہی سمجھا اور سب نے یہی سمجھا۔

"— میں نے عرصہ ہوا سوچنا ترک کر دیا تھا لیکن آپ کی نظموں نے سوچنے پر پھر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن اس سوچ کا نتیجہ — وہی دھندلکا!"

کیلاش کے بت کا یہ جملہ میرے خیالات پر چھا رہا تھا — چھا رہا تھا۔ گومتی کے ساحلی مناظر ناچ رہے تھے — ناچ رہے تھے اور دھندلکا افق کو گھیر رہا تھا — گھیر رہا تھا — سورج

معلوم ہوتا تھا اب اپنے سسر کے دوپٹے میں گھس رہا
کر چھپائے ہوئے صحن کی کچی منڈیر سے جھانک رہی ہیں۔
"شاعر کیا سوچ رہا ہے"! مجاز پھر پریشان کرنے کے

سے آگئے۔
"اپنی پہلی کہانی!" میں بول اٹھا اور پھر مجاز نے مجھے لپٹا لیا
وہ انتہائی محبت کے اظہار کے لئے بس مجھے لپٹا لیتے ہیں —

رُوس کی تقلید کے بجائے

آغا سرخوش قزلباش

اسیرانِ قفس، اے ہندیو، اے گلستاں والو — مبارک روس کی تقلید ہو ہندوستاں والو
وہاں کا رنگ بھرتے ہو تم اپنی زندگانی میں — جہاں پر فرق ہی باقی نہیں ہے آگ پانی میں!
وہاں مفلس کے ماتھے پر ہے کج تاجِ شہنشاہی — یہاں چیتھڑوں سے بھی اب جسم ڈھک سکتا نہیں اہی
وہاں علم و عمل نے ظلمتوں کو روند ڈالا ہے — یہاں پر جہل کے مارے ہوؤں کا بول بالا ہے
وہاں پر خاک کے ذرّوں میں ہیں انوارِ آزادی — یہاں ہر رنگ نالہ کش ہے ہر منظر ہے فریادی
وہاں تحریر پر تقریر پر آزادیاں قرباں — یہاں ہونٹوں پہ مہریں ہیں یہاں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں
وہاں رندوں کی دنیا ہے جواںی کی نمائش ہے — یہاں مُردوں کی بستی ہے اجل سے ساز و سازش ہے
وہاں غیرت کی سرحد پر ڈٹے تیغ و کفن والے — یہاں پر خواب کے محلوں میں رہتے ہیں وطن والے
ابھی ہے وقت ہم طوفاں کے رخ کو موڑ سکتے ہیں — ابھی ہم وقت کے دھارے پہ خود کو چھوڑ سکتے ہیں
ابھی آنکھوں میں گرمی ہے ابھی نبضوں میں دھڑکن ہے — ابھی اِن مضمحل جسموں میں لرزاں روحِ آہن ہے
ابھی غیرت کے ریزوں کو اٹھا سکتے ہیں چُن چُن کر — ابھی تیور بدل جاتے ہیں تیکھی بات کو سن کر
یہ ایں تذلیل و مجبوری روایت مٹ نہیں سکتی — ابھی ہندوستانی کی حقیقت مٹ نہیں سکتی
وہ ہندی جن سے طوفانِ حوادث بچ کے چلتے ہیں — وہ ہندی سورما جو تیغ کے سائے میں پلتے ہیں
وہ ہندی جن کے دم سے نامِ ہندوستان روشن ہے — وہ ہندی جن سے اب تک شمعِ انگلستان روشن ہے
وہ ہندی جن کا ثانی اب جہاں بھر میں نہیں ملتا — وہ ہندی جو پہاڑوں کی طرح جم کر نہیں ہلتا
وہ ہندی جن کی ہیبت سے ابھی لرزش ہے دنیا میں — وہ ہندی جن کے تیور نقش زن ہیں سنگِ خارا میں
وہ ہندی جن کے آگے خم جبینیں کجکلاہوں کی — وہ ہندی جن کے دم سے ہیں قائم ہیں شاہوں کی

وہ جن کے خون سے رنگیں پھریرا فتح و نصرت کا
وہ جن کی موت سے بھی نام زندہ ہے شجاعت کا

www.taemeernews.com

اُلٹا اثر

بہزاد لکھنوی

برسات کا زمانہ عشاق کے لئے تو بڑا پُرکیف ہوتا ہے۔ لیکن تجارت پیشہ لوگوں کے لئے بڑا مندا اور بیکار۔ اور شعرا کے لئے تو بیحد بُرا۔ اس لئے کہ مشاعرے برسات کے زمانے میں بالکل بند ہو جاتے ہیں ہر ہفتے ریل کا سفر۔ نئے لوگوں سے ملاقاتیں۔ جگمگاتے ہوئے پنڈالوں میں غزل خوانی۔ پلاؤ اور زردے سے مصافحہ سب کا سب ختم ہو جاتا ہے۔ غرضکہ برسات کیا آتی ہے شعرائے کرام کے لئے مصیبت کا زمانہ آجاتا ہے تو ہاں یہ انھیں دنوں کا ذکر ہے۔ میں اپنی بیٹھک میں افسردہ بیٹھا ہوا تھا یکایک ایک صاحب جو انگریزی لباس پہنے ہوئے تھے اندر داخل ہوئے۔ میں نے گردن اٹھائی اور چند منٹ تک نہ پہچان سکا۔ وہ بولے۔

ارے بھائی فرقت۔ خدا کی قسم کیا حلیہ بدلا ہے تم نے ارے میاں یہ ڈاڑھی یہ مولویانہ وضع۔

میں نے پہچانتے ہوئے کہا۔ اوہ ابھی نہیں کہتے امجد کہاں وہ شیروانی اور پاجامہ اور کہاں یہ سوٹ بوٹ۔

وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور بولا۔ بھئی ملازمت کے ہاتھوں مجبور ہوں دفتر کے ماحول میں شیروانی نہیں جچتی۔

میں نے کہا اور مشاعروں کے ماحول میں کوٹ پتلون نہیں پھبتا۔

خیر خیر وہ بولا۔ چلو میں تم دونوں برابر رہے۔ آمدم بر سر مطلب۔ بڑی شہرت تم نے پیدا کر لی ہے۔

میں نے کہا۔ ہاں قصور تو ہوا۔

وہ ہنسا اور بولا۔ بھائی فرقت میں تمہارے پاس اپنی ایک ضرورت لیکر آیا ہوں۔

میں نے کہا۔ کہو۔

وہ بولا۔ میں تمہیں ان دنوں کا واسطہ دیتا ہوں جب کہ میں اور تم ایک ساتھ ایک جماعت میں پڑھتے تھے۔

میں نے کہا۔ واسطہ کیوں دیتے ہو۔ میرے دل میں ان دنوں کا احترام ہے بتاؤ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں

وہ بولا۔ جب تک تم میرا پورا واقعہ نہ سن لو تمہاری سمجھ میں نہ آسکے گا کہ مجھے تمہاری کس امداد کی حاجت ہے۔

میں نے کہا۔ کہو۔ لو یہ پان حاضر ہیں اور یہ سگرٹ۔

اس نے پان کھاتے ہوئے کہا۔ بھائی نویں جماعت کے بعد تم تو کلکتہ یونیورسٹی چلے گئے اور میں کم بخت یہیں رہ گیا۔ بہرنوع انٹرنس کیا اس کے بعد بی۔اے تک پڑھتا گیا۔ لیکن والدہ صاحبہ کی اچانک موت کے باعث مجھے تعلیم منقطع کرنا پڑ گئی۔ میری والدہ کو میری شادی کا ارمان تھا اور وہ یہ ارمان اپنے ہمراہ لے گئیں۔ ان کے انتقال کو تیسرا سال ہے۔

پھر میں نے کہا۔

پھر کیا وہ بولا۔ میں نے ملازمت کر لی اور آج کل میں ساڑھے تین سو پا رہا ہوں ایک ملٹری آفیسر نے میری سفارش کردی تھی۔ لیکن میں نے اب تک شادی نہیں کی ہے۔

کیوں۔ میں نے کہا۔

اس لئے کہ مجھے ایک عورت سے محبت ہے وہ بولا۔

سبحان اللہ میں نے کہا۔ محبت کے یہ معنی ہیں کہ آدمی شادی نہ کرے۔

لاحول ولاقوۃ وہ بولا۔ دخل در معقولات کئے جاتے ہو پہلے پورا واقعہ تو سن لو۔ بھائی۔ معاملہ یوں ہے کہ میرے محلے میں ایک صاحب رہتے ہیں جو قومیت کے اعتبار سے گرے ہوئے ہیں۔ ان کی ایک لڑکی ہے نجمہ۔ مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔ وہ بذاتہٖ ہر طرح مکمل ہے۔ صورتاً سیرتاً اور میں یہ عہد کر چکا ہوں کہ اگر شادی کروں گا تو اسی کے ساتھ۔ نہیں تو تمام عمر یوں ہی گزار دوں گا۔

تو بسم اللہ کرو میں نے کہا۔

وہ جل کر بولا۔ کیا بات کہدی ہے۔ تم بڑے میاں کو بھول رہے ہو تم کو معلوم ہے وہ کس قدر قدامت پسند ہیں۔ میری شادی کے لئے کئی جگہ سے پیغام آئے لیکن

www.taemeernews.com

انہوں نے تمام خاندانوں میں کوئی نہ کوئی نکال کر انکار کر دیا۔

پر تو تمہاری مرضی کے موافق ہوا میں بولا۔

ہاں اس نے کہا۔ ہوا تو لیکن میری دوسری کے بالکل خلاف اس لئے کہ نجمہ خاندانی اعتبار سے اچھی نہیں ہے۔ مجھے شادی کی اجازت کیوں کر ملے گی۔

میں نے کہا تو ان کی خلاف مرضی عقد کر لو۔

سبحان اللہ وہ پھر تاؤ کھا کر بولا۔ اور خیال مراد سے ہاتھ دھوؤں وہ بڑے سخت مزاج آدمی ہیں۔ مجھے فوری عاق کر دیں گے۔

تو پھر آخر کیا کرو گے میں نے کہا

اس نے کہا۔ بھائی میں نے ان کے اصلاح خیال کے لئے ان کے پاس "صبح و شام" نامی رسالہ بھیجنا شروع کر دیا ہے اس میں ایک صاحب "مشکور" کے اصلاحی افسانے چھپتے ہیں۔ ان مشکور صاحب کا موضوع یہی ہے کہ خاندانی وقار کوئی شے نہیں ہے۔ انسان کو انسان کی حیثیت سے جانچنا چاہئے۔

اچھا پھر

میرے اس رسالے بھجوانے کا انجام یہ ہوا کہ پرسوں بڑے میاں کا تار میرے پاس آیا کہ فوراً آؤ۔ میں پہلی گاڑی سے ان کی خدمت میں پہنچا۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہمارا گاؤں یہاں سے کل ۳۲ میل ہے۔

میں نے کہا۔ ہاں مجھے یاد ہے میں ایک بار تمہارے ساتھ جا چکا ہوں۔

اس نے کہا۔ میں گیا انہوں نے پوچھا تم مشکور صاحب کو جانتے ہو۔

میں نے کہا جی ہاں۔ وہ بولے ان کو ایک دن کے لئے یہاں لے آؤ میں ان کی دعوت کرنا چاہتا ہوں ان کے افسانوں نے میرے خیالات میں عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ میں نے وعدہ تو کر لیا لیکن حیران تھا کہ ان مشکور صاحب کو کہاں سے لاؤں یکایک مجھے تمہارا خیال آیا۔ تمہارے متعلق سن چکا تھا کہ تم دہلی سے یہاں آگئے ہو۔ میں سیدھا تمہارے پاس آیا۔

میں نے کہا۔ میں کچھ نہیں سمجھا۔ ان مشکور صاحب سے میرا کیا علاقہ ہے۔

ابھی علاقہ کیا ہے۔ وہ بولا۔ تم مشکور صاحب بن کر چلے چلو دعوت کھاؤ اور میرا معاملہ صاف کر کے چلے آؤ۔ وہ تم سے متاثر ہو چکے ہیں۔

میں نے کہا۔ بھائی یہ کیسے ممکن ہے کہ میں دوسرا آدمی بن کر چلا جاؤں۔

وہ بولا۔ گدھے ہو چلنا پڑے گا مرد خدا میری زندگی بنی جا رہی ہے اور تم انکار کر رہے ہو۔

(۲)

دوسرے دن صبح کی گاڑی سے میں امجد کے ہمراہ روانہ ہوا اور تقریباً گیارہ بجے امجد کے گاؤں پہنچا جس مکان میں امجد مجھے لے کر داخل ہوا محلسرا سے کم نہ تھا۔ بڑے بڑے دالان لمبا چوڑا صحن۔

دالان میں سینٹوں کے مونڈھے بکثرت پڑے ہوئے تھے اور بیچ میں ایک آرام کرسی۔

امجد مجھے باہر بٹھا کر اندر گیا۔ چند منٹوں کے بعد ایک معمر مگر مضبوط قسم کے بزرگ اندر سے برآمد ہوئے۔ ان کی عمر کسی طرح ستر سال سے کم نہ تھی۔ تمام بال سفید لیکن جسم مضبوط تھا۔

بڑے زور کی السلام وعلیکم کہہ کر انہوں نے مجھ سے معانقہ کیا۔

واللہ آپ جادوگر ہیں مشکور صاحب خدا کی قسم کیا کیا افسانے آپ نے لکھے ہیں واقعی یہ خاندان وندان کوئی چیز نہیں ہے انسان کا کردار ہی ایک ایسی شے ہے جس پر انسانیت کا دارومدار ہے۔

میں نے کہا۔ یہ جناب کی عالی ظرفی ہے جو آپ نے میرے افسانوں کے مقصود کو سمجھ لیا۔

وہ بولے۔ آپ کو راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی

میں نے کہا۔ جی نہیں۔

وہ بولے۔ آئیے کھانا تیار ہے میں ٹھیک ۱۲ بجے کھانا کھاتا ہوں آپ کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ امجد الگ کھائیگا۔ آپ میرے ہمراہ تشریف لائیں۔

وہ مجھے اندر ایک کمرے میں لے گئے۔ جھاڑ اور فانوس

کمرے میں متعدد ڈھنگے ہوئے تھے اور ریشمی قالینوں کا فرش تھا بیچ میں ایک سفید دستر خوان بچھا ہوا تھا۔ میں اور وہ آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ انہوں نے ایک پلیٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس کو ملاحظہ فرمائیے یہ نرگسی کباب ہیں اور مجھے بے حد پسند ہیں میں نے کھائے واقعی خوب تھے۔

میں نے کہا۔ سبحان اللہ بہت خوب ہیں۔ انہوں نے دوسری پلیٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ یہ آفتابی پلاؤ ہے۔

میں نے وہ بھی کھایا۔ واقعی بہت اچھا تھا میں نے پہلی مرتبہ اس لذت کا پلاؤ کھایا تھا۔ میں نے اس کی بھی بیحد تعریف کی تقریباً بیس بائیس قسم کا کھانا انہوں نے مجھے کھلایا۔ میں کھاتا جاتا تھا اور تعریف کرتا جاتا تھا واقعی نئے نئے قسم کے کھانے تھے اور خوب پکے تھے وہ بولے۔ حضرت۔ آپ کچھ بتا سکتے ہیں یہ کس کے پکائے ہوئے ہیں۔

میں نے کہا۔ میں ٹھیک تو نہیں کہہ سکتا لیکن یقیناً کوئی بہترین باورچی آپ کے ہاتھ لگ گیا ہے۔

وہ قہقہہ مار کر ہنسے اور بولے جناب غلطی پر ہیں یہ صاحب میری ماما نے پکائے ہیں۔ عجیب افسانہ ہے اس ماما کا غریب بھیک مانگتی ہوئی کوئی تین برس ہوئے یہاں آگئی تھی میں۔ نے رحم کھا کر اسے رکھ لیا۔ امجد کی والدہ کے انتقال کے بعد سارے گھر کا انتظام اس نے اپنے سر لے لیا۔ میرے کپڑوں کی درستگی گھر کی صفائی پکانا ریندھنا سب اس نے اپنے اوپر اوڑھ لیا۔

میں نے کہا تو یہ ماما واقعی ایک خزانہ ہے جس کی آپ کو حفاظت کرنا چاہیئے۔

وہ بولے۔ یہی خیال مجھے دو برس سے کھائے لے رہا تھا۔ عورت جوان ہے اور مجھے ڈر تھا کہیں چل نہ دے یا ملازمت ترک نہ کر دے۔ لیکن کوئی صورت سمجھ میں نہیں آرہی تھی یکایک امجد نے صبح و شام کہانیاں مجھے لا کر دیا جس میں میں نے آپ کے افسانے پڑھنا شروع کئے اور میرے خیالات میں نمایاں فرق آنا شروع ہو گیا

خوب میں نے کہا۔

جی ہاں وہ بولے اور یہاں تک کہ میری زندگی کی سب سے بڑی مشکل حل ہو گئی یعنی یہ کہ اس خزانہ کو بقول آپ کے میں محفوظ کر سکا۔

یعنی میں نے کہا۔

یہی کہ میں نے کل رات اس سے عقد کر لیا۔ واقعی آپ باکمال مصنف ہیں مشکور صاحب اور کچھ پیش کروں۔

نغمات

سید ضمیر جعفری

شریکِ رنگ شگفتِ مزاج یار نہیں
بہار ہے پہ وہ رنگینیِ بہار نہیں

مرے سکوت میں نغمے تڑپ رہے ہیں مگر
ستم یہ ہے کہ دل انجمن فگار نہیں

بہارِ حسنِ نظر ہی کا نام تھا شاید
کہ اب بہار بھی میرے لئے بہار نہیں

جو خود خیال سے چھلکے ہم اس کے قائل ہیں
بقیدِ جام و سبو کچھ سہی، خمار نہیں

خیالِ ترک ابھی، اشتیاقِ دید ابھی!
خود اپنے ترک وطلب پر بھی اختیار نہیں

نہ جانے کون سے عالم میں آج کل دل ہے؟
کوئی تلاش نہیں، کوئی انتظار نہیں

وہ لمحہ دل پہ بہت ہی گراں گزرتا ہے
جو تیرے غم، تیری یادوں میں سوگوار نہیں

مجھے تو غم کی بدولت عزیز ہے جینا
ڈرے جو غم سے اُسے زندگی سے پیار نہیں

فقط فسردہ نوائی ہے کائناتِ ضمیر
کہ میرے پاس کوئی نغمۂ بہار نہیں

ٹوٹا ہوا کھلونا

مس سحاب آغا شاعر

ساجرہ ساجرہ ——— نجمی۔ نے بھیا کے کمرے سے آواز دی ——— نجمی آ گئے ——— مجھے چوٹی گوندھنا بھی مصیبت ہو گئی ——— نجمی میں نے خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے ذرا نام کو غور سے دہرایا ——— نجمی ——— کتنا اچھا نام ہے ——— دوسرے کمرے سے امی کی آواز آ رہی تھی۔ شاید نجمی سے کہہ رہی تھیں اُف خدایا میں تو اس لڑکی سے تنگ آ گئی ہوں ——— ہر وقت وہ ہے کمرہ ہے چوبیس گھنٹے کھڑکی کھلی ہوئی ٹانگیں پسارے پلنگ پر دراز ہیں۔ یا بہت ہوا تو۔ کہنے سننے سے سر گوندھ لیا۔ مہینوں ہو جاتے ہیں سر میں تیل تک نہیں ڈالا جاتا ——— ویسے تو ہر مہینے نئے نئے قسم کے تیل آ جاتے ہیں۔ آج امی یہ بہت ہی بڑھیا قسم کا تیل لائی ہوئی۔ ذرا سونگھئے تو۔ زمانے کی رفتار ہی عجب ہوتی جاتی ہے خدا بری گھڑی سے بچائے۔ دنیا ڈالتی چلی آتی ہے۔ کبھی کھوپرے کا تیل ڈال لیا یا وہ دھوئی تلی کا کبھی گھانی کا تیل۔ ختم ہوئی بات جمعہ کے جمعہ سر دھو لیا۔ پھر دیکھو بالوں کی حالت۔ اب تو کم بخت سنہری سے سنگھے ہو گئے موئے نہ وہ سنہری رہے نہ کالے۔ کچھ عجیب ہی رنگ ہو گیا ہے بالوں کا میں تو تنگ آ گئی۔ لڑکی جوں جوں سیانی ہوتی جاتی ہے۔ نخرے بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ سہیلیاں دیکھو تو الٰہی توبہ اے نجمی اللہ قسم کل ایک صاحبزادی آئیں، بال ایسے تھے جیسے چڑیوں کا گھونسلا۔ بال نہ سیاہ تھے نہ سنہری۔ کچھ عجیب ہی سے تھے۔ تیل کی شکل تو سالوں نہ دیکھی تھی۔ بھر بھرے سے میرا تو دیکھتے دیکھتے سر چکرانے لگا۔ کندھوں پر کھلے ہوئے پڑے تھے۔ کپڑے تو ایسے اچھے قیمتی پہنے تھے۔ مگر بال باندھنے کو ایک چھیترا بھی نصیب نہ ہو، میری جان ہی تو جل گئی۔ اور ہنسی بھی آئے کہ اتنی کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ کچھ کہتے ——— بھی تو برا معلوم ہوتا۔ ہاں ٹھہری جولی جیسی غضب کی لڑکی جس کے لئے لڑکے کناٹ پلیس پر بیسیوں چکر لگا جاتے ہوں گے کہ شاید مل جائے یا نظر آ جائے۔ کاش ہم ایک دفعہ بات کر سکتے ——— اور اس غریب کی یہ درگت بن رہی ہے وہ تو خدا کی ہی کچھ مہربانی ہے؟ جولی صاحب مجھ پر مہربان ہیں ورنہ اور بھی اس کی کلاس فیلو ہیں مگر کبھی جو ڈھنگ سے بات کی ہو کسی سے۔

میں نے آخری مرتبہ سر پر کنگھی پھیری۔ قدِ آدم آئینہ میں آج نہ جانے مجھے اپنی شکل کچھ بہتر محسوس ہو رہی تھی۔ گول چہرہ کو دیکھتے دیکھتے میں اکتا گئی تھی۔ ہاں البتہ آنکھیں مجھے ہمیشہ اپنی پسند ہیں۔ کیونکہ غور سے دیکھتے دیکھتے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ میری نہیں۔ اور شاید نجمی کی یا ان ہی جیسے کسی اور بھائی کی آنکھیں ہوں۔ جو آئینہ میں ملتے ہی۔ منہ سرخ ہو جاتا ہے اور ایک پھریری کے ساتھ۔ سارے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ لمبی لمبی انگلیاں خود بخود بند ہو جاتی اور بغیر اجازت کے آنکھیں نیچے جھک جاتیں۔ جیسے کسی کو جھک کر آداب کر رہی ہوں۔ میرے ہاتھ آج حد سے زیادہ سفید نظر آ رہے تھے شاید کالی ساڑھی کی وجہ سے ساڑھی کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے۔ میرے ہاتھ آب کر رہے تھے۔ سفید ساٹن کا بلاؤس کمر پر کس قدر فٹ ہے۔ اور جارجٹ کی نرم نرم ساڑھی باریک نرم نرم سی۔ میری محبوب ساڑھی۔ مگر میرا رنگ زرد کیوں ہے۔ ظاہراً میں سب کو خوش نظر آتی ہوں۔ امی کو ہی فکر دامنگیر ہے کہ تم ہر وقت لیٹی رہتی ہو۔ ہر وقت پڑھتے رہتی ہو ——— ایک کمرہ میں گھسے رہنا۔ آخر صحت کیسے قائم رہ سکتی ہے ——— مجھے ان کی باتوں پر باوجود ضبط کے ... ہنسی آ جاتی ہے۔ مگر اس کے جواب میں ان کی بڑی بڑی حیران نظریں جن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ کہہ رہی ہوں۔ لڑکی تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ——— میرا رنگ واقعی زرد ہوتا جا رہا ہے۔ ساڑھی کی پلیٹیں درست کرتے ہوئے میں نے سوچا ——— مگر کیوں۔ میں نے شانوں کے پاس گرم گرم سانس سا محسوس کیا۔ شاید میرا خیال تھا اور میں جھکی ہوئی پلیٹیں درست کر رہی تھی۔ برقی پنکھے کی رفتار شاید خود بخود ہی تیز ہو گئی تھی ——— اور یہ چھوٹے چھوٹے خم دار بال؟ انہیں نہ جانے اس قدر شوخی کیوں سوجھی تھی۔ میں نے بال درست کرنے کی نیت سے آئینہ میں دیکھا۔ اور ذرا جھک کے

اپنے پورے جسم کا جائزہ لینا چاہا۔ جو مجھے کسی کا چہرہ مل گیا —— آئینہ میں اب دو چہرہ نظر آرہے تھے چار آنکھیں۔ اور دو جسم —— بالکل قریب۔ نجانے میرے زرد چہرہ پر اس قدر سرخی کہاں سے آگئی تھی —— پیشانی پر ننھے ننھے پسینے کے قطرے نہ جانے کہاں سے آگئے تھے۔ میں نے دور ہٹتے ہوئے۔ ایسے غصے سے جس میں خاک بھی غصہ نہ تھا۔ ارے آپ —— اور میرے ہونٹ آپس میں جڑ گئے۔ ساڑھی کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے میں نیچے نظریں کئے ہوئے۔ اپنے دل کی دھڑکن کا اندازہ لگا رہی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے چمکتے ہوئے پالش —— پر میرا سگھڑاپا نظر آرہا تھا۔ پاؤڈر لگانا بھی نہیں آتا۔ دیکھئے تو کتنا پاؤڈر گرایا ہے —— کتنے بیہودہ سا انسان ہیں۔ ایک تو بغیر اجازت میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور اوپر سے نصیحت۔ ابھی کے آنے سے پہلے میں کتنی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ میرے دل میں کتنی قدر تھی۔ ذرا بھی تو خوددار نہیں۔ یہ شخص خودداری —— خودداری۔ میری آنکھیں جلنے لگی۔ کرسی کے گول گول سوراخوں میں ایسا معلوم ہوا جیسے یہ لفظ گول گول گھوم رہے ہیں۔ مجھے بے اختیار —— رو شدی یاد آگئے کتنے خوددار ہیں، کیا مجال جو فضول بات منہ سے نکالیں —— سرخ و سفید چہرہ مغرور ابرو تیکھے تیکھے نقش۔ سفید سلک کی قمیص عنابی ٹائی اور —— اور —— نیلی چمکدار سی آنکھیں۔ گلابی گیلے گیلے کانپتے ہوئے۔ لب —— رو شدی —— فلاسفر —— چہرہ پر ایک طنزیہ مسکراہٹ جولی کی سالگرہ میں شائد ملاقات ہوئی تھی سبھی تو اس کی طرف متوجہ تھیں مگر وہ ہر ایک کا جواب ایک طنز آمیز مسکراہٹ پر ختم کرتا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ آوہ۔ اس قدر غرا۔ اس قدر میک اپ جیسے اپنی ساری زندگی پر میک اپ کر لیا ہو۔ ہر آرزو پر دولت کا روغن کر لیا ہو۔ دماغی احساس مردہ کر کے ظاہرا چلبلا پن سیکھ لیا ہو۔ آنسوؤں کو چھلکنے کے خوف سے آنکھوں کی گہرائیوں میں ہی سلادیا ہو۔ شاید ان کی چمک ہی کسی کو لبھانے۔ ابن آدم اتنے معصوم نہیں ایکٹنگ ہم سے سیکھو۔ ہم پیدائشی ایکٹر ہیں اور اچھے ایکٹر کی تعریف یہ ہے کہ اپنی جان تک خطرہ میں ڈالنے کو تیار ہو۔ تم بھی یہ غلط ہے۔ آدم بہت ہی سادہ لوح تھے۔ ہر مرد عورت کے سامنے جھک جاتا ہے یہ اس کی فطری کمزوری ہے۔ مگر جانتی ہو۔ یہ سب غلط ہے۔

کامیاب ایکٹر۔ مرجانا ۔ ۔ ۔ پسند کرے گا مگر یہ نہیں سننا پسند کرے گا۔ کہ لوگ اس کو یہ کہیں کہ ڈرامہ کا پلاٹ اچھا تھا۔ مگر یہ ایکٹنگ نہ کرسکا —— کبھی نہیں۔ وہ ہر قربانی دینے کو تیار ہے تم کہو گی۔ اوہ۔ اور آدم حوا کو کتنا چاہتے تھے۔ کہ انہوں نے حوا کی خواہش پر اپنا عیش و آرام تک چھوڑ دیا۔ کیا یہ غلط ہے۔ نہیں بالکل نہیں مگر آدم ایسے نہ تھے۔ وہ حوا کو احساس دلاتے تھے ... تم سے محبت کرتا ہوں میں بے انتہا چاہتا ہوں۔ تمہارے بغیر میری دنیا تاریک ہو جائے گی میں تمہارے ایک اشارے پر اپنی ہر خواہش کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر سکتا ہوں۔ میری زندگی تم سے ہے۔ میری بہار تم ہو۔ میری خواہشات کا نچوڑ تم ہو۔ میری اندھیری راتوں کا چاند تمہارا حسین چہرہ ہے۔ میری نیندیں تمہاری سیاہ زلفوں میں پوشیدہ ہیں۔ ہر سانس کی گرمی تمہارے تھرتھراتے ہوئے لب ہیں —— پھر جانتی ہو حوا کا وہ —— پہلا تجربہ تھا۔ اور آدم کا وہ پہلا امتحان —— اور آدم کو کہنا ماننا پڑا اپنی ایکٹنگ اتنی کامیاب ہوئی ہم نے ڈرامے کا پہلا سین نہیں دیکھا۔ مگر لوگوں کی زبان سے سنا ہے کتابوں میں پڑھا ہے۔ کتنی شاندار ایکٹنگ تھی۔ اور کتنا کامیاب ہوا۔ جانتی ہو عورت کا دل اس وقت ٹوٹ جاتا ہے جیسے کوئی بچہ کھیلتے کھیلتے اکتا جائے۔ ہر وقت وہی کھلونا اس کی نظروں کے سامنے رہے آخر غور سے دیکھتے دیکھتے اس کے چہرہ سے نقاب اٹھ جاتی ہے اور اس کی خوبیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ نظریں جم جاتی ہیں۔ اور کھلونے ہی کا مرکز بن جاتی ہیں رفتہ رفتہ کھلونے میں حرکت شروع ہو جاتی ہے۔ اور وہ کسی دل کا بہلاوا بن جاتا ہے اسی طرح دن بیت جاتا ہے اور بچہ کھیلتے کھیلتے کھلونے کو [illegible] سوجاتا ہے۔ اور ایسا مدہوش ہو جاتا ہے۔ خواب میں بھی وہ کھلونے کے ساتھ کھیلتا رہتا ہے صبح ہوتے ہی دنیا میں کھلونوں کی دوکانیں سجائی جاتی ہیں۔ بچہ ہمک ہمک کر نیا کھلونا مانگتا ہے پرانے کھلونے کی جگہ اب نئے کھلونے لے لیتا ہے اور پرانا کھلونا۔ منہ چڑھا کے پھینک دیا جاتا ہے اور وہ ٹوٹ جاتا ہے

www.taemeernews.com

اور نئے کھلونے کی رنگینی پر اس کی نظریں جم جاتی ہیں۔ آندھی آتی ہے۔ اندھیری رات میں طوفان آتا ہے۔ بارش ہوتی ہے۔ ٹوٹے ہوئے کھلونے کا روغن بارش کے پانی سے بہہ جاتا ہے اور مٹی نکل آتی ہے۔ وہ رنگ و روپ نہ جانے کہاں غائب ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ لوگوں کی آمد و رفت سے کھلونے کا چورا چورا ہو جاتا ہے پہلے سے رنگ کی مٹی نظر آنے لگتی ہے۔ باریک مٹی ہوا میں مل جاتی ہے۔ اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جھاڑو کی مدد سے کوڑے کے ڈھیر میں اور نیا کھلونا سفید سے نرم نرم پلنگ پر اپنے ہی جیسے ننھے سے ساتھی کی ننھی ننھی باہوں کی گرفت میں۔ یہاں تک کہ کھڑکی سے سورج کی کرنیں اندر داخل ہو جاتی ہیں اور ننھے سے چہرہ پر ایک والہانہ مسکراہٹ رقص کرتی نظر آتی۔ بالکل ایسی جیسی روشندی کے چہرہ پر ہر جواب کے بعد مسکراہٹ دوڑ جائے۔ مجھے سخت گرمی لگ رہی تھی۔ پسینے پسینے ہو رہی تھی۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا کار کا ہارن زور سے بجا میری آنکھ کھل گئی۔ باہر ہارن زور زور سے بج رہا تھا ——— میں نے اپنے اوپر نظر ڈالی۔ کالی ساڑھی اب جسم سے لپٹ گئی تھی۔ ساٹن کا بلاوز پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ آنکھیں جلنے لگیں ——— ہاتھ پاؤں ایسے ہو گئے تھے جیسے ان میں جان ہی نہ ہو۔ مجھے یاد آیا اُوہ مجھے تو چھ بجے نجمی کی سالگرہ کی پارٹی میں جانا تھا جس کے لئے تیار ہو کر کار کا انتظار کرنے کے لئے کمرہ میں پلنگ پر یونہی ساتھ لیٹ گئی تھی۔ گھڑی میں پورے چھ بجے تھے۔ میرا دل گھبرا رہا تھا۔ کار کا ہارن بجا اور دوسرے کمرے سے امی کی آواز آئی۔

ساحرہ۔ ساحرہ۔ بھئی کار آ گئی ہے جانا ہے یا نہیں تو بہ بھئی اس لڑکی سے تو میں بیزار ہو گئی ہوں۔ گھنٹوں سے کار کھڑی ہے مگر بیگم صاحب تیار ہی نہیں۔ تمہاری خالہ جان کے ہاں سے دو دفعہ نوکر بھی آیا اور ایک دفعہ نجمی بھی آیا تھا۔ تمہارے کمرہ میں گیا اور پھر واپس چلا گیا ——— بھئی عجیب لڑکی ہو تم بھی آخر جا بھی چکو۔ خدا نے خیریت سے ایک سال اور گزار دیا۔ اللہ اُسے خوش رکھے۔ اللہ اسے زندہ سلامت رکھے۔ کیا اچھا بچہ ہے۔ امی اپنی ملاقاتی خاتون سے باتیں کرنے لگیں۔ اور میں ہم سے بیزار تھی۔ میں خود دنیا سے بیزار ہوں۔ میں نہیں جاؤں گی ——— کبھی نہیں جاؤں گی۔ خیریت سے ایک سال اور بیت گیا۔ اور میری زندگی ایک سال قریب میں گذری۔ تین سال اور ابھی بیں گذریں گے۔ اور پھر پہلا کھلونا توڑ دیا جائے گا ——— میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ زرد زرد انگلیوں میں جلتی سی ہونے لگی ہیرے کی انگوٹھی میری انگلی میں چمک رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے انگوٹھی انگلی کو بھینچ رہی ہو۔ میری روح کانپ گئی ——— میں نے آئینہ میں شکل دیکھی سونے سے پہلے کالی ساڑھی کے آنچل میں زرد چہرہ سفیدی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ زردی غائب تھی اور رخسار گلابی۔ خشک ہونٹ گیلے اور سرخ تھے مگر ——— مگر ——— اب آنکھ کھلنے پر وہی زرد چہرہ تھا۔ ہونٹ خشک تھے۔ پسینہ پونچھنے سے سفید رومال کو دیکھا تو اس کی سفیدی بھی سیاہی اور سرخی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اور میری شکل بالکل ایسی ہو گئی تھی ——— جیسے جیسے ٹوٹے ہوئے کھلونے کی بارش کے بعد ——— میری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں ——— اور ایسا معلوم ہوا جیسے نجمی کے پیروں پر میری انگلی کی انگوٹھی خود بخود نکل کر گر پڑی ہے۔ نجمی کے لب کانپ رہے تھے۔ جیسے کہہ رہا ہو میری بہار تم ہو۔ تمہارے بغیر میری دنیا تاریک ہو جائے گی۔ میری نیندیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہاری ان زلفوں میں روپوش ہو جائے گی ——— میں چیخ اٹھی۔ ابن آدم یہ تمہارا ہی حصہ ہے کاش میں بھی ایسی کامیاب ایکٹنگ کر سکتی۔ اس ڈرامہ کا اینڈ یہی ہونا چاہئے تھا ———

پردہ گر جائے۔ بس نجمی بس ——— میرا سانس گھٹ رہا تھا ——— میرے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اور زور سے ہوا چلنے لگی ——— آندھی آئی بادل گرجے اور زور و شور سے بارش شروع ہو گئی ——— میری روح کانپ رہی تھی۔ میرے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے جیسے مجھے کسی نے اوپر سے پھینک دیا ہو۔ سانس آہستہ آہستہ چل رہا تھا ——— کسی کے قہقہوں سے میری آنکھ کھل گئی۔ نجمی اور روشندی مجھے لینے آئے تھے مجھے دونوں کی شکلوں سے نفرت سی ہو گئی۔ روشندی نے میرے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ ساحرہ تمہیں کیا ہوا سب انتظار کر رہے ہیں ——— اُف اللہ تمہارا رنگ کیوں زرد ہو رہا

اور پسینہ۔ پنکھا بھی چل رہا ہے۔ آخر کیوں؟ —— روحہ آج اتنی خوش کیوں ہے۔ میں نے اس کے چمکتے ہوئے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔ اور یہ زرق برق عنابی ساڑھی۔ میں نے جھپٹتی ہوئی نظر آئینہ پر ڈالی۔ دو شاداب چمکتے ہوئے سرخ و سفید چہروں کے بیچ میں۔ کالے آنچل میں کملایا ہوا زرد چہرہ — آنسوؤں سے لبریز آنکھیں —— صرف شیشے سے ٹکرا کر رہ گئی اور پُرجوش نظریں آپس میں سما گئیں —— میرے زرد ہاتھوں کو دباتے ہوئے روحہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ساجرہ نجمی بھیا نے اپنی سالگرہ میں تمہیں کیا دیا۔ وہ مسکرا رہی تھی اس کی آنکھیں مجھ پر مسکرا رہی تھیں۔ نجمی نے گھبراتے ہوئے جواب دیا ابھی —— ابھی انہیں کچھ بھی نہیں دیا کیونکہ انہیں شاید اتنی خوشی تھی اس کا ثبوت ان کی یہ دیر اور یہ کالی ساڑھی —— ہاں اگر یہ دیر کی معافی مانگیں اور ساڑھی چینج کریں تو ہم پھر انہیں ایک ایسی چیز دینگے جو تمہیں بھی نہیں ملے گی۔

میں نے روحہ کی طرف دیکھا۔ اس کے سرخ چہرہ میں کچھ کچھ زردی جھلک رہی تھی۔ مگر میری طرف دیکھتے ہی مسکرانے لگی۔ ساجرہ مجھے نجمی بھائی نے ایک چیز دی ہے یہ کہہ کر اس نے اپنے سفید ہاتھ میرے زرد ہاتھوں پر رکھ دیئے۔ اس کی لمبی لمبی انگلیوں میں سرخ رنگ کی نئی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا میرے زرد ہاتھوں کی انگلی میں انگلی کو بھینچ دینے والی سفید ہیرے کی انگوٹھی اور جس کا نگ کانپ رہا تھا —— میری پیشانی پر ایسا معلوم ہوا جیسے ٹھنڈے پانی کو فوارے کی صورت میں کوئی بہا رہا ہے ——

میں نے بوجھل نگاہیں نجمی کے چہرے پر گاڑ دیں —— وہ بے حد گھبرایا ہوا سا تھا۔ پیشانی پسینے سے تربتر تھی۔ اور امی کے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے خدا عمر دے کتنا اچھا بچہ ہے۔ جو روحہ کی اس آواز نے چونکا دیا۔ نجمی تم ساجرہ کو کیا دو گے اگر یہ ساڑھی چینج کر لیں۔ اس کی مسکراہٹ میں جلن کروٹ لے رہی تھی میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا —— میں بتاؤں —— ہاں ہاں نجمی نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا میں نے روحہ کی خوفزدہ نظروں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ٹوٹا ہوا کھلونا [illegible] انہوں نے زور زور سے قہقہہ مار کر دونوں کے

کان چھلنے لگیں۔ مگر میری انگلیاں اب بھی ہیرے کی انگوٹھی اتار کر روحہ کی انگلیوں میں پہنا رہی تھی۔ اور میں نے بمشکل ٹھہر ٹھہر کر جھکتے ہوئے روحہ کی گرم پیشانی پر اپنے خشک ہونٹ رکھتے ہوئے کہا۔ چلو روحہ پیاری مجھے یہ کالی ساڑھی بہت ہی پسند ہے۔ اف روحہ کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دونوں انگلیوں میں ایک ساتھ دو نگ چمک رہے تھے سفید و سرخ جیسے شروع شروع میں ان دونوں کے چہروں میں تھے بے تاب ہو کر اپنی زرد انگلیوں میں کالی ساڑھی کا آنچل لپیٹنا شروع کر دیا۔ چلو۔ میں تیار ہوں میں نے کانپتے ہوئے کہا مگر ایسا معلوم ہوا جیسے دونوں اپنی جگہ پر جم گئے ہوں۔ میری نگاہوں کے سامنے ایک کالا سا پردہ پڑ گیا۔ دل جیسے اب پانی میں ڈوب سے ہی والا تھا۔ کچھ دیر سکوت رہا۔ [illegible] میرا دل گھبرانے لگا جیسے بارش ہونے لگی میں نے دیکھا۔ بارش کے پانی سے ٹوٹے ہوئے کھلونے کا رنگ و روغن سب غائب ہو چکا تھا —— گیلی گیلی پیلی پیلی ٹوٹے ہوئے کھلونے کی مٹی پانی میں بہہ بہہ کر چاروں طرف عجیب عجیب شکل بنا رہی تھی —— روحہ کا مسکراتا ہوا چہرہ نجمی کا خوفزدہ چہرہ اور روشدی کی طنزیہ مسکراہٹ نجمی کے ساتھ ساتھ کہہ رہا تھا۔ روحہ تم تو مجھے چھوڑ نہ جانا۔ میں تباہ ہو جاؤں گا میری زندگی اب تم ہو صرف تم۔ میری بہار مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔ میرے کانوں میں روشدی کے الفاظ گونج رہے تھے۔ جیسے وہ مسکرا کر کہہ رہا ہو اونہہ تم جانو دختر حوا ابن آدم اتنا بیوقوف ہے۔ یہ بہترین ایکٹر اپنی ایکٹنگ میں بڑی بڑی قربانیاں کر سکتا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے بارش ہونے لگی میرے منہ پر بوندیں پڑنے لگیں گھبرا کر آنکھ کھولی۔ حیران تھی چاروں طرف گھر کے آدمی نظر آنے لگے، سب کے رنگ فق تھے —— امی کی آنکھیں شاید رو رو کر سوج گئیں تھیں۔ اور ڈاکٹر نے آہستہ سے نجمی کو انگریزی میں کہا کہ مریضہ کے دل پر بہت بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ اب ذرا احتیاط کیجئے گا۔

اف اللہ میرا سانس گھٹنے لگا اور میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ میں نے ہلکے سے بے اختیار چیختے ہوئے کہا ابن آدم —— ٹوٹا ہوا کھلونا۔ اور امی کے الفاظ دھیرے سے سنائی دے رہے تھے خدایا میری بچی کو بچا آج اس نے کالی ساڑھی

پہنی ہے۔ ہر وقت اپنے کمرے میں اکیلی پڑی رہتی ہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ کنوارا پنڈا ہے اچھی بُری روحوں کا گذر ہوتا ہی رہتا ہے۔

کسی چیز کے گرنے سے میری آنکھ کھل گئی میں چونک پڑی بجی اور روحہ جا چکے تھے۔ کیونکہ دیر ہو رہی تھی۔ پرویز زور زور سے رو رہا تھا۔ جیسے آپا جان بڑی مشکل سے خاموش کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ نہیں نہیں کھلونا میرا کھلونا ——— وہ زور زور سے چیخ رہا تھا ———

میرے سر میں درد ہونے لگا۔ آپا جان کیوں رو رہا ہے بھئی کیا کروں یہ بھی مصیبت ہے۔ کھلونا ٹوٹ گیا۔ کل بازار سے اور لا دوں گی پرویز چپکے ہو جاؤ ——— خالہ جان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اور پرویز میری طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا ——— اور انگلی ٹوٹے ہوئے کھلونے کی طرف تھی ———

بدلیاں

مس سحاب آغا شاعر کے

افسانوں کا مجموعہ

جو جولائی کے آخر تک شائع

ہو جائے گا

ہندستانی پبلشرز دلی

یہ کتابیں

تشنگی۔ رشید اختر ندوی کا ناول
پرانے خدا۔ کرشن چندر کے افسانے
میر صاحب۔ عادل رشید کے مزاحیہ افسانے
زرد چہرے۔ ابراہیم جلیس کے افسانے
مقامِ اقبال۔ اشفاق حسین ایم اے
علیگیات۔ سید غلام
افسانچے۔ علامہ کیفی
داستانِ کربلا۔ مختلف حضرات
قائدین کے خطوط جناح کے نام
کارنامۂ پہلوی۔ ایران جدید کی تاریخ سید حسن بلگرامی
روسی ظرافت۔ سلمہ ضیائی کے روسی ترجمے
نواب صاحب کی ڈائری۔ مرزا فرحت اللہ بیگ
دل کے آنسو۔ رئیس احمد جعفری کے افسانے
جھلکیاں۔ رہبر پٹیالوی کے افسانے
غبار۔ قیسی رامپوری کے افسانے
یادگارِ برق۔ مرتبہ غالب دہلوی
رعنائیاں۔ شکیل بدایونی کا مجموعۂ کلام
حیدر آباد کی نسوانی دنیا۔ مرتبہ نصیر الدین ہاشمی
سرخ سویرا۔ مخدوم محی الدین کا مجموعہ کلام
سزا۔ قیسی رامپوری کا ناول
نانسیت۔ شاہد حسین ارزقی
سیف و سبو۔ جوش ملیح آبادی کا انتخاب
پگڈنڈی۔ افضل عابدی کا ہندی افسانوں کا مجموعہ
منٹو کے مضامین۔ سعادت حسن منٹو۔
اسرار۔ علی اختر کی نظموں کا مجموعہ
اشارے۔ ہندستان کے مشہور مزاحیہ نگاروں کے منتخب مضامین۔
صدائے جرس۔ مسز عبد القادر کے افسانوں کا مجموعہ۔

وہ ہیں جنکے اچھے ہونے کا ضامن انکے مصنفین کے نام ہیں اگر آپ نے نہیں پڑھی ہیں تو ضرور پڑھئے۔ محصول بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ۔ نگارستان ایجنسی اردو بازار جامع مسجد دلی۔

ایک زندہ لڑکی

صدیقہ بیگم سیوہاروی

ہماری گاڑی رُکی، اور مسافر چیونٹیوں کی طرح رینگتے ہوئے ڈبوں میں گھسنے لگے، ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے نہ کسی کے سر کا خیال نہ پیر کا۔ خصوصاً قلی تو آنکھیں بند کر کے ایک دوسرے پر چڑھائی کر رہے تھے، چاہے ان کے سروں پر رکھے ہوئے بکس کے کونوں سے کسی کے سر میں چھید ہی کیوں نہ ہو جائے، کہیں کسی کی پگڑی گرتی تو کسی کی ٹوپی اچھلتی، اور پھر ایسی گالیاں سننے میں آتیں کہ توبہ بھلی، مگر اس وقت کس کو سننے اور جواب دینے کی فرصت تھی، جلدی جلدی دھکیلتے ہوئے جو بھی آگے بڑھ جائے، تنازع البقا کا پورا فلسفہ یہیں پہ سمٹ ہو جاتا ہے۔ ریل کا ڈبہ بھی ایک چھوٹی موٹی دنیا ہے جہاں پر ہر قسم کے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، جس میں ہر ایک برابر کا حصہ دار ہے، کوئی تماشائی نہیں ہر ایک تماشا ہے، آپ چاہیں کہ خاموشی سے ان منظر کو ایک ولی اللہ کی طرح دیکھتے ہوئے گزر جائیں تو یہ ناممکن ہے، کیونکہ کہیں نہ کہیں آپ کو بھی اس میں حصہ لینے پر مجبور ہونا پڑے گا، جو آدمی زندگی سے اکتا گیا ہو، زندگی سے فرار کرنا چاہتا ہو، اس کو آج کل ریل میں سفر کرنا چاہیئے، کیونکہ سفر میں زندگی کی رفتار اتنی تیز ہوتی ہے جتنی خود انجن کی ——— ہاں تو اس وقت ہمارے ڈبہ کا یہ حال تھا، کسی کے پیچھے چلا رہے تھے، کسی کا سلیپر پیر سے نکل گیا، تو کوئی برقعے والی بی بی کسی کالے کوٹ والے کے پیچھے پیچھے چلی جا رہی ہے۔ سالے کوٹ والا ان کا میاں ہی تو ہے، مگر ایک دفعہ جو اس نے مڑ کر دیکھا تو پیروں تلے کی زمین نکل گئی ——— یہ تو نہ جانے کون ہے، وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"ارے اس ڈبہ میں آؤ" وہ کہیں دور سے چلائے "ہر کج ہے بھائی عورتوں اور بچوں کو لے کر کہیں سفر کرے" وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بھنبھناتے ——— بیگم کے پانچوں بچے جو کوئی پکڑے تھا، کوئی پیچھے سے برقعہ تھامے تھا، ایک آدھ بغل میں، جیسے جھینگر کی مردہ لاش کو چیونٹیاں اٹھائے لئے جا رہی ہوں۔ اور بچوں کی اس فوج میں کہرام مچ گیا۔ گرتے پڑتے باپ کی طرح دوڑنے لگے۔ قلی نے جو دھکا مارا تو کچھ بچے ادھر اور کچھ ادھر۔ بیگم نے قہر آلود نظروں سے قلی کو دیکھا جیسے کھا ہی تو جائیں گی۔ خیر کھائیں یا نہ کھائیں۔ پر اس کمبخت پر آہ تو ضرور پڑے گی، ان کا صبر بھی آخر کہاں جائے گا، شاید اسی خیال نے بیگم کو تسلی دی اور وہ آگے بڑھ گئیں۔

"ارے بھائی بچوں کو گن لینا، سب ہیں" اور اس نے ایک نظر بچوں پر ڈالی "اس لئے کہتا ہوں کہ کبھی ایک آدھ کہیں رہ جاتے" یہ کہہ کر وہ ہنس پڑا۔

سامنے آہستہ آہستہ ایک لڑکی چیونٹیوں کے دل میں رینگ رہی تھی۔ گاڑی چھوٹنے میں دس منٹ باقی تھے، اس کے ہاتھ میں کپڑوں کی ایک پوٹلی تھی، بس اس کو تو کھڑے ہونے کی جگہ مل جائے۔ اس کو ہنسی آتی، جگہ تو بعد ہی میں ملے گی، پہلے وہاں تک پہنچ ہی جائے وہ سر جھکائے آگے کو آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی، لیکن پھر بھیڑ کے ریلے سے پیچھے چلی جاتی ——— مجھے اس کی حالت پر بڑا رحم آیا۔ مگر میں اتنی دور سے کر ہی کیا سکتی تھی، ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے وہ اکیلی ہے مگر اتنی دنیا میں کوئی اکیلا کیسے رہ سکتا ہے، لیکن وہ تو اکیلی ہے، اگر کوئی ساتھ ہوتا تو اس کے ساتھ بھی کچھ ساز و سامان ہوتا، دو چار قلی ہوتے اور وہ بھی اوروں کی طرح دھکا دیتی ہوئی اپنی جگہ بنا لیتی، لیکن وہ بیچاری آخر کیا کر سکتی تھی۔

"اری ساری اسی ڈبے میں گھس آؤگی ———" ایک مسلمان عورت نے پان کی پیک تھوک کر بولی۔

www.taemeernews.com

"اری میں کہتی ہوں، تمہیں یہی ڈبہ رہ گیا ہے؟" ایک مٹر مٹروں کا تھیلا جیسی بیگم ٹیک سے سر اٹھا کر تنکی۔

"کہاں جاتیں بہن! سارے ہی ڈبے تو ٹھاڈٹ بھرے ہیں مسافروں سے —— کوئی حد بھی ہے —— پھر آج کل کوئی ہنسی خوشی سفر کرتا ہے، یہ تو مجبوری ہے" ایک عورت نے اپنی بچیہ سنبھالتے ہوئے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"ڈھٹم کو اپنے میں گھر سے نکلنے کو کس سالے نے کہا تھا —— حرام زادیں چڑھتی چلی آرہی ہیں" اب بیگم ذرا سنبھل کر بیٹھیں۔

"اے بیگم صاحب، آخر ہم نے بھی تو کرایہ دیا ہے تم تو لیٹی ہو، اور ہمیں کھڑے ہونے تک کو جگہ نہ دوگی، آخر ہمارا پیسہ بھی تو لگتا ہے۔"

"ہائیں ہائیں رو کے پر چڑھی چلی آرہی ہے، اندھی ہے ہزار کا ٹوکرا سب اٹھا کر گاڑی سے باہر پھینکوا دوں گی، چڑیل کہیں کی۔"

دوسری سیٹ پر لیٹی ہوئی پنجابن ایک غریب چوڑی والی پر چلائی "ہے بھگوان! —— مائی تم نے بھی پیسہ دیا ہے اور ہم نے بھی —— تمہارے پیسہ میں کوئی لعل نہیں لگے، جو لمبی ہوکر آرام کروگی، اور ہمارا پیسہ کوئی حرام کا ہے جو ہمیں جگہ بھی نہ ملے اور اسی تمہاری گالیاں بھی سنیں —— واہ بہن واہ ——" چوڑی والی نے حقارت سے پنجابن کی طرف دیکھا، مگر یہ دال کہاں گلنے والی تھی، وہ بجلی کی طرح اٹھی۔

"چپ نہیں رہے گی حرام خور —— ابھی گارڈ تیرے خصم کو بلا کر گڈی (گاڑی) سے اتروا دوں گی۔"

"اتروا کے تو دیکھ —— میں نے بھی بارہ گھاٹ کا پانی پیا ہے، سات برس لاہور اور پانچ برس امرتسر میں رہی ہوں، تجھ جیسی تو تین سو ساٹھ میری آستین میں پڑی ہیں۔"

پر وہ کہیں دبنے والی تھی، ایک جھٹکے سے اٹھی، اور سیٹ پر لیٹا ہوا بچہ دھڑام سے نیچے —— چلو یہ بھی غنیمت ہوا کہ وہ بچے کو بہلانے میں لگ گئی، مگر یہ کیا یہ تو ٹرین کا سفر ہے اگلے اسٹیشن پر پھر سہی۔

گاڑی چل پڑی، سب اپنی اپنی جگہ پر خاموش ہو کر باہر دیکھنے لگیں، بھیڑ بہت تھی، اس لیے میں بھی سمٹ کر بیٹھ گئی، اور پھر ماحول کے سکوت سے گھبرا کر باہر کو دیکھنے لگی، گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی تھی ذرا سی دیر میں معلوم ہونے لگا کہ جیسے گاڑی ساکت ہے اور زمین گھوم رہی ہے، ایک دائرہ کی شکل میں درختوں کے جھنڈ جیسے ہوا میں اڑ رہے ہوں، دھان کے ہرے ہرے کھیت دوڑتے ناچتے ہوئے سامنے آتے، ناچتے ہوئے دائرہ کی شکل میں گھومتے، اور پھر جیسے خود غائب ہو جاتے۔ آخر یہ ہرے ہرے کھیت کہاں غائب ہو رہے ہیں، جیسے آنکھوں میں جذب ہوئے ہوں، یا جیسے آسمان کے سینے میں چھپ گئے ہوں، میں خیالات کی رو میں بہنے لگی۔ بہتی چلی گئی، ایک بہت بڑا میدان تھا جس میں دوڑ رہی تھی، کوئی رکاوٹ نہ تھی، بیچ میں کوئی دیوار حائل نہ تھی۔ سچ مچ خیالوں کی دنیا کتنی وسیع ہے، کاش ہماری روزمرہ کی زندگی میں بھی اتنی وسعت ہوتی۔

"میں کال کتے سے پرسوں چلی تھی۔"

میں چونک پڑی، ایسا معلوم ہوا، جیسے دھڑام سے کسی غار میں جا پڑی ہوں، مڑ کر دیکھا تو میرے قریب ہی ایک بنگالی لڑکی کھڑی تھی۔

"سچ مچ جوان لڑکی لاج، شرم نام کو نہیں"، بیگم صاحبہ نے بنگالی لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں دیکھو تو کیسی بیرہ سی دھوتی پہنے ہے، سارا جسم دکھائی دے رہا ہے۔"

"کیوں ری لونڈیا —— یہ کیسی دھوتی پہن کر گھر سے نکلی ہے گاڑی نہ ہوئی اپنا گھر ہو گیا۔"

"کیا کریں بیگم شاب، ہمارے پاس اتنا روپیہ نہیں ہے، اور دھوتی آجکل ملتی بھی کہاں۔"

یہ جواب سن کر سب خاموش ہو گئے، وہ بھی چپ ہو گئی، اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی، بہتی ہوئی ندیاں، ناچتے ہوئے درخت گھومتی ہوئی دھرتی —— اس وقت ساری دنیا ناچ رہی تھی، اور ایک خوفناک ناچ ناچ رہی تھی، انسانوں کے پیروں تلے گھوم رہی تھی۔ کمزور انسان گر رہے تھے، مر رہے تھے، اور مضبوط اپنے پیر جمائے ہوئے تھے، آخر دھرتی کے آگے سب ہیچ ہیں

www.taemeernews.com

اس میں کمزور کیوں؟ ماں کی ماشا کو تو اپنے سب ہی بیٹے پیارے ہوتے ہیں، پر ماتا بھی کیا کرے، جب اس کے بیٹوں کو ہی جیون پیارا نہیں، وہ اپنے پیر جمانے کی کوشش نہیں کرتے، وہ موت کو بھگاتے نہیں، بلکہ خوش آمدید کہتے ہیں، وہ ان کی طرف بڑھتی چلی آتی ہے، اور پھر یہ چیختے ہیں، چلاتے ہیں، اور موت کے غار میں دھنستے چلے جاتے ہیں۔ ماتا تیرے بیٹے اتنے خود غرض کیوں ہیں جو اپنے بھائیوں کو سہارا نہیں دیتے — شاید وہ جانتے نہیں کہ اس طرح ان کے بازوؤں کا زور گھٹ رہا ہے، ان کے پیروں کی طاقت ختم ہو رہی ہے۔

بنگالی لڑکی نے زور زور سے اپنے پیر جھٹکے، میں نے پھر اس کی طرف دیکھا، پر اب وہ خاموش تھی، شاید وہ اپنا دماغ ہلکا کرنے کے بجائے اپنے پاؤں کا بوجھ ہلکا کر رہی تھی۔ مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔

"بیٹھو گی" میں نے اس سے پوچھا، مگر وہ کچھ نہ بولی شاید سمجھ نہ سکی۔

"بیٹھ جاؤ" آخر کب تک کھڑی رہو گی، میں ایک طرف کو سرک گئی، اور وہ بغیر کچھ بولے بیٹھ گئی۔

"کلکتہ سے آ رہی ہو" دوسری سیٹ پر بیٹھی ہوئی بڑھیا نے جمائی لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں کال کتے سے"

"کال کتے" میری زبان سے بے ساختہ نکلا، مجھے بنگال کا وہ قحط یاد آ گیا، جہاں انسان کتے کی موت مرے، میری نظر بنگالی لڑکی کے نیم عریاں جسم پر پڑی۔ کیا انسان پھر اسی فطری دور میں داخل ہو جائے گا، جہاں اسے پھر کپڑے کی ضرورت نہ پڑے گی، چلو یہ مصیبت تو ختم ہو جائے گی، آج دھوتی چھ روپے ہیں، کل دس روپے ہیں، پرسوں بیس ہیں، اور پھر ملتی ہی نہیں، اب کوئی کیا پہنے —

"سسرال جا رہی ہو" میں چونک پڑی۔

"کون ہے تمہارے ساتھ —" ایک اور نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"میاں ہوگا اور کون ہوتا" جھٹ سے دوسری بولی

"میکے جا رہی ہے تبھی تو بیچاری اتنی چپ چپ سی ہے" اور کسی نے جملہ چسپاں کیا، وہ بت بنی تک رہی تھی، اس نے کسی کی بات کا جواب نہیں دیا، اور جواب بھی کیا دیتی بے سر دیا باتیں — خود ہی پوچھتیں اور خود ہی اس کا جواب بھی تلاش کر لیتیں۔

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا، بیچاری کسی غریب گھر کی معلوم ہوتی تھی، اس کے ساتھ کوئی سامان بھی تو نہ تھا، محض ایک پوٹلی تھی جسے اس نے اپنے پیروں پر رکھ چھوڑا تھا کچھ اس طرح جیسے ساری دنیا کی دولت اسی میں ہے۔

"میرے پاس کوئی سامان نہیں، بس یہ پوٹلی ہے، اس میں ایک پرانی دھوتی ہے"

"اچھا" میری زبان سے غیر ارادی طور پر نکل گیا، میں کچھ پوچھنا چاہتی تھی، لیکن کیا پوچھوں، میں یہ خود بھی نہ جانتی تھی — "آخر یہ اداس کیوں ہے" اس کی آنکھوں میں آنسو تو نہیں، پر حیرانی ضرور تھی جو میرا دماغ بیکار کئے دے رہی تھی۔ "اونھ، ہو گی، کوئی معلوم نہیں کتنی دکھی ہیں، یہ کوئی اکیلی تھوڑا ہی ہے۔ یہ سوچ کر میں اپنے دل کو تسلی دیتی اور پھر باہر کو دیکھنے لگتی۔

"اگلے اسٹیشن پر گاڑی رکی، اور میں نے سر نکال کر باہر دیکھا، گیارہ بجے تھے، سب پر غنودگی طاری تھی، مائیں اونگھ رہی تھیں اور بچوں کے سر ان کے گھٹنوں پر جھول رہے تھے، مجھے بھی کچھ نیند سی آنے لگی، اور میں کھڑکی سے سر ٹیک کر اونگھنے لگی — معاً مجھے اس لڑکی کا خیال آیا، اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی، جیسے وہ میرا پیچھا کر رہی ہے۔ میں دور میدان میں بھاگ رہی تھی، وہ میرے پیچھے پیچھے اور پھر اس نے مجھے پکڑ لیا، لیکن وہ پہلے کی طرح ویسے ہی بیٹھی ہوئی تھی، اس کی آنکھوں میں ذرا بھی نیند کا خمار نہ تھا، جیسے کسی نے اس کی آنکھوں سے نیند چھین لی ہو۔

"تم نے کچھ کھایا نہیں" میں نے یوں ہی بغیر کچھ سوچے سمجھے کہہ دیا۔

"نہیں" اس نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

"کیوں"

"مجھے بھوک نہیں ہے"

"تم کہاں جا رہی ہو"

www.taemeernews.com

"کہیں نہیں" — جیسے غیر ارادی طور پر یہ جملہ اس کی زبان سے نکل گیا ہو — "نہیں نہیں میں ناگپور جاؤں گی — بلکہ اس سے بھی آگے"

"تم کس کے پاس جا رہی ہو؟"

"میں —" ایک عجیب سی ہنسی اس کے ہونٹوں پر آئی — "کسی کے پاس بھی نہیں — میرا کوئی نہیں — کوئی نہیں"۔ اس نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں دہرایا، اور اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے۔

"پھر کیوں جا رہی ہو، کیا کوئی کام ہے؟" میں نے حیرت سے کہا۔ دیکھا تو اس کی آنکھوں میں چلو بھر بھر کے آنسو امنڈ رہے تھے۔

"تم روتی کیوں ہو؟" میں نے پھر پوچھا۔ مگر وہ بجائے جواب دینے کے اور بھی سسک سسک کر رونے لگی، میرے سر میں جیسے انجن چل رہے ہوں، ہزاروں ہوائی جہاز اڑ رہے ہوں، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میرا دماغ پھٹ جائے گا، وہ رو رہی تھی اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔

"بہن —" اس نے میری طرف دیکھا "بھگوان نے ہمیں دکھ جھیلنے ہی کے لئے پیدا کیا ہے"۔ وہ بیٹھے ہوئے آنچل سے آنسو پونچھنے لگی "میں بنگال کے ایک گاؤں میں رہتی تھی، میری ماں بہت غریب ہے، پتاجی کو سورگباش ہوئے دو برس ہو گئے، ہم پانچ بہنیں ہیں جن میں سے دو کا تو بیاہ ہو گیا ہے، وہ پتاجی کے سامنے ہی اپنے گھر بار کی ہو چکی تھیں۔ پتاجی کے بعد ہمارے گھر کی حالت خراب ہو گئی تھی، تو ماں مزدوری کرنے لگی۔ میں بھی ماں کے ساتھ محنت مزدوری کر کے چھوٹے بہن بھائیوں کا پیٹ پالنے لگی۔ پر یہ جیون یوں کب تک بیتتا، ہم جس سماج میں پیدا ہوتے، جانتی ہو — وہ سماج اتنے سے سکھ کو بھی کیسے دیکھ سکتا تھا۔ کتنے دن میں یوں ہی بن بیاہی رہتی۔ ماتا جی کو میرے بیاہ کی دھن لگ گئی، انہوں نے کئی جگہ بات چیت لگائی۔"

وہ یہاں تک کہہ کر چپ ہو گئی اور باہر دیکھنے لگی، دھرتی گھوم رہی تھی آکاش گھوم رہا تھا، پیڑ پودے ناچ رہے تھے، بستان کے ہرے ہرے کھیت آنکھوں کے سامنے اڑ اڑ کر غائب ہو رہے تھے — یہ دھرتی، یہ آکاش یوں ہی گھومتے رہیں گے سماج کے پہیئے کی طرح — نہ جانے ان کو بھی کتنے بیاہ رچانے ہوں گے۔ سماج کے اس رہٹ پر نہ جانے کتنے گیت گائے گئے۔ جو اس دنیا میں دھانوں کے کھیتوں کی طرح لہلہائے اور پھر زمین کی آغوش میں گم ہو گئے، نہ جانے کب تک کے لئے۔

"سن رہی ہو بہن —" اس نے میری طرف دیکھا۔ "ماں نے بڑی کوشش کی پر میرا بیاہ نہ ہو سکا"۔

"کیوں؟" میں گھبرا کر بول اٹھی، وہ میری بات نہ سنتے ہوئے بولتی رہی۔

"کسی نے ایک ہزار مانگا، کسی نے دو ہزار، میری ماں نے اپنی رانی کے لئے غریب سے غریب گھر ڈھونڈا — رانی — تم جانتی ہو، میرا ہی نام ہے"۔ اس نے اپنے اوپر طنز کرتے ہوئے کہا — "ہاں تو کسی نے بھی پانسو سے ایک کوڑی نہ گرائی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے، اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں داب لیا اور باہر دیکھنے لگی، شاید وہ اپنا غم ہلکا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"پر غریب آدمی — پانسو تو کہاں، پانچ کوڑی بھی ہونی مشکل ہے، اگر کوئی تھوڑے بہت مانگتا تو ماں اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ کاٹ کر کسی نہ کسی طرح پورا کر ہی دیتی — بہن کیا بتاؤں کہ وہ کتنی دکھی رہنے لگی، رات رات بھر اس کی آنکھ نہ لگتی ہر وقت روتی رہتی، میں نے کتنا ہی سمجھایا، پر اس کی آنکھ کا آنسو نہ تھمتا۔ — سارا سنسار سوتا پر وہ اپنی کھاٹ پر پڑی آسمان تکتی، بھگوان! تو نے رانی کو پیدا ہی کیوں کیا تھا جب اس کی تقدیر ایسی کھوٹی بنائی تھی، اسی طرح کئی مہینے گذر گئے۔ ماں بالکل دیوانوں کی طرح ہو گئی، تندرستی خراب ہو گئی، دن بدن سوکھنے لگی۔ میں کہتی تھی کہ ماں مت روؤ، میں شادی نہیں کروں گی، اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پاگلوں کی طرح مجھے دیکھتی — میری رانی میں تیرا بیاہ کروں گی، چاہے کہیں سے بھی روپیہ لاؤں، کنواری بچی پہ دس آدمی انگلی اٹھائیں گے بیٹی! — انگلی اٹھائیں گے! ہنہ تو میں پوچھتی ہوں ماں! اس سماج پر لوگ کیوں نہیں انگلی اٹھاتے، جس نے ہمارا جیون تباہ کر دیا، اس بھگوان پر لوگ انگلی کیوں نہیں اٹھاتے، جس نے تم کو پانچ بیٹیاں دیں، اور وہ سسک سسک کر رونے لگی، انسان انسان کی کھال

نوچتے ہیں، یہ بھی جیون کی بازی ہے، دھن والے اس بازی کو جیتتے ہیں اور ہم — نہ جانے کب کے ہار چکے — یہ پیسہ کا کھیل ہے جس کو غریب دور سے کھڑے ہوکر دیکھتا ہے، اور ہات ملتا ہے۔

پھر وہ خاموش ہوگئی، اور دیر تک خاموش رہی، جیسے اپنے رنج وغم کو اپنی خاموشی میں تحلیل کر رہی تھی یا جیسے اس کا غم کچھ ہلکا ہوگیا ہو۔

"تو پھر کیا ہوا" میری آواز سے وہ چونک پڑی۔

"کیا ہوا — ؟ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں یہاں سے چلی جاؤں گی کسی دوسری جگہ، جہاں مجھے کوئی نہ جانتا ہو، میں سنسار کے اس اندھیرے میں اپنے دن یوں ہی کاٹ دوں گی، میری ماں کو تو ایک بڑی مصیبت سے نجات مل جائے گی، پھر اس کو میرے بیاہ کی فکر نہ رہے گی — پر ابھی تو دو بیٹیاں اور ہیں — ہے بھگوان!

وہ آگے کچھ نہ بول سکی، اس کی آنکھیں برسنے لگیں، اس نے اپنے دانتوں کو بھینچ لیا۔

کھرر — کھرر — گاڑی رکی، ناگپور کا اسٹیشن آگیا۔

— میں نے قلی کو آواز دی، اور اپنا سامان اتروانے لگی — جتنی عورتیں اتری تھیں، اس سے زیادہ تو اسی میں بھر گئیں۔ بمشکل تمام میں ڈبہ سے اتری، معاً مجھے بنگالی لڑکی کا خیال آیا اور میں نے رانی — رانی کہہ کر آواز دی، شاید وہ اتر چکی تھی — میں نے اسٹیشن پر ادھر ادھر نظر ڈالی۔

"بھگوان کے لئے مجھے چھوڑ دو، میں غریب ہوں" میں نے مڑ کر دیکھا۔ چند سپاہی رانی کو پکڑے ہوئے جا رہے تھے، اس کے ہاتھ میں وہ پوٹلی بھی نہ تھی، اس کی دھوتی پھٹ چکی تھی، سماج کے تار و پود کی طرح جس میں سے انسانیت جھانک رہی تھی — ہاں ابھی انسان انسانیت کی منزل سے بہت پیچھے ہے۔

اونھ، ہوگی کوئی آوارہ، کسی صاحب نے لاپرواہی سے کہا۔

"رانی" میں دوبارہ چلائی، اس کو چھوڑ دو، یہ آوارہ نہیں۔

"بیگم صاحب آپ اپنے کام سے جائیے، یہاں تو یہ روز کے واقعات ہیں۔"

میری آنکھیں پھٹنے لگیں، سر گھوم رہا تھا، زمین پیروں تلے ناچ رہی تھی، مجھے کچھ نہیں سجھائی دے رہا تھا، ہر طرف دھواں ہی دھواں جیسے دھرتی ماتا کے سینے سے آگ نکل رہی ہو۔

رانی جا چکی تھی، آندھی اور طوفانوں کے شور میں اب بھی اس کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ گاڑی نے سیٹی دی، اسٹیشن پر مسافروں میں بھگدڑ مچ گئی۔ ایک طرف سے آواز آئی — "ہندو پانی" دوسری طرف سے کوئی چلایا "مسلمان چائے"۔ سامنے اسٹیشن پر ایک عورت کا اسٹیچو رکھا ہوا تھا، جو ایک حسین زرق برق ساری میں ملبوس تھا، اس کا جسم ڈھکا ہوا تھا، یہ مجسمہ شیشے کی الماری میں رکھا ہوا تھا، یہ الماری کتنی صاف تھی، شاید اسی لئے کہ اس میں سانس لینے کی قوت نہ تھی، ورنہ اس دنیا میں کوئی ذی حیات اتنا بے داغ رہ سکتا ہے، ہمارا سماج اس مٹی کے بت کا کچھ نہ بگاڑ سکتا تھا، اس لئے کہ وہ بے حس تھا، اس میں جان نہ تھی ورنہ پانچ گز کی ساری کہیں اتنی آسانی سے ملتی ہے — مجھے محسوس ہوا جیسے یہ ساری دنیا رانی ہے، کسی کے جسم پر کپڑا نہیں، ہر ایک غریب ہے، ہر ایک بھوکا ہے، ہر ایک رانی ہے، کاش دنیا کی ہر رانی مٹی کا ایک بت ہوتی، جس کے جسم پر ایک خوبصورت ساری تو ہوتی۔

"آپا — تم کو کیا ہوگیا — میں نے گھبرا کر دیکھا میرا بھائی مجھے سنبھالے کھڑا تھا۔

"آپا — یہ کون تھی؟"

"کون تھی — مٹی کا اسٹیچو — نہیں ایک زندہ لڑکی۔

ہچکیاں

صدیقہ بیگم سیوہاروی کے افسانوں کا مجموعہ

قیمت تین روپے (۳ ر)

پتہ

نگارستان ایجنسی، اردو بازار، دلی

www.taemeernews.com

ترقی پسندی سے پہلے

بہار کوٹی

جو واقعہ سامنے سے آواز دے کر کاغذ کے صفحات پر پھیل جائے وہ مکمل افسانہ نہیں ہے۔ افسانہ نام ہے گردوپیش کے ان واقعات کی صحیح اور مکمل تصویر کشی کا جو دل میں چبھ کر رہ جائیں اور عرصے تک دل ہی میں گھٹتے رہیں۔ کہانی کہانی تو ہو سکتی ہے مگر افسانہ نہیں۔ افسانے کا دائرہ وسیع ہے اور بعید۔

جس طرح ہم ہر واقعہ کو افسانوی لباس وحیات نہیں دے سکتے اسی طرح ہر افسانہ کو کہانی بنانا یا سمجھنا خفیف الحرکاتی ہے۔ بے شک اضافہ بھی "غریب داستان" کے لئے ادھر اُدھر کی باتوں کا متقضی ہونا بھی مگر محض ادھر اُدھر کی باتوں کو افسانہ سمجھ لینا مناسب نہیں)۔ میں نے مناسب کہا ہے اس کو افسانوی سقم نہیں بتایا۔ کیونکہ ہماری افسانہ نگاری کا مفہوم ابھی اور وسیع ہو گا۔ اگر یہ وسعت رجعت سے وابستہ ہو گئی تو بھی میں "ابطال قول" کی ذلت سے بچا رہوں گا۔

ہر ملک میں افسانہ کچھ اس قدر مختلف آوازوں میں بولتا ہے کہ ہم اس کے امکانات متعین نہیں کر سکتے۔ فرانس اور روس میں اس کو انقلابی حربہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور ایشیا بالخصوص ہندوستان میں اب تک اس کو محض تفریحی چیز سمجھا گیا ہے مگر اب وہ یہاں بھی "احتقال رندانہ" کا جامہ چاک کر کے میدان حرب و ضرب کی طرف آ رہا ہے۔

یہاں ایک متنازعہ فیہ مسئلہ کے چھڑ جانے کا خوف ہے لیکن کب تک اس خوف سے سہما جا سکتا ہے۔ کہنا پڑتا ہے کہ ادب ادب کی خاطر یا ادب برائے زندگی کا مسئلہ اب تک تشفی بخش حد تک طے نہیں ہو سکا۔ اگر میں فی الحال اس تشنہ موضوع پر خامہ فرسائی کرتا ہوں تو اندیشہ ہے زیر بحث مقالہ تشنہ رہ جائیگا پھر بھی صحافتی ذمہ داری کے پیش نظر یہ ضرور کہوں گا کہ ادب تمام تر چیخ ہی چیخ نہیں ہے بلکہ قہقہہ بھی ہے — کارزار حیات سے تھک کر نکلنے کے بعد ہمیں ایک سبک ادب کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور جب تعیش انگیز محفل میں بیٹھ کر ہم ہلکی پھلکی باتوں کے عادی ہونے لگتے ہیں اُس وقت کسی "تنبیہ الغافلین" کی ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔ یہی "تنبیہ الغافلین" دراصل حقیقت ادب کا ترجمان ہے۔ اس اعتبار سے ادب دو شعبوں پر تقسیم ہو جاتا ہے حالانکہ سنا یہ جاتا ہے کہ اس کا کیرکٹر ایک ہے اور صرف ایک۔

اس کا کیرکٹر صرف ایک ہے یا دو یا اس سے زیادہ اس کا صحیح جواب ہمارے مختلف النوع امیال وعواطف اور واردات حیات ہی دے سکتے ہیں۔ یہاں شاید آپ میرے قلم پر گریز کا الزام عائد کریں۔ مگر باور کیجئے میں پوری ایمانداری کے ساتھ جمے رہنے کی کوشش کروں گا۔ تھوڑا سا صدمہ برداشت کر کے تسلیم ہے کہ ادب اپنا ایک مستقل کیرکٹر رکھتا ہے مگر یہ مشکل یہ ہے کہ اس کے کرداروں کی تشکیل وتعمیر میں جتنا ادبا کا ہاتھ ہے اس سے کہیں زیادہ اس کے مطالعہ کنندگان کا ہے۔ اور ان دونوں گروہوں کا جو نتیجہ بھی زندہ رہ جائے وہی دراصل حقیقی ادب ہے۔ دماغ پر زور دیجئے اور سوچئے تو کہیں اس کا سرا آپ کے ہاتھ آتا ہے آپ کی مُبہم آواز سننے سے قبل مجھے یہ کہتے گزر جانے دیجئے کہ میں آپ کے فکر ونظر کے لئے ایک اچھا مواد دے چلا ہوں کیا اب بھی مجھ پر گریز وفرار کا الزام عائد کیا جائیگا۔

اس موضوع کی طرف آنے سے قبل ایک بات اور ظاہر کر دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ آپ نے "محفل حال" میں داغ کی غزلوں پر بھی بعض مدعیان تصوف کو حال کھیلتے دیکھا ہوگا یہ داغ کے تغزل کا اقتضا نہیں بلکہ صاحبِ حال کا اپنا ذاتی وجدان ہے۔ اسی طرح اگر قصہ ممتاز یا طوطا مینا پڑھ کر کوئی اللہ کا بندہ نعرہ بلند کر دے تو اس کا تنہا ذمہ دار وہ ہے۔ دیکھئے جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں ادب اپنے پڑھنے والوں کا کس قدر محتاج ہے اور اس کا اپنا کوئی کیرکٹر رکھنا اس کے لئے کس قدر دشوار ہے۔ اس لئے اب یہ فیصلہ کہ افسانہ زندگی کا عکاس ہے یا اس کو حیات کی عکاسی کرنی چاہئے یا نہیں آپ کے

www.taemeernews.com

اختیار میں ہے ——— یہ میرا موضوع نہیں ہیں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کچھ عرصہ قبل ہمارے افسانوں کا کیا رنگ تھا اور اب کیا ہے۔

میرے افسانوی دور کی ابتدا نیاز فتحپوری، سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم، پریم چند، ل۔ احمد اور خلیقی دہلوی کے زمانے سے ہوتی ہے۔ حالی اپنا مسدس سنا کر صدیوں کی جامد و تھوڑی دیر کے لئے جھنجوڑ کر رخصت ہو چکے ہیں۔ ... قوم اصرح وزاری کے عملی پروگرام کے بعد پھر "اعتدال" کی طرف آ چکی ہے واویز کائی پر ایک کنکر پڑا تھا جس سے چند لمحات کے لئے ... سوراخ ہو گیا تھا۔ سطح آب پھر بتدریج برابر ہو چکی ہے۔ ... کا مرغ ترنم چہک رہا ہے۔ تاثیر کے مقابلہ میں لوگ ترنم کی لے پر وجد کناں ہیں اور سر دھن رہے ہیں۔ اقبال فلسفی بھی سمجھے جا رہے ہیں۔ ہماری شاعری پورے انہماک کے ساتھ "استنذار" کا سامان بہم پہنچا رہی ہے ... ہمارے اس دور کے افسانوں کے حصہ میں بھی آئی چنانچہ نیاز کیوپڈ اور سائکی کے پیچھے پڑ گئے اور انہیں ایسا رگیدا کہ اعتدال پسند طبقہ اکتا گیا۔

ل۔ احمد جمالی کو عشق و محبت کی آنچ دیتے رہے مگر چونکہ اسلوب میں عذوبت اور بیان میں براعت تھی۔ چمک گئے، اس کے بعد وہ لالہ رخ کے کر اردو کے بازار میں آئے۔ کہانی انگریزی میں تھی مگر چونکہ پس منظر ایشیائی تھا دلوں میں اترتی چلی گئی۔ ترجمہ کی کامیابی نے اور غضب ڈھا دیا۔ ل۔ احمد کا اپنا اچھوتا طرز بیان۔ جدید تراکیب۔ بدیع اسلوب نگارش یہ ایسی چیزیں تھیں کہ لالہ رخ کو اس زمانے کے کلاسیکل لٹریچر میں شمار کرنا چاہئے۔ اس کتاب میں ل۔ احمد نے انشائے عالیہ کا وہ نمونہ پیش کیا تھا کہ اُس زمانے کے لکھنے والے ابو الکلام آزاد کی ساحرانہ طرز تحریر کو نظر انداز کر کے ان کے اسلوب نگارش کا تتبع کرنے لگے۔

ہمارا ادب اتنی سرعت سے ارتقائی منازل طے کرتا رہا کہ یہی کتاب (لالہ رخ) جس نے اردو ادب میں تہلکہ ڈال دیا تھا چند سال بعد دلی سے دوبارہ شائع ہونے پر قبول عام حاصل کرنے میں ناکامیاب رہی اور ... میں پڑی ... رہنے کے خطرہ سے بال بال بچی۔

نیاز مخصوص طرز نگارش کے مالک ہیں جو بڑی حد تک انھیں کی ساختہ و پرداختہ ہے اور یہی وجہ تھی کہ ان کا اس زمانہ کا ادب خوب خوب چمکا۔ پڑھنے والے ان کے افسانوں کے منتظر رہتے تھے۔ سائکی کے بہت کچھ گھس چکنے کے باوجود بھی لوگ اس کو دوسرے رنگ و لباس میں دیکھنے کے لئے بیچین رہا کرتے تھے۔ مگر دفعتہً نیاز صاحب کا قلم ٹھنڈا ہو اور حقیقت نگاری کی مستحسن سعی میں "شہاب کی سرگذشت" جیسی پر از تصنع کتاب تک پہنچتے پہنچتے گھس گیا۔ اس کے بعد سے نیاز صاحب کے افسانوں کا رنگ پھیکا پڑتا گیا۔ اور وہ قلم جو کچھ عرصے قبل حسن و محبت کی دل میں گھر کر لینے والی تصویریں کھینچا کرتا تھا انتقادیات کے لئے وقف ہو کر رہ گیا اور اس کی زد سے نہ شاعر بچا نہ ادیب نہ ملک بچا نہ مذہب۔

نیاز و ل۔ احمد کے ساتھ ساتھ پریم چند، رشید احمد صدیقی، خلیقی دہلوی۔ سلطان حیدر جوش۔ میجر عطار الرحمٰن، سجاد حیدر یلدرم بہترین ادب پیش کر رہے تھے اور ان میں سے ہر ادیب اپنی لائن میں منفرد تھا۔ ل۔ احمد اور نیاز کا ادب افسانوی میں اُس زمانہ کا کامیاب ترین ادب تھا۔ جو زبان دانشا، طرز نگارش و براعت اسلوب کے باوجود بھی افسانوی تیکنک اور زندگی کی ترجمانی سے قاصر تھا۔ یہی بات خلیقی دہلوی عطار الرحمٰن اور سجاد حیدر یلدرم میں تھی۔ سجاد کے وہ افسانے جو ترکی سے ماخوذ ہیں۔

تکنک سے تو خالی نہ ہوتے تھے مگر روح ان میں بھی نہ تھی۔ ل۔ احمد۔ نیاز۔ خلیقی دہلوی۔ میجر عطار الرحمٰن، سجاد حیدر یلدرم نے بڑے اچھے افسانے پیش کئے مگر موجودہ اصطلاح کی رو سے وہ صرف کہانیاں تھیں ان میں ادب نہ تھا۔ یہ زندگی کے ترجمان نہ تھے۔ ——— اگر آپ ادب کو زندگی کا ترجمان مانتے ہیں۔

ان میں رشید احمد صدیقی اور سلطان حیدر جوش بالکل نئی قسم کی چیز پیش کر رہے تھے سلطان حیدر جس چیز کو سطحی

نظر سے دیکھتے تھے رشید اُن پر بڑی عمیق نظر ڈالتے اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ جس سچی اور جیتی جاگتی طنز نگاری کی مثال رشید نے پیش کی ہے وہ ہندوستان تو درکنار یورپ کے کسی مصنف میں نہیں ملتی۔ لوگ بڑے فخر کے ساتھ مارک سوئن اور پی۔جی ووڈ ہاؤس وغیرہ کو یورپ کے بہترین مزاح نگار کہتے ہیں مگر وہ رشید کے پاسنگ بھی نہیں ـــــ

اس دور کے بعد یعنی جب نیاز، ل، احمد، سجاد حیدر وغیرہ بہترین طرز تحریر میں ڈوبے ہوئے لیکن حقیقت نگاری سے عاری افسانے پیش کر رہے تھے پریم چند اپنے افسانوں میں نفسیاتی تحلیل اور مقامی پس منظر بھر رہے تھے ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۶ء تک کے اس افسانوی دور میں اگر رشید "زندہ جاوید اور فکر انگیز افسانے اور مضامین پیش کر رہے تھے تو پریم چند افسانوی ادب کو امتیازی رنگ بخش رہے تھے۔ پریم چند کو اردو کا سب سے پہلا ترقی یافتہ (ترقی پسند نہیں) افسانہ نگار کہنا چاہیئے جنہوں نے شکوہ الفاظ اور رنگین نگاری کی خوش آیند مگر سطحی فضا سے بلند ہوکر سب سے پہلے حقیقت کا خون نچوڑا۔ انہوں نے افسانہ کو حیات انسانیہ کا ایک جزو بلکہ زندگی کی زبان بنا کر ترقی کی راہ کھولی۔

پریم چند کے صحیح متبع ڈاکٹر اعظم کریوی ہیں۔ ان کے یہاں افسانہ رنگین نگاری کا نام نہ تھا بلکہ مقامی زندگیوں کے منتشر اجزا کو زبان گویا بخش کر افسانہ نگاری کا حق ادا کرنا تھا۔ ان دونوں حضرت کی صحیح عکاسی اپنی جگہ کام کر رہی تھی لیکن افسانہ بیانی کے لئے کچھ اور وسعت مانگ رہا تھا ــــ مقامی زندگی کی تصویر کشی سے لوگ روشناس ہو چکے تھے۔ لیکن اجتماعی زندگی کی عکاسی کا بازار ابھی بند تھا۔

مندرجہ بالا ادبار کے دور کے عین متصل چند افسانہ نگار اور بھی نظر آتے ہیں ان میں سے بعض چشمک برق کی طرح نمودار ہوکر فوراً ہی غائب ہوگئے۔ مثلاً فضائی ٹونکی اور محشر عابدی بعض کچھ عرصے تک افق افسانہ نگاری پر تھرتھراتے رہے مثلاً وحید گیلانی شہاب مالیر کوٹلوی۔ تمکین کاظمی۔ سعید۔ ذوقی۔ مجنوں گورکھپوری جلیل قدوائی۔ مظہر انصاری۔ بادشاہ حسین۔ حامد اللہ افسر، کاظم امام اکبرآبادی۔ سدرشن۔ ملا رموزی۔ ان میں سے آخر کے تین افسانہ نگاروں نے افسانوی ادب میں کسی قدر رنگ تحریر کو بدل دیا تھا۔ اور گرد و پیش سے باخبر ہو کر لکھنا شروع کیا تھا باقی افسانہ نگار سنتِ دیرینہ پر کاربند رہے۔ یعنی افسانۂ محبت سناتے رہے۔ اس دور کے افسانہ نگاروں کا زمانہ بہت مختصر ہے۔ مجنوں دورِ اوّل سے پیوست ہوکر دورِ دوم تک چلے آئے تھے۔ ایم۔ ایم۔ اسلم جب سے اب تک بہت کچھ لکھتے رہے لیکن اُن کی کہانیاں کبھی افسانہ نہ بن سکیں، ان دونوں ادوار میں سے پہلے دور میں افسانہ تقریباً رنگ تحریر اور زور بیان پر ختم ہو گیا تھا دوسرے دور میں مقامی رنگ افسانہ میں شامل ہوا اس کے ساتھ پلاٹ اور نفسیات کی "تحریکیں" افسانوں میں آگئیں مگر افسانہ اب بھی من حیث المجموع حکایت محبت ہی رہا۔ اس میں حقیقت پیدا ہو چلی تھی لیکن اتنی جتنی دس سیر پانی میں ایک دو تولہ رنگ۔

دوسرا دور ابھی پورے طور پر ختم نہیں ہوا تھا۔ یعنی ۱۹۲۶ء کے اوائل ہی میں تیسرے دور کی تشکیل کے لئے نوجوان افسانہ نگاروں کا ایک مختصر سا گروہ پیدا ہو گیا۔ ان جوانوں کا مطالعہ اچھا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ زمانہ بھی ان کو بڑا سازگار ملا۔ کیونکہ اس زمانہ میں اردو کے رسائل کثرت سے نکلنے لگے تھے اور نکلتے جا رہے تھے۔

اس دور میں سب سے پہلے ہماری نظر رفیعی اجمیری مرحوم پر پڑتی ہے۔ یہ تیسرے دور کا پہلا افسانہ نگار بھی اب تک پہلے دور کے رنگ سے متاثر تھا۔ ان کے تمام ابتدائی افسانے نیاز اور ل احمد کے رنگ کے مماثل ہیں لیکن آگے چل کر رفیعی نے اپنا جدا رنگ پیدا کر لیا جو صرف انہیں کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا تھا۔ حلاوت بیان، اسلوب نگارش اور ہلکے مزاح کی چاشنی رفیعی کے افسانوں کی جان ہیں۔ ان کے افسانوں میں زندگی ہے اور ایسی آنچ جو مستقبل کے یلغار میں بھی ماند نہ پڑے گی ـــــ انہوں نے اپنے افسانوں میں تخلیقی مواد بھی پیش کیا ہے اور یہ مواد ان کے آخری زمانے کے بہترین افسانوں "محبت کا بلاوا"، "حسن مصنّی" اور "پتنگ کی جنگ" میں ملتا ہے۔ ان افسانوں میں پہلی بار اصل حقیقت نگاری کی طرف ان کا قلم بڑھا ہے

اسی زمانے میں دو اور افسانہ نگاروں کی ندرت بیان اور حقائق فہمی ہماری توجہ کو جذب کرتی ہیں۔ ان میں سے پہلے قیسی رامپوری اور دوسرے علی عباس حسینی ہیں۔ قیسی، علی عباس حسینی سے کم عمر مگر افسانہ نگاری میں ان کے پیش رو ہیں۔ رفیعی کی طرح قیسی بھی شروع میں دور اوّل کے مقلد نظر آتے ہیں لیکن وہ رفیعی سے بھی زیادہ سرعت کے ساتھ اس ڈگر سے ہٹ کر اپنے لئے ایک نئی راہ نکال لیتے ہیں۔

قیسی نے بھی شروع میں ہم کو محبت کی کہانیاں سنائیں اور خوب جی کھول کر لیکن رفیعی کے برعکس ان کی کہانیاں حزینہ ہونے کے باعث زیادہ دلدوز ہیں اور تحزن طرب کے مقابلہ میں ہوتا بھی زیادہ موثر ہے۔ قیسی کے وہ افسانے جن میں حزن و نشاط کی آمیزش ہے عجیب چیز بن گئے ہیں انھوں نے اس امتزاج سے ایک تیسری قوت پیدا کی ہے جس کو شاید "فکری بالیدگی" سے موسوم کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہاں انہوں نے زندگی کو سامنے رکھ کر اس کا بلند نظریہ پیش کیا ہے رکیک اور بیشتر باقاعدہ کرداروں میں سے اس افسانہ نگار نے ایسے بلند نظریات نکالے ہیں جو اسی کا حصہ ہیں۔

تیسرے دور میں کردار نگاری اور تکنک کی ابتدا قیسی کے افسانوں سے ہوتی ہے۔ ان کا اسلوب نگارش شگفتہ اور بیان جاندار ہے۔ قیسی برمحل تراکیب اور الفاظ صرف کرنے میں منفرد ہیں۔ غم و غصہ اور اظہار تنفر کے موقع پر ان کا طرز بیان آتشیں اور محبت و نرمی کے محل پر ہلکا اور شیریں ہو جاتا ہے۔

ابھی تیسرے دور کے متعدد افسانہ نگار باقی ہیں لیکن ان کی افسانوی حیات پر اضمحلال و جمود طاری ہے۔ مگر قیسی زندہ ہیں اور اس وقت بھی جبکہ موجودہ دور کے افسانہ نگار بھی ایک ایک کر کے ختم ہونے جا رہے ہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے قیسی کے افسانوں کی ابتدا روایات محبت سے ہوتی ہے مگر وہ بہت جلد حقیقت آشنا ہو جاتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ اس ترقی پسندی کے دور میں بھی وہ سب سے زیادہ کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۰ء تک وہ نفسیات فلسفۂ حیات اور سماج کے مسائل کو پیش کرتے رہے اور ۱۹۴۰ء سے اب تک ... زندگی کا شاید کوئی اہم شعبہ نہیں بچا جس کی انھوں نے ترجمانی نہ کی ہو ... ایسا ہی ادیب زندگیٔ دوام حاصل کر سکتا ہے۔

افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ... ناول نویس بھی ہیں۔ کشمکش حیات کی جن پیچیدہ اور ... کے افسانے متحمل نہیں ہو سکتے وہ انھیں ... ناول ... قیسی کا نظریۂ حیات ان کے سب سے پہلے افسانہ ... (مطبوعہ ۱۹۲۹ء) ہی سے پھوٹ نکلتا ہے جو ... "یہ تباہ کن محبت"، "نعمانی"، "کارزار حیات" سے گزرتا ہوا "تبدیلی"، "دھبہ"، "دو موتیں" تک کھلتا چلا آتا ہے اور پھر "دھوپ"، "خطا"، "اپاہج" اور "خیانت" وغیرہ ... جذب ہو جاتا ہے۔ قیسی کے شاید دو سال بعد ہی علی عباس حسینی افسانوی جنم لیتے ہیں اور ان کا پہلا یا شاید دوسرا افسانہ ... "ادارتی نوٹ" کے ساتھ نکلتا ہے اور یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ایک اچھے خاصے افسانے کو ادارتی نوٹ کے ذریعہ دھندلا کیا جا رہا ہے۔

علی عباس حسینی بھی بڑی رقت سے افسانہ محبت سناتے ہیں اور وہ بھی رفیعی کی طرح تحزن سے بیزار اور طرب پسند واقع ہوئے ہیں۔ ان کا افسانہ "باسی پھول" محبت کی بہترین کہانی ہے جسے یقیناً حزینہ ہونا چاہیئے تھا مگر ان کی طرب پسندی نے آرٹ کا خون کرنا تو گوارا کر لیا لیکن نشاط کا دامن نہ چھوڑا۔

منشی پریم چند کی طرح وہ بھی بتدریج مقامی رنگ کی طرف مڑتے گئے اور مقامی زنجیریں جو منشی جی اور ڈاکٹر اعظم سے بچ گئی تھیں انھوں نے سنبھال لیں۔ یہاں انہوں نے محبت کو نفسیات سے ضرور متعارف کیا لیکن حیات کی عکاسی کی طرف ذرا کم متوجہ ہوئے حالانکہ اس سے شدید طور پر متاثر ضرور نظر آتے ہیں۔ عرصے سے خاموش ہیں اور اس طویل خاموشی کے بعد اب جو وہ قلم سنبھالیں گے تو ناممکن ہے ترجمان زندگی بن کر نہ آئیں۔

تیسرے دور کے ان دو افسانہ نگاروں کے تھوڑے ہی عرصہ بعد صادق الخیری اور مرزا عظیم بیگ چغتائی کے نام سامنے آتے ہیں ان سے کچھ سینیر شوکت تھانوی ہیں۔ صادق ... اور

صداقت خیال شروع ہی سے ہے اور آج بھی۔ میں اِن کے ابتدائی افسانوں میں رفیعی اور قیسی کا رنگ دیکھتا ہوں۔ بعد میں وہ بھی مطلق العنان ہوگئے اور اس خود مختاری کا شاید سب سے پہلا فائدہ انہوں نے "بھابھی" سے اٹھایا۔

یہ اب تک کی دبی ہوئی آزاد بیانی میں جنسیت کا ہیجان تھا اور اس خوش ذائقہ خربزے کو دیکھ کر دوسرے خربزوں نے بھی رنگ بدلنا شروع کیا۔

پچھلے دور اور موجودہ دور کے افسانہ نگاروں میں صرف قیسی اور صادق ہی قدر مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ صادق کہیں آزاد ہیں اور کہیں پابند لیکن قیسی کا مسلک واحد ہے۔

صادق جہاں زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں وہاں ان کے یہاں انان اور طرز تحریر میں زور پیدا ہو جاتا ہے۔ عظیم بیگ مرحوم نے جہاں اعلیٰ درجہ کا ذوقِ مزاح پایا تھا وہاں ان کا ادب زبان کی لغزشوں سے پاک نہیں۔ اُن کا رجحان بھی باغیانہ تھا گر جو کچھ کہتے تھے لاجواب کہتے تھے۔ ان کا مزاح زندہ رہنے والی چیز ہے۔ حیرت اس پر ہے کہ یہ ہنسنے ہنسانے والا افسانہ نگار ٹریجڈی کا بھی ماسٹر تھا۔ ان کا افسانہ "مہارانی کا خواب" ایک لاجواب ٹریجڈی ہے۔

عظیم بیگ نے حیات اجتماعیہ کے بجائے خانگی زندگی پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس میں شوکت بھی ان کے ہمنوا ہیں۔ ان دونوں نے زیادہ زورِ قلم مزاح پر ہی صرف کیا ہے۔

عظیم بیگ سے ذرا پہلے حنیف ہاشمی مرحوم محبت کے بڑے دردناک افسانے سنا گئے ہیں انہیں زندہ رہنا چاہئے تھا مگر افسوس ان کے ساتھ ان کے افسانے بھی مر گئے۔

اس کے بعد وہ دور شروع ہوتا ہے جس میں افسانہ نگاری کے متعدد پلیٹ فارم پر پچھلے تین چار سال کے اندر پیدا ہونے والے افسانہ نگاروں نے "ترقی پسندی" کا لیبل لگا کر ہمیں خوشی کے ساتھ ڈرامہ کا انجام دیکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔

پچھتاؤگی!

خمار لکھنوی

تم فراموش کروگی مجھے پچھتاؤگی!

پھر کوئی عشق کا منشا نہ کہے گا تم کو
پھر کوئی حُسنِ سراپا نہ کہے گا تم کو
پھر کوئی جانِ تمنا نہ کہے گا تم کو
بے تکلف کوئی اپنا نہ کہے گا تم کو
کون آئے گا محبت کی کہانی کہنے
کون آئے گا تمہیں پھولوں کی رانی کہنے
کس کی رنگین بیانی کی قسم کھاؤگی
تم فراموش کروگی مجھے پچھتاؤگی!

پھر اُفق کے کبھی اُس پار نہ جائے گا کوئی
کہکشاں توڑ کے ہر روز نہ لائے گا کوئی
ماہ و پرویں کے فسانے نہ سنائیگا کوئی
تم حسیں ہو نہ یہ احساس دلائیگا کوئی
اپنی آنکھیں نہ بچھائے گا کوئی راہوں میں
چاند تارے نہ بکھیرے گا کوئی قدموں میں
دیکھ لینا مری ہر جگہ کمی پاؤگی
تم فراموش کروگی مجھے پچھتاؤگی!

مُسکراتی ہوئی کلیوں کی نزاکت تم ہو
جس نے دیکھا نہیں غم ایسی مسرت تم ہو
حُسن ہی حُسن لطافت ہی لطافت تم ہو
مجھ سے پوچھو "میری دنیا میری جنت تم ہو"
کون یہ رازِ محبت تمہیں سمجھائے گا
تم کو خود اپنی جوانی پہ ترس آئے گا
جب محبت کی نگاہوں کو ترس جاؤگی
تم فراموش کروگی مجھے پچھتاؤگی!

کہکشاں } رفیعی اجمیری کے افسانوں کا مجموعہ
قیمت تین روپے۔
نگارستان ایجنسی اردو بازار دلّی

www.taemeernews.com

کھسی میں ہنسی

دیش

والد صاحب کے ریٹائر ہونے میں ابھی ۴-۵ سال باقی تھے میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا انہیں شملہ میں ہی دیکھا اور انہیں کے ساتھ میں بھی شملہ میں ہی رہی۔ اب ایکا ایک ان کا تبادلہ دہلی کا ہو گیا۔ کوئی نیا محکمہ بنا تھا! اُس کے افسر بنا کر والد صاحب بلائے جا رہے تھے۔ قاعدہ کی بات ہے نئی جگہ کا شوق ہوتا ہے۔ لاکھ شملہ چھوٹنے کا افسوس سہی۔ رہ رہ کے خیال آتا تھا کہ دہلی میں یہ کیل سے ڈھکی ہوئے ڈھلانے۔ دھوپ چھاؤں کے یہ سہانے منظر۔ برسات کا راگ گاتی ہوئی ننھی ننھی ندیاں۔ وہاں کہاں نصیب لیکن ادھر دہلی کی پرانی عمارتیں، سیرگاہیں۔ کناٹ پیلس کی رول چول یہ سب چیزیں دل میں ایک امنگ سی پیدا کر رہی تھیں۔

گرمیوں کا موسم ختم ہو چکا تھا۔ اور دہلی میں گلابی جاڑے کا راج تھا جب ہم دہلی پہنچے۔ شہر سے باہر نئی دہلی کے بھی تقریباً اخیر میں پرتھوی راج روڈ پر ایک بنگلہ ہمیں رہنے کے لئے ملا تھا۔ اور اتفاق دیکھئے کہ برابر کے بنگلے میں ہی والد صاحب کے ایک پرانے دوست رائے صاحب ہرشچندر رہتے تھے۔ والد صاحب کو اس بات کی بڑی خوشی تھی۔ اور سچ بھی یہ ہے۔ پردیس میں کوئی اپنا سا مل جائے تو بڑی ڈھارس سی بندھی رہتی ہے۔ انسان کی دوا انسان ہے۔

کئی روز تو ہمیں اپنا سامان ٹھیک ٹھاک کرنے میں لگ گئے۔ نیا گھر جانا تھا۔ والد صاحب تو دفتر چلے جاتے اور میں دن بھر سامان کھولنے اور رکھنے میں لگی رہتی۔ باہر نکلنا یا کہیں آنا جانا ہو ہی نہ سکا۔ ہمارے پڑوسی رائے صاحب عموماً شام کو والد صاحب کے پاس آ بیٹھتے تھے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھتے بات چیت کر کے چلے جاتے جس روز والد صاحب دفتر سے جلد آ جاتے تو چائے پر رائے صاحب کو بھی بلا لیا جاتا۔ رائے صاحب کہا کرتے تھے کہ اب تو آپ کو دہلی آئے کتنے ہی روز ہو گئے ہیں۔ ایک دن ہماری طرف بھی آیئے اور والد صاحب یہی کہہ کر ٹال جاتے کہ شمن ابھی گھر جما رہی ہے۔ اُسے ذرا دم مارنے کی فرصت ملے تو کہیں آئیں جائیں۔ اور پھر مجھے فرصت مل ہی گئی' اور اتوار کا دن مقرر ہوا۔

اتوار کو دو بجے دوپہر سے ہی رائے صاحب کا نوکر بار بار بلانے کے لئے آنے لگا۔ کھانا کھا کر میں اور والد صاحب دونوں ان کی کوٹھی میں گئے۔ بڑی شاندار کوٹھی تھی۔ ویسے تو ہماری کوٹھی سے ذرا ہی بڑی تھی مگر سجاوٹ غضب کی تھی۔ فرنیچر۔ قالین اور تصویروں وغیرہ پر خوب روپیہ خرچ کیا گیا تھا۔ ہر کمرہ کا رنگ جدا اور ہر رنگ کے مطابق پردے اور فرنیچر۔ رائے صاحب نے ہمیں سارا گھر دکھایا۔ ایک ایک چیز کی تعریف۔ یہ تصویر میں اٹلی سے لایا تھا۔ یہ بڑا قالین خاص پرشیا کا ہے۔ بجلی کے جھاڑ کا مجھے بہت شوق تھا۔ بنگلور میں ایک ہفتہ ٹھہر کر میں نے اپنے سامنے بنوایا ہے۔ ہرے رنگ کے دونوں صوفے بمبئی سے بن کر آئے ہیں' اور یہ سامنے کی تصویر گریش نے خود پینٹ کی ہے۔ جب وہ صرف سولہ سال کا تھا۔ یہ اس کی پہلی تصویر ہے۔

"میرے بھگوان یہ گریش صاحب کون ہیں؟" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ تصویر واقعی اتنی اچھی تھی کہ میں تعریف کئے بغیر نہ رہ سکی۔ ایک آدم قد چوکھٹے میں ایک عورت اور ایک مرد۔ عورت کے ہاتھ میں ایک گھڑا تھا۔ سامنے افق میں غروب آفتاب کی سرخی تھی۔ آسمان پر پھٹے پھٹے بادل۔ نیچے لکھا تھا" سوہنی مہینوال" تصویر کو دیکھ کر فوراً معلوم ہوتا تھا کہ بارش ہو چکی ہے اور شاید ابھی ابھی بادل پھٹے ہیں۔ اور یہ دونوں گم گشتگان محبت دن بھر کے کام کاج سے تھک کر بارش سے تر اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔ دونوں کی نگاہیں سامنے ڈوبتے ہوئے سورج کی اداس نارنجی رنگ کی روشنی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ تصویر مصوری کا بہترین نمونہ تھی۔ میرے دل میں بالکل غیر ارادی طور پر اس مصور کے لئے عقیدت پیدا ہو گئی تھی جس نے اتنی کچی عمر میں ایسی اعلیٰ تصویر بنائی۔

جب ہم کھانے کے کمرے کی طرف جا رہے تھے تو رائے صاحب ایک کمرے کے آگے رک گئے۔

"گریش۔ بیٹا باہر آؤ دیکھو تمہارے ہاں مہمان آئے ہیں"
"حاضر ہوا۔ پتاجی۔ ذرا ادھر کونے میں گہرا رنگ لگانا ہے"
"آیئے اندر ہی چلیں۔ رائے صاحب بولے۔ یہ تو جب تک رنگ نہ بھرے گا نکلے گا نہیں۔"

جن کو گریش کہا جاتا تھا دروازے کی طرف پیٹھ کئے بیٹھے تھے۔ سامنے کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ کمرے میں رنگ اور تصویریں بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ آپ ایک تصویر بنا رہے تھے ایک سوکھے ہوئے سے درخت کی ڈال پر کبوتروں کا جوڑا سہما ہوا سا بیٹھا ہے اور ایک باز ان کے اوپر منڈلا رہا ہے۔ واقعی بڑی اچھی تصویر تھی۔

"کتنی اچھی ہے یہ تصویر" میرے منہ سے غیر ارادی طور سے نکل گیا۔

تب گریش صاحب کو معلوم ہوا کہ کمرے میں کوئی اور بھی ہے۔ ایک دم سے پلٹ کر آپ کھڑے ہو گئے۔ نمستے کہہ کر پہلے میری طرف پھر والد صاحب کی طرف دیکھا۔

گریش واقعی نہایت خوبصورت تھا۔ اتنا خوبصورت جتنا کہ ایک جوان لڑکی کو بہت پسند ہوتا ہے۔ نہایت سادہ مگر صاف ستھرا لباس۔ بڑی اچھی صحت۔ اور بعد میں معلوم ہوا کہ آداب و اخلاق میں بھی آپ اپنے پتاجی کا ہی نمونہ ہیں۔ یہ بھی بعد میں معلوم ہوا کہ گھر کی سجاوٹ اور آرائش کے سامان کے انتخاب میں بڑا حصہ آپ کا ہی ہے۔ یہ بھی بعد میں معلوم ہوا کہ کالج میں پڑھتے ہیں اور ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ ماں بچپن ہی چھوڑ کر سورگباش ہو گئی تھیں۔ اور رائے صاحب کے اکلوتے آپ ہی ہیں۔

غرض کیا عرض کروں اُس روز کی چار عجیب پر لطف رہی والد صاحب اور رائے صاحب تو اپنی ہی باتوں میں مشغول رہے۔ میں اور گریش چار پینے کے بعد باغ میں گھومتے رہے پھر گریش نے اپنی بنائی ہوئی اور تصویریں دکھائیں۔ ادھر میں نے اپنا سارا حال سنایا۔ والدین کے معاملے میں ہم اور وہ دونوں ایک سے ہی ثابت ہوئے میری والدہ بھی جب میں چھ برس کی تھی جب ہی مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور آج پہلی ہی ملاقات میں یہ معلوم ہونے لگا کہ جیسے ہم عرصہ سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوں۔ جیسے ہم بہت پرانے دوست ہوں۔ بلکہ جیسے ہم بنے ہی ایک دوسرے کے لئے ہوں۔

ادھر رائے صاحب نے والد صاحب کو اور ادھر گریش نے مجھے اس بات پر آمادہ کر کے ہی چھوڑا کہ ہمارے پڑوسی ہونے کا فائدہ ہی جب ہے جب روزانہ ہم ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے ملتے جلتے رہیں۔ دہلی میں پہلا اتوار نہایت ہی اچھا گذرا۔

اور پھر اب تو یہ معمول ہو گیا تھا کہ یا ہمارے ہاں یا پھر رائے صاحب کے ہاں چار شام کی ساتھ ہی پی جاتی تھی۔ اتوار کو کھانا ساتھ ہی کھایا جاتا تھا۔ بزرگوں کو تو سینما کا شوق نہ تھا البتہ گریش اور میں سینما بھی ساتھ ہی جاتے تھے۔ مجھے شبہ ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگ ہم دونوں کے متعلق ضرور کچھ نہ کچھ باتیں کیا کرتے تھے۔ کیونکہ ایک اتوار کو جب ہم لان میں ٹہل رہے تھے تو رائے صاحب اور والد صاحب بھی ادھر آ نکلے۔ لان کے ایک سرے سے ہم چلنا شروع کرتے اور جب لان ختم ہو جاتا تو اسی راستے واپس آ جاتے۔ آپ نے کبھی سڑک کوٹنے کا انجن دیکھا ہے۔ نئی بنتی ہوئی سڑک کے ایک ہی حصہ پر بار بار پھیر کر کوٹتا ہے فرق صرف اتنا تھا کہ سڑک کوٹنے کا انجن مڑتا نہیں ایک حد تک جا کر الٹا چلنے لگتا ہے۔ ہم اُس حد کو پہنچ کر مڑ جاتے تھے۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ ایک اتوار کو جب ہم لان میں ٹہل رہے تھے تو دونوں بزرگ ادھر آ نکلے۔ ہم جو مڑے ہیں تو ان دونوں کو مسکرا کر اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ صاف ظاہر ہے کہ ہمارے متعلق بات چیت ہی کرتے تھے بلکہ ایک گہری سازش کر رہے تھے، کہ اتنے میں ایک بڑا ہی مزیدار واقعہ پیش آیا۔

شاید منگل کا دن تھا چیلمسفورڈ کلب میں ہر ہفتہ اس روز ناچ وغیرہ ہوتا ہے۔ گریش کلب کا ممبر تھا مگر جاتا بہت ہی کم تھا میں بھی ڈانس وانس کی تو شوقین نہ تھی مگر کلب جانے کو معیوب نہ سمجھتی تھی اس لئے گریش کے کہنے سے میں کلب اس کے ساتھ چلی گئی۔

ہم شاید ۹ بجے وہاں پہنچے ہونگے۔ خیال ہوا کہ آؤ تھوڑی دیر پنگ پونگ ہی کھیلی جاوے۔ پنگ پونگ ٹیبل کلب کے برانڈے میں رکھی ہے اور لان سے ہال کمرے میں جانے کا

راستہ بھی اُسی دروازے میں سے ہے ہمیں معلوم نہیں کون ادھر سے آیا کون گیا۔ ہم اپنے ہی کھیل میں مست تھے گریش نے بہت زور سے بال اچھالی اِدھر میں نے پورا ہاتھ گھماکر زور سے بلا مارا مگر بلا بجائے بال پر لگنے کے کسی انسان کے گال پر ایک نہایت سریلے چٹاخے کے ساتھ لگا۔ میں "Sorry" کہہ کر ایک دم مڑی سچ جانئے میں نے اپنے بلے سے ایک صاحب کے گال پر نہایت اطمینان سے "طمانچہ" پیش کیا تھا۔ اور پھر مزا یہ آیا کہ وہ صاحب میرے کالج کے کلاس فیلو نکلے۔ رسمی معذرت کے بعد بات آئی گئی ہوئی۔ اور کوئی ۱۱ بجے ہم واپس آگئے۔

اگلے روز چار پر کل رات والے خوشگوار طمانچہ کا ذکر آگیا گریش نے خوب نمک مرچ لگاکر اور مزے لے لے کر سارا واقعہ رائیصاحب اور والدصاحب کو سنایا اُن دونوں نے بھی اس واقعہ کا خوب لطف اٹھایا۔ اور بعد میں دونوں کی وہی معنی خیز مسکراہٹ۔

اسی سلسلہ میں جب میں نے گریش کو بتایا کہ طمانچہ خوردہ صاحب میرے ساتھ کالج میں تھے۔ مجھ پر بڑے مہربان تھے اور چاہتے تھے کہ میں بھی ان پر مہربان ہوجاؤں۔ بلکہ بہت ہی زیادہ خواہشمند تھے کہ ہماری دونوں کی مہربانیاں ایک دوسرے کے لئے دائمی ہوجائیں تو گریش کو بڑا مزا آیا اور انہیں ایک اور ہی شرارت سوجھی۔

میرے ان مہربان کا نام نریندر تھا۔ اور میری طرف ان کے جھکاؤ کے متعلق کالج میں اکثر لڑکے اور لڑکیوں کو علم تھا۔ بلکہ دبی زبان سے (یہ ان کی شرافت تھی) کبھی کبھی ذکر بھی کیا کرتے تھے۔ گریش نے تجویز پیش کی کہ نریندر صاحب کو میں اپنے گھر چار پہ بلاؤں اور اگر وہ ذرا بھی مہربانی ظاہر کریں تو میں بھی اپنی طرف سے انہیں اطمینان دلاؤں۔ خیر! مجھے یہ تجویز بالکل ناپسند تھی۔ بلکہ ایک سرے سے میں اس تجویز کے خلاف تھی۔ اول تو میں کالج میں ہی پریشان تھی۔ جدھر بھی نکل جاؤں۔ لاکھ میرے سے کوئی صاف لفظوں میں نہ کہے پھر بھی میرے ساتھیوں کی دبی دبی مسکراہٹ مجھے پریشان کردیتی تھی کالج چھوڑنے کے بعد اس طرف سے اطمینان ہوا تو یہ حضرت گریش مجھے پھر اسی پریشانی میں مبتلا کرنا چاہتے تھے۔ ویسے نریندر بہت نیک اور شریف لڑکا تھا اور اُس نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہ کی جس سے مجھے کیا کسی اور کو بھی اعتراض ہوسکے۔ لیکن آخر یہ کہاں کی شرافت تھی کہ بیٹھے بٹھائے ایک شریف لڑکی اپنے پیچھے آفت لگالے۔ لیکن گریش تھے کہ بچوں کی طرح مچل گئے اور ضد کرنے لگے اور کچھ اس طرح سے کہا کہ میں بھی مان گئی۔

نریندر نے جب میری طرف سے پہل دیکھی تو وہ بالکل ہی بچھ گئے۔ آگ لینے آئے تھے گھر کے مالک ہی بننے لگے۔ کہنے لگے "کہو تو والدصاحب سے میں کہدوں اور وہ راضی ہوجائیں تو شادی جلد ہی ہوسکتی ہے"! اسی چیز سے میں ڈر رہی تھی۔ اس وجہ سے نہیں کہ میں گریش کو پسند کرنے لگی تھی یا شادی کے لئے کوئی اور میری نظر میں تھا۔ بلکہ نریندر کو میں اس حد تک پسند نہیں کرتی تھی کہ شادی کے لئے ان کی تجویز منظور کرلیتی۔ اور پھر نہ معلوم والدصاحب نے میرے لئے کیا سوچ رکھا تھا۔

گریش کو جب میں نے سب حال سنایا تو پہلے تو وہ خوب ہنسے پھر بولے "تم دیکھتی جاؤ تماشہ میں کیسا اس کو بناتا ہوں"

چپ ہونے کے علاوہ میں اور کر ہی کیا سکتی تھی۔ البتہ یہ مذاق مجھے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ میں نے بہت اصرار کیا کہ "گریش بھگوان کے لئے یہ مذاق بند کردو" مگر سنے کون ان کے سر پر تو ایک بھوت سوار تھا اور نہ معلوم اس مذاق کو وہ کس حد تک لے جانا چاہتے تھے۔ ادھر میں تھی کہ باوجود اس کے سخت خلاف ہونے کے اپنے میں گریش کی مرضی کے خلاف کارروائی کرنے کی تاب نہ پاتی تھی۔ ایک کمزوری سی مجھ پر چھائی جارہی تھی۔ آخر گریش تھے ہی کون! میرے پڑوسی یا میرے والدصاحب کے دوست کے لڑکے۔ انہیں کیا حق تھا کہ مجھ سے من مانی کراتے اور میں کیوں ان کے کہنے میں آکر اندھی سیدھی کئے جارہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

میں نے ذکر کیا تھا نہ کہ والدصاحب اور رائیصاحب میرے اور گریش کے متعلق ضرور کچھ بات چیت کیا کرتے تھے بلکہ دو ایک مرتبہ انہیں مسکراتے بھی دیکھا گیا اور یہ بھی کہ وہ ہمارے متعلق ایک گہری سازش کررہے تھے۔ وہ سازش یہ تھی کہ وہ ہم دونوں کی شادی کردینا چاہتے تھے اور یہ انکشاف اس اتوار کے کھانے پر ہوا۔ مزہ یہ دیکھئے کہ ہم سے یہ کہا گیا کہ ہم دونوں نے پختہ فیصلہ کرلیا ہے۔ اور پھر ساتھ ہی ہم سے پوچھا بھی جارہا تھا کہ تمہاری

www.taemeernews.com

کیا رائے ہے؟"

میں کتنی بھی آزاد سہی مگر والد صاحب سے کس طرح صاف صاف کہدوں کہ مجھے منظور ہے۔ جب بہت والد صاحب نے کرید کرید کر پوچھا "بیٹا سمن تو ہاں کر دے تو سب طے ہو جاوے، بول منظور ہے نا؟" تو بتلائیے میں کیا کرتی۔ کپڑوں میں منہ چھپا کر میں نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا "اونہوں"

"ہا۔ پگلی" والد صاحب ہنس کر بولے۔ لگی نہ شرارت کرنے

ادھر جب گریش بابو سے پوچھا گیا تو وہ بھی ٹال گئے مسکرا کر کہنے لگے "میری تو مرضی ہے نہیں"

"تو تو تصویریں بنا۔ جا کر شادی وادی کر کے کیا کرے گا۔ گدھا کہیں کا"

ہمارے دونوں کے انکار سے مطلب یہ لیا گیا کہ ہمیں منظور ہے اور حقیقت بھی یہی تھی۔ بقول علامہ اقبال مرحوم کے ؎

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی

اور یہ طے ہو گیا کہ عنقریب شادی کے لئے تاریخ مقرر کی جاویگی۔

ادھر سے فارغ ہو کر گریش صاحب پھر شرارت پر آمادہ ہوئے۔ دوڑے ہوئے میرے پاس آئے بولے "سمن ایک چیز کا تو فیصلہ ہو ہی گیا کہ تم میرے ساتھ شادی نہیں کر رہی ہو۔ چلو اچھا ہی ہوا۔ میں بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے ایک اور ہی لڑکی ڈھونڈ رکھی ہے۔ نرم۔ نازک۔ بڑی خوبصورت۔ فرسٹ کلاس گاتی ہے، اتنی اچھی ہے۔ سمن۔ کہ کیا بتاؤں۔ اچھا ہاں۔ اب تم زیندر صاحب کو ضرور پھانس لینا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بھی نکل بھاگیں۔ کب بلا رہی ہو انہیں چار پر۔ اور دیکھو ہمیں بالکل بھول نہ جانا"

میں جانتی تھی کہ گریش یہ سب باتیں اوپری دل سے کہہ رہے ہیں۔ لیکن اس وقت میری طبیعت بھی موزوں تھی۔ میں نے ذرا برا مان کر کہا۔

"سچ پوچھو تو مجھے یہ مذاق پسند نہیں" میں نے تو خود والد صاحب سے انکار کر دیا تھا۔ ایسے خاوند کا میں کیا کروں گی جو دن رات برش اور رنگ لئے کمرے میں بند رہے۔ زیندر کو دیکھئے بہترین آدمی ہے

رہی چاہے پر بلانے کی۔ تو وہ آج لیجئے"

اچھا ہوتا یہ مذاق شروع ہی نہ ہوتا۔ میں نے مشکل سے بات ختم کی ہو گی کہ زیندر صاحب مسکراتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔

"نمستے" "نمستے" "بیٹھئے" "جی شکریہ"

"مسٹر زیندر آپ ہیں ہمارے پڑوسی رائے صاحب پرشوتم کے صاحبزادہ۔ آپ مسٹر زیندر" سمن نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"میرا نام گریش ہے۔ یہ میرا نام نہیں لے سکتیں۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی" "اس دن کلب میں بھی تو شاید آپ..."

"جی ہاں — جس روز — "

"جی۔ جی"

"سمن آپ کی بہت ہی تعریف کیا کرتی ہیں" گریش نے طرح دیتے ہوئے کہا۔ اور میری طرف دیکھ کر ذرا مسکرایا بھی "اچھا تو آپ لوگ چائے وغیرہ پیجئے مجھے ذرا جانا ہے۔"

گریش کی ہنسی مجھے زہر معلوم ہو رہی تھی۔ نہ معلوم وہ مجھے ستا کر اس قدر خوش کیوں ہو رہے تھے۔ کیا میں یہ حقیقت چھپا سکتی ہوں کہ مجھے گریش سے لگاؤ ہوتا جا رہا تھا اور پھر جبکہ ہماری شادی کے لئے ہمارے بزرگ فیصلہ بھی کر چکے تھے۔

گریش تو نمستے کر کے چلے گئے۔ اور حضرت زیندر پھر وہی اپنی داستان لے بیٹھے۔ میں ہر چند آپ کو ٹالتی مگر آپ ہیں کہ جانے کا نام نہیں لیتے۔ میں نے بار بار جمائیاں لینی شروع کیں گھڑی کی طرف کئی بار دیکھا۔ ملازم کو بلا کر مختلف قسم کی غیر ضروری کام بتائے اور بڑی مشکل سے ½ ۹ بجے زیندر صاحب کو گھر جانے کا خیال آیا۔ میں نے بھی ایک ہی دفعہ ان کے "اچھا میں اب چلوں" پر رضامندی ظاہر کرتے ہوئے "اچھا نمستے" کہہ کر انہیں رخصت کیا۔

پتا جی رائے صاحب کے ہاں سے آ گئے تھے اور جلد ہی کھانا کھا کر ہم سونے کے لئے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ آج مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ زیندر پر تو مجھے رحم آنا شروع ہو گیا تھا۔ بار بار میں سوچتی کہ کیوں نہ صاف صاف ان حضرت سے کہہ دوں کہ میری شادی طے ہو چکی ہے۔ آپ کی مہربانیوں کا شکریہ۔ لیکن گریش کا کھیل جاری رکھنا ضروری تھا۔ ورنہ ان کے ناراض ہو جانے سے

www.taemeernews.com

بنا بنایا کام بگڑ جاتا۔ زریندر سے میں نے کچھ نہ کہا البتہ گریش کو کچھ اس مضمون کا پرچہ لکھا کہ میں آپ کے مذاق سے اکتا گئی ہوں اور یہ کھیل اب بند ہونا چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ واقعی زریندر صاحب کچھ اور سمجھ لیں اور پھر مجھے بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وغیرہ وغیرہ۔

گریش نے اس پرچہ کا کوئی جواب نہ دیا البتہ اس کے بعد کئی دفعہ ایسا موقعہ ہوا کہ میں اور گریش بیٹھے ہیں اور زریندر چلے آرہے ہیں میرے گھر میں گریش کے ہاں۔ کلب میں سینما میں۔ عام طور سے زریندر سے مٹھ بھیڑ ہو جاتی تھی۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ اب گریش صاحب کے مزاج بھی کچھ کچھ ٹھکانے آچلے ہیں۔ وہ بھی شاید اپنے مذاق سے تنگ آچکے ہیں۔ لیکن واہ ری وضعداری۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔

ادھر تو والد صاحب اور راجہ صاحب شادی کی تیاریوں میں زور شور سے مصروف تھے اور ادھر گریش نے دو ایک دن سے آنا جانا بند کر رکھا تھا۔ راجہ صاحب کی زبانی بھی معلوم ہوا کہ طبیعت کچھ گری پڑی ہے دن بھر اپنے کمرہ میں بیٹھا تصویریں بنایا کرتا ہے۔ مجھے کھٹکا ہوا کہ کہیں زریندر کے اس روز ایکا ایک آجانے سے اور وہ بھی میرے یہ کہنے پر کہ "وہ آج ہی آجائیں گے۔ اور پھر پے در پے مختلف جگہ اتفاقاً مل جانے سے کہیں گریش صاحب کو کچھ اور خیال تو پیدا نہیں ہوگیا۔ اور پھر مجھے اپنے اس روز کے رقعہ پر افسوس ہوا جو میں نے زریندر کے جاتے ہی لکھا تھا۔ کہیں اس نے تو کچھ غلط فہمی پیدا نہیں کی۔ لہٰذا میں خود ہی ہمت کر کے راجہ صاحب کے ہاں گئی۔

گریش اپنے کمرے میں ہی تھے۔ میں مسکراتی ہوئی اندر گئی۔ چپکے سے آنکھیں بند کیں۔ دیکھئے ظالم کی باتیں۔ فرماتے ہیں۔ "میں جانتا ہوں زریندر ہوں گے۔" اگر میں چکر کھا کر گر نہ پڑتی تو شاید اس سنگدل انسان کو مجھ پر رحم آجاتا۔ لیکن صدقے جاؤں اس کمزوری کے جو بے وقت مجھے دبا لیتی ہے اور اس وقت میں پتھر کا ستون بنی کھڑی رہی۔ گریش کے چہرے پر زہر میں بجھی ہوئی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اور شکل سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت غصہ میں ہیں وحشت چہرے سے برس رہی تھی۔ رنگ زرد پڑا تھا اور سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایک دم مجھ پر برس پڑے۔

"سمن تم سے یہ امید مجھ کو نہ تھی۔ میں نے یہ سب مذاق کے لئے کیا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تم میری طرف سے اتنی لاپرواہ ہو جاؤ گی مجھے معلوم نہیں تھا کہ زریندر روزانہ تمہارے پاس آتا ہے اور تم نے ایک مرتبہ بھی مجھ سے ذکر نہیں کیا۔ اگر تم بھی اس مذاق کو مذاق سمجھ کر ہی میرے کہنے پر عمل کرتیں تو مجھے ذرہ بھر پرواہ نہ ہوتی۔ زریندر سے ملاقات مجھ سے چھپائی گئی۔ اب میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ والد صاحب سے صاف صاف سب باتیں کہہ دوں میں اس شادی کے لئے تیار نہیں۔ جاؤ میرے سامنے سے چلی جاؤ۔ تمہاری شکل دیکھ کر مجھے غصہ آتا ہے۔"

آپ ہی بتائیے۔ کیا گریش یہ سب کچھ کہنے اور کرنے میں حق بجانب تھے۔ کیا میں نے سب کچھ انہی کے کہنے اور اصرار کرنے پر نہیں کیا تھا۔ کیا ان کے کہنے کے خلاف میں نے ایک قدم بھی اٹھایا میں کب چھپ چھپ کر زریندر سے ملی۔ میں نے کیا بات ان سے پوشیدہ رکھی۔ کیا یہ سب کچھ میری مرضی کے خلاف نہیں ہو رہا تھا طرہ یہ کہ ان سب باتوں کے لئے مجھ کو ہی کوسا جا رہا تھا۔ آخر کیوں؟

کہنے ۔ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ آپ چلی جائیے۔"

اس سے آگے میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ میرے دل کی حالت کا اندازہ کیجئے میں گھر چلی آئی اور اپنے کمرہ میں جا کر خوب خوب روئی۔ زریندر ملنے بھی آئے میں نے ملنے سے انکار کہلا بھیجا۔ مجھے رہ رہ کر گریش پر غصہ آرہا تھا ان کی بے انصافی بے وجہ غصہ اور میری بات تک سننے سے انکار نے میرا دل توڑ دیا تھا مرد کس قدر شکی ہوتا ہے یہ مجھے آج معلوم ہوا۔

معلوم ہوا کہ گریش نے اپنے پتا جی سے بھی اس بات کا تذکرہ کر دیا کیونکہ والد صاحب نے مجھے بلا کر دریافت کیا۔ میں کہہ ہی کیا سکتی تھی۔ سچ سچ بات جو تھی وہ بتا دی خود راجہ صاحب نے میرے والد نے سب سن کر ہی گریش کو سمجھایا۔ زریندر کو جب حالات معلوم ہوئے وہ خود بھی گریش کے پاس گئے سب حال کہنا چاہا۔ خاموشی سے سنتے رہے۔ جواب کچھ نہ دیا۔ زریندر سے میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر شادی میں کر بھی لوں

www.taemeernews.com

تو بھی ہماری زندگی کامیاب نہ ہو سکے گی۔ والد صاحب کی جدائی بھی میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ لہذا میں شادی کروں گی ہی نہیں۔

نریندر کو خود افسوس ہو رہا تھا۔ اگر میرے ساتھ ان کی شادی ممکن نہ تھی تو وہ میری راہ میں روڑا بھی بننا نہ چاہتے تھے۔ وہ رائے صاحب سے بھی ملے۔ میرے والد صاحب سے بھی سارا ماجرا لفظ بہ لفظ سنایا۔

لیکن گریش تھے کہ ٹس سے مس نہ ہوتے تھے۔ اور رائے صاحب بھی کیا کر لیتے۔ بہتیرا کہا گیا کہ کبھی غلطیاں اور غلطی بھی تو کوئی نہیں صرف غلط فہمی ہے سو بعض اوقات ہو ہی جاتی ہے۔ اتنی ضد کیوں کرتے ہو۔ مگر وہاں جواب ہی ایک تھا۔

مجھے خود تعجب ہوتا ہے۔ میری ہم عمر لڑکیاں کئی کئی دلہن رہ چکی تھیں ان میں سے بیشتر کی شادیاں بھی ہو چکی تھیں اور اب وہ بال بچے لئے گھر سنبھالے عیش کر رہی تھیں۔ مجھ جنم جلی نے ماں کی وفات کے بعد گھر کی چہار دیواری کو ہی اپنی دنیا سمجھ کر اتنی عمر بتادی اب ایک موقعہ ایسا آیا جس میں دیانتداری کے ساتھ دل کی دھڑکنیں گننے کا موقع ملا آس پہ یوں خاک پڑ گئی اور پھر میرا اس میں قصور کچھ نہیں۔ ایک کھلونا تھی۔ کھیلنے والے کا جب تک جی چاہا کھیلا پھر توڑ کر پھینک دیا۔ ایک ناکارہ لڑکی جو ماں باپ کی آنکھوں کا تارا ہی مگر چاہنے والے کا دل دو دن بھی قابو میں نہ رکھ سکی۔ میری آزاد رو سہیلیاں ہمیشہ ہی طعنے کسا کرتی تھیں کہ "پگلی ہے تو تو۔ یہ شکل صورت لئے بیٹھی ہے اری ناز کر ناز بردار بنا۔ تیرے تو پاؤں دھو دھو کر پینے والے پروانوں کی طرح گریں گے" مجھے اپنی خوبصورتی پر ناز نہ سہی مگر میں یہ محسوس کرتی تھی کہ میں واقعی لاکھوں سے اچھی ہوں۔ اسی خوبصورتی نے آج یہ مصیبت ڈالی۔ کیوں نریندر مجھے چاہتے اور کیوں گریش حسد کرتے۔

میں نے گریش کو خط لکھے۔ پھر لکھے اور پھر لکھے۔ مگر جواب ندارد۔ خود ملنے کا سلسلہ ہی نہ ہوا۔ پہلی مرتبہ ہی انہوں نے کچھ نہ سنا تو اب کیا سنیں گے۔ خیال تھا کہ شاید غصہ کم ہو جانے پر خط کا جواب لکھ دیں تو ایک مرتبہ پھر جا کر پاؤں پڑوں۔ مگر یہ امید بھی بر نہ آئی۔ سنا کرتی تھی دن دن بھر کمرے میں بند پڑے رہتے ہیں کھانا پینا بھی مجبوری طور پر چلتا ہے۔ میری کیا حالت ہوگی یہ وہ جانیں جنہیں ایسا موقع پڑا ہو۔ ادھر بزرگوں کا یہی حال تھا اپنے اپنے دل میں شرمندہ اور پشیمان۔ کریں تو کیا کریں؟

ان باتوں کو آج چھ مہینے گذر گئے۔ نریندر نے آنا جانا بہت کم کر دیا۔ والد صاحب کی تبدیلی بمبئی کی ہو گئی۔ رائے صاحب بہت کبیدہ خاطر تھے۔ مدت بعد انہیں والد صاحب کے ساتھ کچھ عرصے رہنے کا موقع ملا تھا۔ اور اب جدائی شاق گذر رہی تھی میں نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی کہ گریش صاحب سے اپنا قصور معاف کرا لوں۔ خط لکھا۔ مگر وہی خاموشی۔ ان حسین گھڑیوں کی یاد لئے ہم دہلی سے رخصت ہوئے۔

والد صاحب میری بہت دلجوئی کرتے رہتے تھے میں بھی کوشش کرتی تھی کہ اور کچھ نہ سہی کم از کم ان کی خوشی کے لئے ہی خوش رہنے کی کوشش کروں کہ اتنے میں ایک اور ہی واقعہ پیش آیا۔ ہمارے رشتے کی ایک موسی بمبئی میں رہتی تھیں وہ دو چار دن پہلے بھی آ چکی تھیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ میری شادی کے لئے بات چیت کر رہی ہیں اور انہوں نے ایک پڑھا لکھا خوبصورت برسرِ روزگار "سندر سا" دولہا دیکھ بھی لیا ہے۔ بات چیت ہوتی رہی۔ شادی طے ہو گئی۔ اور بالآخر خود شادی بھی ہو گئی۔

جن صاحب سے میری شادی ہوئی وہ سرکاری سپلائی کے دفتر میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ واقعی بہت خوبصورت خوب سیرت۔ اور پھر مجھ پر اتنے مہربان کہ حد نہیں میری نیند سوئیں میری نیند جاگیں۔ بس یہی چاہتے تھے کہ کچھ نہ کچھ میرا ہی کام کرتے رہیں۔ اتنی محبت اتنی قدر کہ میں شرمندہ ہو ہو جاتی تھی ایک روز فرصت میں بیٹھے تھے۔ دفتر کی چھٹی تھی۔ کہنے لگے۔

"سمن کوئی کہانی سناؤ" میں نے کہا

"آپ بیتی سنئے یا جگ بیتی"

ابی جناب اٹھ کھڑے ہوئے مجسم اشتیاق بنے ہوئے کہنے لگے "آپ پر بھی کچھ بیت چکی ہے؟"

اور جب میں نے اپنی رام کہانی سنائی تو تڑپ تڑپ گئے کہنے لگے۔ بڑا گدھا ہے گریش۔ وہ سدا کا ضدی ہے۔ کالج

www.taemeernews.com

میں بھی اس کا یہی حال تھا۔

"آپ جانتے ہیں انہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارے خوب۔ ساتھ پڑھتے ہیں۔ کھیلے ہنسے ہیں۔"

ہاں میں یہ کہنا بھول گئی کہ ہماری شادی پر جناب نے وہی ہار اور کبوتر والی تصویر بطور تحفہ بھیجی تھی۔ رائے صاحب تو خود شادی میں شریک تھے۔ بڑا بھاری ہار انہوں نے دیا تھا۔ کہتے تھے جو تحفہ بہو کو دینا تھا وہ بیٹی کو دے رہا ہوں۔

یہ سب کچھ سن کر کہنے لگے یہ تو بڑی مزیدار بات ہوئی میں تو نریندر سے بھی واقف ہوں۔ اب ان دونوں کو بھی بلاتا ہوں۔ بڑا مزا رہے گا۔"

میں پھر گھبرائی میں نے کہا "دیکھئے پہلے ہنسی میں کھنسی ہو چکی اب معاف رکھئے۔" نہ مانے دونوں کو بلایا بیچاروں کو دیکھ کے رحم آتا تھا۔ گریش کی تو حالت عجیب تھی۔ مگر جب تک یہ دونوں یہاں رہے میرے جی میں دھکڑ پکڑ ہوتی ہی رہی۔ دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ میں مرد سے ڈرتی تھی۔

گریش کے ساتھ شاید میں خوش رہتی مگر ان کے ساتھ بہت ہی خوش ہوں۔ خدا سب کو ایسے شوہر دے۔ خدا ہر ایک کے ساتھ ایسے ہی مذاق کے موقع پیدا کرے۔ کیا ہوا جو سال چھ مہینے رو لئے۔ اب دیکھئے وہ مذاق ہی مجھے راس آیا۔

"کھنسی میں ہنسی ہو گئی۔"

نئی کتابیں

منٹو کے مضامین: سعادت حسن منٹو — ۳ روپے
ناہید: آغا شاعر دہلوی کا ناولٹ — عہ/
دل کے آنسو: رئیس احمد جعفری — عہ/
ترقی پسند ادب: عزیز احمد — عا/
داستان کربلا: مختلف حضرات — ۲ روپے

ملنے کا پتہ

نگارستان ایجنسی اردو بازار دلی

ہندستانی پبلشرز دلی
کی
زیر طبع کتابیں

شب تاب:۔ مجاز کا مجموعہ کلام۔
(جون میں شائع ہو جائے گا)

مجھے خرید لو:۔ شوکت تھانوی کی نئی تصنیف۔
(جولائی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوگی)

سانجھی:۔ خواجہ محمد شفیع دہلوی کا نیا ناول
(جولائی کے آخری ہفتے میں شائع ہوگا)

آٹھ رومان:۔ مختلف افسانہ نگار۔
(اگست کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوگا)

بدلیاں:۔ مس سحاب آغا شاعر کے افسانے۔
(اگست کے آخری ہفتہ میں شائع ہونگے)

ارمان:۔ آغا شاعر دہلوی کا مشہور ناول۔
(ستمبر کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوگا)

ان کے علاوہ اور بھی کئی عمدہ کتابیں ہندستانی پبلشرز دلی آپ کی خدمت میں پیش کرے گا۔

واردات شاعر

عاصم پریمی

سحر کے دلخوش کن لمحے۔ نسیم صبح کے پرلطف معطر جھونکے۔ دل پر شوق کو گدگدا کر آخر چمن تک لے ہی گئے۔ مگر مجھکو معلوم نہ تھا کہ نگاہوں کو تازگی بخشنے والا سبزہ۔ قلب کو فرحت پہنچانیوالی نسیم۔ روح کو سکون دینے والی بھینی بھینی مہک میری پرسکون زندگی میں شعلہ بھڑکانے کے لئے مجھکو کھینچ رہے ہیں۔

کتنا بشاش۔ کتنا آزاد قدرت کے اس بے پناہ مناظر سے محظوظ ہوکر میں باغ کی روشوں پر گھوم رہا تھا۔ شبنم نے موتیوں کا فرش سبزے پر بچھا دیا تھا۔ گلوں کی رعنائی۔ غنچوں کا خاموش حسن میرے دل میں سرود کیف کی موجیں پیدا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ پرندوں کے نغموں اور چڑیوں کے چہچہوں نے اس فضائے خاموش کو متزلزل کیا اور عروس فطرت نے آنچل ہٹا کر روئے آفتابی دکھایا جس کی شعاعیں پھوٹ پڑیں اور نغمئی لہریں ماحول میں ہیجان پیدا کر گئیں۔ ناممکن تھا کہ ایک دل درد آشنا اثر پذیر نہو۔ نرگس پر شبنم کے چمکتے ہوئے قطرے معلوم ہوا کہ ماحول کی تبدیلی کا احساس گلشن کی اس حسین ملکہ کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آرہا ہے۔

اس نظارہ میں مست، فکر سے کوسوں دور، زیر لب کچھ گنگناتا ہوا میں سیر میں مصروف تھا کہ۔ سامنے حوض کے کنارے، ہلکی گلابی ساری میں اپنا شہابی جسم چھپائے، مجھے دیکھنے کے باوجود نگاہوں کا رخ پانی کی جانب پھیرے اور مجھ سے آنکھیں چرائے۔ اپنی مخمور نظریں کنول سے ملائے کچھ عجیب شان بے نیازی سے تم بیٹھی تھیں۔

دیر تک مجھکو اپنا ہوش نہ رہا۔ آنکھوں پر خواب کا گمان تھا اور دیکھ رہا تھا۔

تم اٹھیں۔ اپنی سیاہ زلفوں کو مرمریں ہاتھوں سے درست کرکے جنبش دی۔ میرے دل کی دنیا متزلزل ہو گئی مجھے محسوس ہوا کہ گلشن کی ساری رنگینیاں تم میں جذب ہو کر رہ گئی ہیں۔ تم چلیں تو معلوم ہوا گویا گلستاں کی بہار لوٹ کر اسکو ویراں کرکے جاتی ہو۔ اس بہار کو پامال کرکے تم چھیں اور تمہارے ہر قدم پر میری آنکھیں بچھ گئیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں تم غائب ہوگئیں۔ مگر غائب ہونے سے پیشتر ایک مرتبہ، ہاں صرف ایک مرتبہ تم نے ایک اچٹتی سی نگاہ مجھ پر ڈالی اور میں ان نظروں میں کھو گیا۔

سینہ میں ایک شعلہ بھڑکا۔ تمام بدن میں آگ سی لگ گئی اور آج تک یہ شعلے مجھکو لپیٹے ہوئے ہیں۔

دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ اپنے اور بیگانے سب کو بھولا ہوا۔ ابتدائی نظر میں گم ہوش و حواس کھوئے ہوئے بیٹھا ہوں۔ تن کی سدھ ہے نہ بدن کا ہوش۔ ہاں یاد ہے تو بس اتنا کہ تم نے:۔

اس طرح سے دیکھا تھا کہ گویا نہیں دیکھا

آہ

اف اف وہ اچٹتی سی نگاہ و غلط انداز
اس طرح سے دیکھا ہے کہ گویا نہیں دیکھا   آغا شاعر مرحوم

ناہید

آغا شاعر قزلباش دہلوی کا لکھا ہوا ناولٹ

لکھنؤ کے محلوں میں پروان چڑھا ہوا پاکیزہ و لطیف عشق اپنی داستان سنا رہا ہے جس میں قدم قدم پر خطرے، رکاوٹیں الجھنیں، تہذیب و اخلاق کی چٹانیں دل کی مجبوریاں۔ جنوں کے شعلے سچی محبت سے گذرتے ہیں مانع ہوتے رہتے ہیں۔ مگر ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ

نگارستان ایجنسی اردو بازار دلی

تصویریں

ادارہ

ہمایوں:- ہندستان کے محبوب ڈائرکٹر مسٹر محبوب کا زندۂ جاوید شاہکار

خاص اداکار:- اشوک کمار، وینا، چندر موہن، نرگس، شاہنواز، مجید، کے این سنگھ

موسیقی:- غلام حیدر، افسانہ - پروفیسر واقف مراد آبادی، مکالمے، آغا جانی کاشمیری - مغلیہ خاندان کی تاریخ کا ایک اہم باب زندگی اور زندہ دلی کا جیتا جاگتا نمونہ - رقص و موسیقی سے لبریز - فردوس کے حسن اور کائنات کی مصوری کا امتزاج

پھول:- دنیائے فلم کے معروف ستارے ایک اسٹیج پر - پرتھوی راج - وینا - ستارہ - یعقوب - ثریا - مظہر خاں - اسمٰعیل واسطی، اشرف خاں، درگا کھوٹے، ڈکشٹ، جلو، مجید اور خواجہ صابر وغیرہ -

مکالمے:- کمال امروہوی، موسیقی، غلام حیدر، ہدایت کار، کے - آصف - پیش کردہ فیمس فلمز، جوانی کی دلکش داستان - دل کے نازک تاروں پر گائے ہوئے پُر درد نغمے - روح کو بیدار کرنے والے مکالمے -

---

عشق کی آنکھ سے ایک آنسو گرا اور حسن نے اپنے دامن میں اسے جذب کر لیا

دنیائے حسن و عشق کی رنگین داستان

مغلیہ تاریخ کا ایک سنہری باب

رنجیت مووی ٹون کی لاجواب پیشکش

ممتاز محل

اداکار

خورشید (ملکہ ممتاز محل)

چندر موہن (شہنشاہ شاہجہاں)

کجن - آرملا

لالہ یعقوب

سلوچنا چٹرجی

اداکار

کدار شرما

افسانہ

منشی دل لکھنوی

گانے

دلّی

شہنشاہ شاہجہاں اور ملکہ ممتاز محل کی محبت کا غیر فانی شاہکار

دلی کے عنقریب ہر دلعزیز سینما ہال میں نمائش کے لئے پیش کیا جانے والا ہے

جاری کردہ:- جگت نائیگر ڈسٹری بیوٹرز - دلّی ـــ لاہور ـــ کراچی

عشق وہ آگ ہے

جو آنسوؤں سے بھڑکتی ہے اور شعلوں سے بجھتی ہے

وہی عشق کی آگ

دو دوشیزاؤں کے معصوم دلوں میں بھڑک اٹھی!

لکشمی پروڈکشنز

کی

عدیم المثال تصویر

کادمبری

ستارے

شانتا آپٹے :: ونمالا

پہاڑی سانیال

جیون :: ہرلیش

تیار کردہ

نندلال :: جسونت لال

:: مصنف ::

باناجھٹ

مہاراجہ ہرش کے دربار کا شاعر اعظم۔

جس کی تیاری پر دو لاکھ روپیہ صرف ہوا اور یہی اسکی کامیابی کا ضامن ہے

آپ کے محبوب سینما

جگت ٹاکیز دلی میں پانچواں پر ہجوم ہفتہ

جاری کردہ :- مون پکچرز دلی ـــــ لاہور

www.taemeernews.com

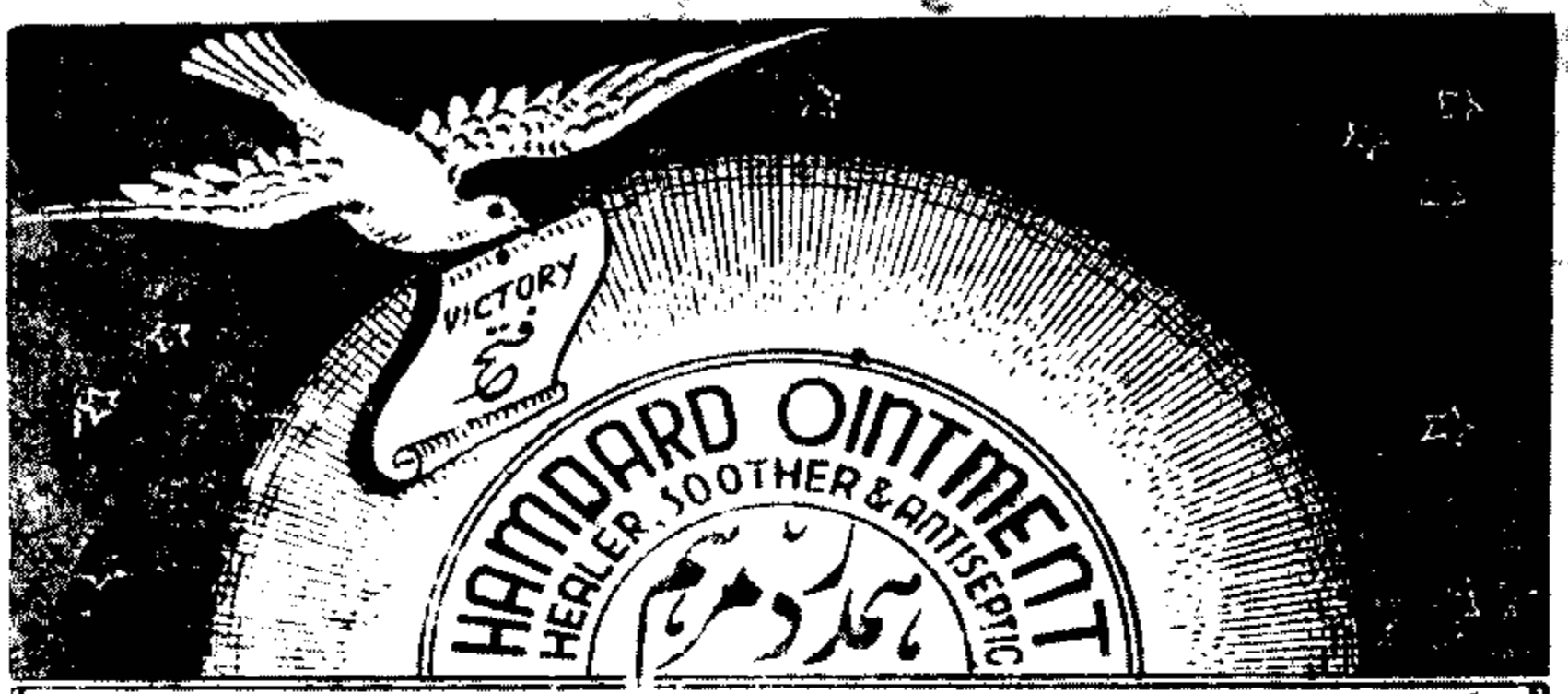

اُدھر اپنی چونچ میں زیتون کی شاخ لیے امن کی فاختہ کوکو، کوکو کا شور مچاتی ہوئی ایک مرتبہ پھر جنگ کے مارے ہوئے درماندہ وخستہ حال یورپ کے ویران خانے میں جنگجو قوموں کے لیے صلح و آشتی اور اطمینان وسکون کا پیغام لے کر اُتر آئی ہے

اِدھر ہمدرد دواخانہ

ہمدرد مرہم

لے کر ہندستان اور ہندستان کے باہر کے لوگوں کے بیسیوں دُکھ بیماریوں سے محفوظ اور مامون کرنے کے لیے میدان میں اُتر آیا ہے اور مژدہ جانفزا سنا رہا ہے کہ

چوٹ، آگ سے جلنا، کھولتے پانی سے جلنا، چاقو کا زخم، موچ، داد، ددوڑے، کھجلی، پھوڑا پھنسی، گٹھیا، گوکھرو، گھائیاں پھٹنا، جلد پھٹنا، ناصور، مہاسے اور دُوسری تمام جلدی بیماریوں کے لیے ہمدرد مرہم اکسیر ہے۔

دس سال کی مسلسل اور انتھک کوششوں کے بعد بالآخر "ہمدرد" نے "ہمدرد مرہم" ایجاد کر لیا۔ آج یہ مرہم بلاشبہ دنیا کے سب مرہموں کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ سائنٹی فک طریقہ تیاری نے اسے بہت اعلےٰ درجے پر پہنچا دیا ہے۔

ہمدرد مرہم

جلد کی سب بیماریوں کے لیے اکسیر — ہمدرد کی سائنٹی فک ایجاد — چربیوں سے بالکل پاک

قیمت فی ڈبیہ بارہ آنے (۱۲)

ہمدرد مرہم کے لیے تمام ہندستان میں اسٹاکسٹوں کی فوراً ضرورت ہے شرائط طلب کیے جائیں

ہمدرد دواخانہ (ہمدرد مرہم ڈپارٹمنٹ) دہلی

نفیس مزاج ادب پسندوں کے لئے چند تحفے

اعمال نامہ

اگر آپ کو ہندوستان کی نصف صدی کی تاریخ دیکھنی ہو تو اعمال نامہ ملاحظہ کیجئے۔ جس میں سر سید رضا علی ایم۔ ایل۔ اے نے اپنی خود نوشت سوانح عمری قلمبند کر دی ہے۔ سو سال میں مذہب۔ ادب۔ سیاست۔ معاشرت۔ تعلیم۔ صنعت و حرفت نے جو ترقی کی ہے وہ آپ اس سے بدرجۂ اتم معلوم کر سکیں گے۔ بقول علامہ اقبالؒ۔ "ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ۔"

قیمت فی جلد آٹھ روپے

تلخیاں

رشید اختر ندوی کا مشہور ناول۔ جس میں سرمایہ داروں کی ہوس کی داستانیں غریبوں کی آبرو کے خون سے لتھڑی ہوئی ہیں۔ اس ناول میں تلخیاں ہی تلخیاں ہیں۔ مگر اس کڑواہٹ اور زہر کے پردے میں حقیقی امرت کے دھارے بھی آپ کو ملیں گے۔ محبت کا بلند معیار۔ غریب کی بے قیمت عصمت۔ سماج کے اندھے قانون۔ ظلم کی ہمہ گیری۔ دنیا کیا ہے یہ سب کچھ آپ کو اس ناول کے پڑھنے کے بعد محسوس و معلوم ہوگا۔

قیمت فی جلد تین روپے

نغمے کی موت

کرشن چندر کے رومانی نغمے نے آخر موت کے دامن میں پناہ لے لی۔ جب کہ اس کے دل و دماغ نے زندگی کی تلخیوں کو دیکھا۔ برتا اور پرکھا۔ اس نے قدم قدم پر ہندوستان کی نامراد لیکن زمین حیات کو سسکتے ہوئے پایا۔ اس نے اپنے چاروں طرف زہر ہی زہر محسوس کیا۔ اگر آپ جنت و جہنم کو ایک مقام پر سانس لیتے ہوئے دیکھنا چاہیں تو نغمے کی موت پڑھئے۔ جو کرشن چندر کے پسندیدہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔

قیمت مجلد دو روپے چار آنے

سہاگن

ایم اسلم کے طویل مختصر افسانوں کا مجموعہ جو صرف پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت مجلد دو روپے

۱۹۴۴ء کی معیاری غزلیں اور نظمیں

عصر جدید کے حساس شعرا کی غزلوں اور نظموں کا منتخب مجموعہ جس میں شعری ادب کا ارتقا پوری شدت کے ساتھ بے نقاب ہے۔

زندگی کو زندگی کے رخ پہ چلنا چاہیے
وقت کے ہمدوش ہر پہلو بدلنا چاہیے

اس طوفانی دہرانی دور کے تاریک راستہ پر غزل اور نظم دوش بدوش چل رہی ہے۔ مجموعہ میں تقریباً سو شعرا شریک ہیں۔

قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

۱۹۴۳ء کی معیاری غزلیں اور نظمیں

صرف چند کاپیاں باقی ہیں۔ — قیمت ایک روپیہ

نیا ادب میری نظر میں

جدید و قدیم کی آویزش بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اس الجھن کو سلجھانے کے لئے اور نئے ادب کے محاسن و معائب واضح و روشن دکھانے کے لئے تنقید جدید کی نئی راہیں کھولنے والے مندرجہ ذیل ادیب تحقیق کی روشنیاں دکھا رہے ہیں۔

مولوی عبد الحق۔ پنڈت کیفی دہلوی۔ سیماب اکبر آبادی۔ نیاز فتحپوری۔ وقار عظیم۔ فیض احمد فیض۔ احتشام حسین۔ جعفر علی خاں اثر۔ میراجی۔ حامد حسین قادری۔ رشید احمد صدیقی۔ خواجہ منظور

قیمت مجلد دو روپے

مشعلِ راہ

مختشب جارچوی کا مجموعہ کلام۔ حسرت موہانی کے بعد غزل کے میدان میں مختشب نے جو کامیابی حاصل کی ہے وہ آپ مشعل راہ میں ملاحظہ کیجئے۔ بقول جوش ملیح آبادی "ان کی شاعری بھی ان کی طرح جوان ہے۔ ان کے بیان میں تازگی اور لہجے میں شیرینی کا عنصر بہت خوبی کے ساتھ سمویا ہوا ہے"

قیمت مجلد دو روپے (عا)

ملنے کا پتہ:- **نگارستان ایجنسی۔ اردو بازار۔ دہلی**

آغا سرخوش قزلباش پرنٹر و پبلشر نے دیال پرنٹنگ پریس بلی ماران چھپوا کر قمر شاہ گنج دہلی سے شائع کیا

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

جنگ

جنگ کے اس نازک دور میں باوجود گوناگوں دشواریوں اور کمیابیٔ سامان وغیرہ کے ابھی اس کارخانے نے اپنے خریداروں کی ضرورت سے پہلو تہی نہیں کی۔ اور جہاں تک ہو سکا اپنے منافع پر کمی کا بار ڈالتا رہا۔ مگر اپنے مال کی عمدگی و نفاست و اصلیت کا لحاظ رکھتے ہوئے کسی قسم کی آمیزش جو عموماً ہوتی ہے گوارا نہیں کی جس کا اعتراف ہمارے قدردان خریداروں نے دیانتی فرمائشات کیساتھ کیا۔ اب مجبوراً دشواریوں میں روز بروز ناقابل برداشت زیادتی ہونے پر یا تو کچھ قیمت بڑھانی گئی یا پرتہ بگری سے بہت زیادہ لاگت ہونے سے بعض مال کی تیاری روک دی گئی۔ مگر اصلیت و خالص مال رہنے کے لحاظ سے بدستور قائم رکھا گیا تھا۔ اس طرح پر واحد مثال کارخانہ نے قائم رکھی۔ لہٰذا بہترین اور خالص مال ہر قسم کا عطر، تیل، عرق و تنباکو وغیرہ اگر مطلوب ہو تو کارخانہ کا پتہ ذیل وقت فرمائش زیر نظر رہے۔

مشہور کارخانہ اصغر علی و محمد علی تاجر عطر خانہ بلڈنگ لکھنؤ

بندوق رائفل

برائے فروخت بڑی تعداد میں موجود ہیں، بذات خود تشریف لایئے لائسنس پیش کر کے اسٹاک ملاحظہ کیجیے۔ کاغذ کی کمی کے سبب فہرست مہیا نہیں کی جا سکتی، خط و کتابت میں وقت اور پیسہ ضائع نہ کیجیے۔ خود تشریف لایئے اور دل پسند ہتھیار خریدیئے۔

دی یا نیہ آرمس کمپنی کشمیری دروازہ دہلی

صحت کی حفاظت کیجیے

موجودہ وقت میں اصلی اور خالص گھی کا ملنا تقریباً ناممکن ہے اور بازار کے ناقص گھی سے صحت تباہ ہو جاتی ہے

لہٰذا بہترین مشورہ یہ ہے

کہ اگر آپ اپنی صحت کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں تو گنیش فلور ملز کمپنی لمیٹڈ کا تیار کردہ اصلی اور خالص ہنولہ برانڈ بناسپتی استعمال کیجیے۔ جو ہر لحاظ سے خالص گھی کا نعم البدل ہے۔ بہترین خوش ذائقہ۔ زود ہضم اور صحت آفریں دماغی کام کرنیوالوں کیلیے لطیف غذا ہے۔ بالکل سائنٹیفک طریق پر تیار کیا جاتا ہے۔ اور وٹامن بھی شامل کیے جاتے ہیں

منیجر گنیش فلور ملز کمپنی لمیٹڈ دہلی